مرے ہوئے آدمی کی لالٹین

(افسانے)

صدیق عالم

مرے ہوئے آدمی کی لالٹین

(افسانے)

مرے ہوئے آدمی کی لالٹین

(افسانے)

صدیق عالم

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

MARE HUYE AADMI KI LALTAIN

(Short Stories)

by: Siddique Alam

Year of Edition 2019
ISBN 978-93-89002-52-2

₹ 300/-

نام کتاب	:	مرے ہوئے آدمی کی لالٹین (افسانے)
مصنف	:	صدیق عالم
سن اشاعت	:	۲۰۱۹ء
قیمت	:	۳۰۰روپے
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

ملنے کے پتے

☆ امرین بک ایجنسی، احمد آباد۔M.08401010786
☆ حسامی بک ڈپو، حیدرآباد۔Ph.040-66806285
☆ ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد۔Ph.040-24411637
☆ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ممبئی۔Ph.022-23774857
☆ بک امپوریم، پٹنہ۔M.09304888739
☆ دانش محل، لکھنؤ۔Ph.0522-2626724
☆ مرزا ورلڈ بک ہاؤس، اورنگ آباد۔M.09325203227
☆ کشمیر بک ڈپو، سری نگر۔M.09419761773
☆ گلوبل بکس، سری نگر۔M.09070340905
☆ قاسمی کتب خانہ، جموں۔M.09797352280
☆ تاج بک ڈپو، رانچی۔Mob. 9304514659
☆ ہمالیہ بک ورلڈ، حیدرآباد۔Ph.040-66822350
☆ انجمن ترقی اُردو، حیدرآباد۔M.09247841254
☆ دکن ٹریڈرس، حیدرآباد۔Ph.040-24521777
☆ کتاب دار، بک سیلر، پبلشر، ممبئی۔Ph.09869321477
☆ عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ۔M.09433050634
☆ راہی بک ڈپو، الہ آباد۔M.09889742811
☆ ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔
☆ مکتبہ علم وادب، سری نگر۔M.094419407522
☆ وطن پبلیکیشنز، سری نگر۔M.09419003490
☆ نعیم بک سیلرز، مئوناتھ بھنجن۔M.09450755820

پاکستان میں ملنے کا پتہ : ملک بک ڈپو، چوک اردو بازار، لاہور (پاکستان) Ph. 0092-42-37247480, 37231388

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, 45678286, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com, ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

عمیق ذیشان کے نام

جسے میں کبھی کچھ نہ دے سکا

فہرست

رکی ہوئی گھڑی

گھڑی کی سوئیاں دو بج کر تیرا منٹ اور دو سکنڈ پر دائمی طور پر رک گئی ہیں۔ میں بینچ پر بیٹھا شیڈ سے لٹکتے بیضوی ڈائل کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں جس کے رومن ہندسے دھندلے پڑ گئے ہیں اور اس کے نچلے حصے پر مکڑی نے جالا بن رکھا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں، یہ گھڑی جانے کب سے رکی پڑی ہے جب کہ میں پینتیس برس کا ہو چکا ہوں! کیا بظاہر ہم دونوں میں کوئی فرق ہے؟ دیکھا جائے تو میں بھی اس گھڑی کی طرح ایک محدود وقت کے لئے رک گیا ہوں کیونکہ میری ٹرین کی آمد کا کوئی اعلان ہو ہی نہیں رہا ہے جب کہ اس کی روانگی کا وقت چار گھنٹہ پہلے جا چکا۔

میں اپنی دونوں آنکھوں کو بھر مقدور کھول کر چاروں طرف نظریں دوڑاتا ہوں۔

ایک عام سا دن اور ایک عام سا اسٹیشن جسے ہم ساری زندگی دیکھتے آئے ہیں۔

میں نے اپنے پیدائشی شہر کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ دیا ہے۔ میں اس شہر سے ناکام جا رہا ہوں۔ مگر اب جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے اس نے مجھے پوری طرح رد کرنے کے بعد اچانک اپنے کسی احساسِ جرم کے تحت مجھے پھر سے واپس اپنانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اس کے لئے اس نے پہلے قدم کے طور پر میری ٹرین کو غیر معینہ مدت کے لئے التوا میں ڈال دیا ہے۔

ایک اسٹیشن شہر کے بیچوں بیچ رہ کر بھی اس سے پوری طرح آزاد ہوتا ہے اور اپنی جیب میں ون وے ٹکٹ ڈالے میں اس آزادی کا بھرپور مزا لوٹ رہا ہوں۔ تھوڑا سا انتظار، میں خود سے کہتا ہوں، اور میں یہاں سے کافی دور جا چکا ہوں گا۔ کوئی مجھے نہیں روک سکتا، نہ ٹرین کے راستے میں روڑے ڈال کر نہ گھڑی بند کر کے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں ایک ہارا ہوا انسان ہوں مگر ابھی میری زندگی کا سفر ختم نہیں ہوا اور ابھی تو میں صرف پینتیس سال کا ہوں، مجھے اس جگہ سے کافی دور جانا

ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ مجھے اس بات کا اطمینان ہے کہ میری جیب میں جو ٹھکانہ موجود ہے وہ میری آخری منزل نہیں، ایک عارضی پڑاؤ ہے، جہاں سے میں کسی بھی دن پھر سے ایک نئی شروعات کر سکتا ہوں۔ آخر، انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور زمین پر روشنی ڈالنے کے لئے سورج صرف ایک جگہ کا انتخاب نہیں کرتا، نہ ہی ساحل پر آنے والی ہر موج آخری ہوتی ہے کہ اسے کھو کر ملاح اپنی ناؤ کے ساتھ سمندر کے کنارے تا عمر اکیلا کھڑا رہ جائے۔

ایک بوڑھا قلی ہتھیلی پر کھینی گھستا ہوا میرے سامنے سے گذرتا ہے۔ وہ سفید بنیان اور سفید دھوتی پہنے ہوئے ہے اور اس نے اپنی فلالین کی سرخ قمیض بائیں کندھے پر ڈال رکھی ہے۔ یہ گھڑی کب سے بند ہے؟ میری آواز اس کے پیروں میں زنجیر ڈال دیتی ہے۔ وہ سر موڑ کر اپنی تھکی ہوئی دانشمند آنکھوں سے میری طرف دیکھتا ہے۔ مجھے ندامت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ ایک ان پڑھ قلی ہی تو ہے نہ کہ اسٹیشن کا کوئی عملہ جو ان چیزوں کے لئے جواب دہ ہو۔ معاف کرنا، میں اپنا جملہ مکمل کرتا ہوں، یہ مجھے تم سے پوچھنا نہیں چاہئے تھا۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔

اور وہ کیوں حضور؟ وہ بینچ کے سامنے ٹھہر گیا ہے اور اپنائیت سے میری طرف دیکھ رہا ہے۔ آخر لوگ ایک بند گھڑی کے بارے میں سوال تو اٹھائیں گے ہی نا؟ اور شریمان اس میں ان کا قصور کیا ہے؟ اس گھڑی کے رکنے کا قصہ چار دانگ مشہور ہے مگر اسے سنانے کی اجازت صرف سگنل مین گوچرن رائے کو ہے جو ساری زندگی ٹرینوں کو ہری اور سرخ جھنڈی دکھاتا رہا اور آج ہی ریٹائر ہوا ہے۔

اور اس کی جگہ کون آیا ہے؟ میں پوچھ بیٹھتا ہوں اور مجھے فوراً اپنی بے وقوفی کا احساس ہوتا ہے۔ آہ، میں سوچتا ہوں، اپنی ان ہی بیوقوفیوں کے سبب میں ہمیشہ غیر ضروری باتوں میں الجھ کر رہ جاتا ہوں۔ یہ آپ اسٹیشن ماسٹر سے پوچھ لیجئے نا، قلی جاتے جاتے کہتا ہے۔ اور یہ قصہ ایسا نہیں کہ آپ اسے یوں ہی جانے دیں کیونکہ میں آپ کو بتا دوں اگر آپ نے ایسا ہونے دیا تو آپ کو ساری عمر اس کا پچھتاوا رہے گا!

میں اس عجیب صورت حال کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں سمجھ رہا تھا اس شہر سے میرا ربط ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ چکا ہے۔ مگر اب اس اسٹیشن کا کیا کیا جائے جس نے ایک عجیب ڈھنگ سے مجھے نظر انداز کر دیا ہے جیسے میری جیب میں پڑے ہوئے ٹکٹ کی کوئی اہمیت ہی نہ

ہو۔ میں ایک بار پھر شیڈ سے لٹکتے ڈائل کی طرف دیکھتا ہوں۔ دو بجکر تیرا منٹ دو سکنڈ! کیا ہوا تھا اس وقت جب اس گھڑی نے کام کرنا بند کیا تھا؟ کیا اس اسٹیشن میں کوئی حادثہ پیش آیا تھا؟ کوئی قتل کی واردات ہوئی تھی؟ کسی بڑے لیڈر کی روانگی ہوئی تھی یا وہ کسی بڑے سفر سے لوٹا تھا؟ کیا نکسلیوں نے کوئی بڑا ازسنگھار کیا تھا؟ یا یہاں پر کسی بڑے فرقہ وارانہ فساد کی شروعات ہوئی تھی؟

اور یاد رکھیئے گا، قلی ایک بار پھر واپس لوٹ آیا تھا۔ اس بار اس نے اپنی قمیض پہن لی تھی۔ جب تک آپ یہ قصہ سن نہیں لیتے آپ کی ٹرین آنہیں سکتی۔ اس جگہ کا یہی دستور ہے۔ کئی ہفتے گذر جائیں گے، مہینوں بیت جائیں گے، ہوسکتا ہے کئی سال تک آپ کو اسی طرح اپنا سوٹ کیس اٹھائے ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم تک گھومتے رہنا پڑے۔ اور یہ کچھ سال پہلے کی بات ہے کہ ایک مسافر اور بھی تھا جو ٹرین بدلنے کے لئے یہاں اترا تھا۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی کوئی واقعہ پیش آیا تھا۔ شروع میں اس نے آپ ہی کی طرح اس گھڑی کے سلسلے میں اپنے تجسس کا اظہار تو کیا مگر پھر جانے کیا ہوا کہ اس نے قصہ سننے سے انکار کردیا۔ آپ کو پتہ ہے اس کا کیا حشر ہوا؟

ارے میں یہ کیسے جان سکتا ہوں، میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہورہا تھا۔ اس شہر نے مجھے کبھی فرصت ہی نہیں دی کہ قصے کہانیوں کے لئے اپنے کان کھولوں۔

آپ خوامخواہ چڑ رہے ہیں حضور۔ میں بتا رہا ہوں نا۔ سچ کہا جائے تو اس سلسلے میں صحیح بات کا پتہ کسی کو نہیں ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ اسٹیشن سے نکل کر شہر کے اندر چلا گیا اور پھر کبھی واپس نہیں لوٹا۔ اور کچھ کا کہنا ہے کہ وہ ایک دوسری ٹرین میں سوار ہوگیا تھا مگر وہ ٹرین کبھی اپنی منزل تک پہنچی ہی نہیں۔ کچھ ایسے قصہ گو آپ کو ملیں گے جو اس بات کے حق میں دلیل دیں گے کہ ایک طوائف جو پلیٹ فارم پر اپنا دھندا کیا کرتی تھی اسے بہکا کر ریل کی پٹری کے کنارے اپنی جھونپڑی میں لے گئی جہاں اسے کوڑھ کی بیماری ہوگئی اور آج وہ ٹاٹ کی بنی اس جھونپڑی میں تل تل مر رہا ہے۔ مگر آپ چاہیں تو ایسے بھی لوگوں کی اچھی خاصی تعداد نکل آئے گی جو اس بات کی گواہی دیں گے کہ وہ آج بھی اپنا سوٹ کیس اٹھائے اس اسٹیشن میں ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم پر بھٹک رہا ہے، گرچہ مسافروں کی بھیڑ میں اسے پہچان پانا مشکل ہے۔

جس کا یہ مطلب ہے وہ کوئی بھی ہوسکتا ہے، یہاں تک کہ میں بھی؟

کیا میں نے ایسا کچھ کہا؟ قلی جاتے ہوئے کہتا ہے۔ حضور، آپ تو لگتا ہے کہ ریلے کھا کر بیٹھے ہوئے ہیں!

میں بھو چکا سا قلی کی پشت کو دیکھ رہا ہوں جس پر پڑی فلالین کی قمیض کے ریشے متواتر استعمال کے سبب نہ صرف باہر نکل آئے ہیں بلکہ خود کپڑا اس قدر ملائم ہو گیا ہے کہ اس سے اس کی ہنسلی کی ہڈی کے ابھار صاف نظر آ رہے ہیں۔ مجھے یہ قبول کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ جب سے سوٹ کیسوں کو پہیئے مل گئے ہیں، قلیوں کی تعداد کم ہونے لگی ہے۔ رہی سہی کسر بیک پیک نے پوری کر دی ہے۔ ہم ایک ایسے دور میں آ چکے ہیں جب ہر دوسرا آدمی یا تو سوٹ کیس کو اس کے پہیوں پر کھینچتا نظر آتا ہے یا اپنی پیٹھ پر بیک پیک لادے چلا جا رہا ہے۔ شاید ان قلیوں کے پاس کام برائے نام رہ گیا ہو اور یہ ان کا وقت گذارنے کا کوئی نیا طریقہ ہو۔ مگر اس جگہ اکیلا اپنے سوٹ کیس کے ساتھ بیٹھا ہوا میں یہ کیوں سوچ رہا ہوں کہ میری ٹرین کے نہ آنے کا واقعہ کسی خاص اہمیت کا حامل ہے جب کہ انسانی آمد و رفت کے سلسلے میں ایک ٹرین کے نہ آنے کی کہانی کوئی بڑا واقعہ نہیں ہوتا جب تک وہ ٹرین بھاپ اور دھواں چھوڑتی ہوئی اپنے پیشاب پاخانوں کی بدبو کے ساتھ پوری طرح آ نہ چکی ہو؟

تو میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر سوچتا ہوں، اب جب کہ معاملہ اتنا پیچیدہ ہو چکا ہے اور میری اکیلی جان اس معاملے میں اس بری طرح الجھی ہوئی ہے تو میرے پاس اس کے علاوہ راستہ ہی کیا رہ گیا ہے کہ میں اسٹیشن ماسٹر سے اپنی ٹرین کے بارے میں صحیح جانکاری حاصل کروں؟ آخر اس آدمی کا کام کیا ہے جو ہر وقت اپنے دفتر میں اس طرح مصروف نظر آتا ہے جیسے اس نے تھوڑی سی غفلت کی اور پٹریوں پر دوڑتی ہوئی ساری ٹرینیں آپس میں ٹکرا جائیں گی، یہاں تک کہ وہ ٹرینیں بھی جو ابھی تک کارخانے سے بن کر نکلی نہ ہوں!

اسٹیشن ماسٹر کا دفتر، جس کی موٹی دیواروں کو دیکھ کر صاف لگ رہا تھا اس کی تعمیر انگریزوں کے زمانے میں کی گئی ہوگی، پلیٹ فارم سے تین قدم نیچے واقع تھا اور اس کا چھپر کھپریل کا تھا۔ اس کے برامدے کی دیوار سے ایک بلیک بورڈ ڈلتک رہا تھا جس پر چاک سے ٹرینوں کے نام اور نمبر لکھے ہوئے تھے جن کے آنے کا وقت ہو چکا تھا یا جو مقررہ وقت کے مقابلے دیر سے چل

رہی تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر ٹرینوں کا وقت گذر چکا تھا مگر وہ مٹائے نہیں گئے تھے اور کئی ٹرینوں کے دیر سے آنے کا وقت چاک سے بار بار تبدیل کیا گیا تھا۔ ڈسٹر کے متواتر استعمال کے سبب بلیک بورڈ پر ایک دھندسی چھائی ہوئی تھی جیسے الفاظ کہرے میں تیر رہے ہوں۔ انھیں اوپر سے نیچے تک کئی بار پڑھنے پر بھی مجھے اپنی ٹرین کا نام اور نمبر کہیں نظر نہ آیا جب کہ یہ تیسری دفعہ ہے کہ میں اس جگہ آیا ہوں۔ کیا میری ٹرین اپنے نمبر اور وقت کے ساتھ چاک کے پوڈر کا حصہ بن چکی تھی؟ مگر اس بار میرا ارادہ بلیک بورڈ کو دیکھ کر واپس لوٹنے کا نہیں تھا۔ سچ کہا جائے تو میری صبر کا بند ٹوٹ چکا تھا۔

اندر آفس میں تین کلرک الگ الگ میزوں پر بیٹھے رجسٹروں کی خانہ پری میں مصروف تھے۔ ان کے چہروں پر وہ اکتاہٹ دیکھی جا سکتی تھی جو ہمیشہ سرکاری دفتروں میں کام کرنے والوں کے چہروں پر نظر آتی ہے۔ انھوں نے اجتماعی طور پر اپنا سر موڑ کر میری طرف دیکھا اور پھر اجتماعی طور پر اپنے کام میں مصروف ہو گئے جیسے وہ تمام سر ایک ہی دھڑ پر لگے ہوئے ہوں۔ شاید انھیں میرے جیسے پریشان حال مسافروں کو دیکھتے رہنے کی عادت ہے۔ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے جس پر ایک دبیز پردا جھول رہا ہے۔ اسٹیشن ماسٹر ایک ادھیڑ عمر کا سانولے رنگ کا آدمی ہے جو ایک بھاری فریم والی عینک ناک پر چڑھائے ایک نیلے رنگ کی میز پر ان گنت ٹیلی فون کے بیچ ایک رسیور سے کان لگائے بیٹھا ہے۔ اس کی پشت اور داہنی طرف کی دیوار چارٹ اور نقشوں سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ بائیں دیوار پر ایک بڑا سا روشن دان چھت سے لگا ہوا ہے جس کا آدھا کھلا ہوا شیشہ برسوں سے صاف نہیں کیا گیا ہے۔ میری آہٹ پر بات کرتے کرتے وہ رک جاتا ہے اور رسیور کے ماؤتھ پیس کو ہات سے ڈھک کر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے۔

وہ پلیٹ فارم کی گھڑی کس دن بند ہوئی؟ میں دریافت کرتا ہوں اور مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ میرا لاشعور میرے ساتھ آج کس قسم کا کھیل کھیل رہا ہے؟ معاف کیجیے، میں اپنی ٹرین کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ میں پچھلے سات گھنٹے سے انتظار کر رہا ہوں اس کا۔ آپ بتا سکتے ہیں وہ کب آئے گی؟ میں اپنی ٹرین کا نمبر اور نام بتاتا ہوں۔ وہ تو جا بھی چکی، اسٹیشن ماسٹر فون کریڈل پر ڈالتے ہوئے کہتا ہے۔ آپ کا مطلب ہے پلیٹ فارم سے؟... کب؟... میں نے تو اعلان نہیں سنا... مجھے اپنے پیروں کے نیچے زمین کھسکتی محسوس ہوئی۔ آپ

نے پلیٹ فارم کی گھڑی پر وقت نہیں دیکھا؟ اسٹیشن ماسٹر میری طرف تحیر سے دیکھ رہا ہے۔ مگر وہ تو بند پڑی ہے۔ ہاں، وہ یقیناً بند ہے، مگر یہ آپ کوئی نئی بات نہیں کہہ رہے ہیں۔ وہ تو اسی وقت سے بند پڑی ہے جب آپ کی گاڑی گذری۔

اسی وقت میز پر رکھا ایک ٹیلیفون بج اٹھتا ہے اور وہ رسیور اٹھا کر اَپ یا ڈاؤن لائن پر کسی اسٹیشن سے بات کرنے لگتا ہے اور میں یہ اس لئے سمجھ پا رہا ہوں کیونکہ اس کے جملے ان ہی دونوں الفاظ کے گرد گھوم رہے ہیں۔ میں سوٹ کیس فرش پر رکھ کر ملاقاتیوں کے لئے مخصوص ایک لکڑی کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں اور اچانک مجھے شدید تھکن کا احساس ہونے لگتا ہے۔ میرے دونوں کندھے شل ہو گئے ہیں۔ میرا جسم منوں بھاری ہو رہا ہے جیسے میں کسی بھی پل کرسی کے اندر دھنس جاؤں گا۔ آہ، میں سوچتا ہوں، اب میرے پاس کرنے کے لئے کیا رہ گیا ہے؟ یہاں تو ہر آدمی قصے کہانیوں کی بات کر رہا ہے۔ آخر وہ قصہ ہے کیا؟

اسٹیشن ماسٹر کافی دیر تک رسیور میں ڈوبا رہتا ہے۔ رسیور کو کان سے تھوڑے فاصلے پر رکھ کر وہ دیوار پر لگی چارٹ پر پنسل سے کئی جگہ نشانات لگاتا ہے، کئی ٹیلیفون کی گھنٹیاں نظر انداز کرتا ہے، کئی بار ایک ٹیلیفون پر رابطہ کاٹے بغیر دوسرے ٹیلیفون پر گفتگو کا سلسلہ قائم کرتا ہے، کئی ٹیلیفون کے رسیور کو جو ایسا لگ رہا تھا جیسے رہ رہ کر شرارت سے بج رہے ہوں، واپس کریڈل پر پٹخ کر ان کا سلسلہ منقطع کرتا ہے، میز کی درازیں کھینچ کر چھوٹے بڑے رجسٹر نکالتا ہے اور ان کے مخصوص صفحوں کا جائزہ لیتا ہے اور جب کہ وہ اس طرح اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہے جو بظاہر اپنے فرض کے تئیں اس کی ایمانداری کا مظہر تو ہے مگر جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ دراصل یہ اس کا مجھ سے پیچھا چھڑانے کا کوئی آزمودہ حربہ ہے جسے اپنی نوکری کے دوران سالہا سال کے تجربوں سے اس نے حاصل کیا ہوگا۔ تو اس طرح دھیرے دھیرے وقت گذرتا ہے۔ مگر اب مجھے محسوس ہونے لگا ہے جیسے میں سرے سے وہاں موجود ہی نہ تھا۔ شاید میں ایک کیڑا تھا جس پر غلطی سے انسان کی نظر پڑ جائے اور پھر وہ اپنی نظر ہٹا لے۔

ہیلو! آخر کار میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور میں کھڑے ہو کر اپنا داہنا ہاتھ ریکسن سے ڈھکی ہوئی میز پر اتنے زور سے مارتا ہوں کہ اس پر رکھے ہوئے ٹیلیفون، قلمدان، پانی کی بوتل، گلاس، پیپر کیلنڈر اور پیپر ویٹس اچھل پڑتے ہیں۔ اسٹیشن ماسٹر رسیور کریڈل پر ڈال کر اپنی

پیٹھ کرسی کی پشت سے ٹکا لیتا ہے اور دونوں ہات کرسی کے ہتھوں پر پھیلا کر کسی سہمے ہوئے انسان کی طرح میری طرف بڑی بڑی رقیق آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اس کا کیا مطلب تھا جناب؟ وہ اپنی بھنبھناتی آواز سے کہتا ہے جیسے اس کے اندر سے کوئی دوسرا انسان بول رہا ہو۔ اس کی بھویں عینک کے اوپر کمان کی طرح تنی ہوئی ہیں۔ مگر جانے اس وقت میری آنکھوں میں کون سا طوفان بھرا پڑا تھا کہ اس کے نفسیاتی دباؤ سے وہ ہتھیار ڈال دیتا ہے اور اس کی بھویں ڈھیلی پڑ جاتی ہیں۔ آپ چاہتے کیا ہیں؟ اس کی بھنبھناتی آواز دوبارا ابھرتی ہے، کیا میں پولس کو بلاؤں؟

بالکل، آپ پولس کو بلا سکتے ہیں، میں اعلانیہ طور پر مبازرت طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ مگر جب یہ ٹکٹ میرے ہات میں ہے تو مجھے یہ جاننے کا حق تو ہے کہ میری ٹرین کا کیا ہوا؟ میں نے آپ کو بتایا نا، وہ ٹرین جا چکی، اسٹیشن ماسٹر کی آواز اس کے حلق میں لوٹ آئی ہے۔ آپ کسی دوسری ٹرین کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے؟ میں کیوں سوچوں؟ کیا یہ میرا قصور ہے۔ اور اگر وہ گھڑی بند پڑی ہے تو آپ یہاں کس بات کی تنخواہ لے رہے ہیں؟ اس کی مرمت کیوں نہیں کرواتے؟ میرا مطلب ہے کیا اس سے مسافروں کو غلط پیغام نہیں پہنچتا؟ وہ بھی ایک ایسے ملک میں جہاں سرکاری چیزوں پر لوگوں کا ایمان خدا سے بھی زیادہ پختہ ہو اور وہ سرکاری نمائندوں کے سامنے اپنی دمیں ٹانگوں کے بیچ دبائے ڈرے سہمے کھڑے رہنے کے عادی ہو چکے ہوں۔ میرے چپ ہو جانے کے بعد اسٹیشن ماسٹر دیر تک خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہتا ہے جیسے اس کی زبان پر تالا پڑ گیا ہو۔ شاید وہ میرے جیسے لوگوں کا سامنا کرنے کا عادی نہ تھا۔ آخر کار اس کی خاموشی سے تنگ آ کر میں اپنے سوٹ کیس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں جسے میں نے فرش پر رکھ دیا تھا۔ میں دیکھ رہا ہوں آپ سے بات کرنا فضول ہے، میں کہتا ہوں۔ اس سے تو بہتر تھا کہ میں کسی دیوار سے بات کر رہا ہوتا۔ اچانک اسٹیشن ماسٹر کے جسم میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا ہے اور اس نے اپنا ہات میری طرف مصافحہ کے لئے بڑھا دیا ہے۔ آپ کافی پریشان لگ رہے ہیں، وہ اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہتا ہے۔ میں آپ کی مصیبت سمجھ سکتا ہوں۔ اگر گوچرن رائے ہوتا تو وہ آپ کی مدد کرتا۔ اس معاملے میں وہی آپ کے لئے صحیح آدمی ہے۔ مگر افسوس آج ہی وہ ریٹائر ہوا ہے اور سامان باندھنے اپنا کوارٹر چلا گیا ہے۔ میں اس کے بڑھے ہوئے ہات کی طرف ایک ٹک دیکھتا ہوں اور.... یہ ہر کوئی کسی گوچرن رائے کا نام کیوں

لے رہا ہے؟ اسے نہ قبول کرتے ہوئے کہتا ہوں۔ میں کسی گوچرن رائے کا احسان کیوں لوں؟ اپنی اضطرابی کیفیت میں میں سوٹ کیس کے ہینڈل کو انگلیوں سے تھام کر دونوں طرف دھیمے دھیمے بھینچ رہا تھا۔ میں ایک ٹرین کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں اور آپ ہیں کہ مجھے اپنے سگنل مین کے حوالے کر رہے ہیں وہ بھی جب وہ آپ کا ماتحت نہیں رہا، ریٹائر ہو چکا ہے۔

مجھے دروازے پر آہٹ سنائی دیتی ہے۔ یہ دو لمبے قد کے وردی پوش جوان ہیں جو پردہ اٹھائے میری طرف تاک رہے ہیں۔ ایک کا چہرا لمبوترا ہے جو کیلوں اور مہاسوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ دوسرے کے پاس کوئی چہرا نہیں ہے۔ دونوں کی ٹوپیوں پر لگے پیتل کے بلے کمرے کی تیز روشنی میں تمما رہے ہیں۔

نہیں جادب، یہاں سب کچھ ٹھیک ہے، اسٹیشن ماسٹر انھیں ٹالنے کا اشارا کرتا ہے اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر رومال سے چہرا صاف کرنے لگتا ہے۔ ایک پل کے لئے وہ خاموش رہتا ہے، پھر دونوں کو اپنی جگہ سے ٹلتے نہ دیکھ کر اپنا صبر کھو بیٹھتا ہے۔ میں نے کہا نا، میں انھیں سنبھال لوں گا۔ یہ ٹرین چھوٹ جانے سے تھوڑے دکھی ہیں۔

پردہ برابر ہو چکا ہے۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ چپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ بہت ہی پراسرار طور پر اس وقت سارے ٹیلیفون خاموش ہو گئے ہیں اور کمرے میں ایک ایسی خاموشی چھا گئی ہے کہ کھڑکی سے باہر کھڑے درخت کے پتوں کی سرسراہٹ صاف سنائی پڑ رہی ہے۔ یہ سارا معاملہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ کیا میں کسی بڑی سازش کا حصہ بن چکا ہوں جس کی تہہ تک پہنچنا میرے بس کی بات نہیں؟ میں محسوس کرتا ہوں یہ خاموشی میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو گئی ہے۔ تو میں اٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور جھک کر اپنا سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے بڑبڑاتا ہوں، عجیب اسٹیشن ہے، یہاں پر ایک گھڑی بند ملتی ہے اور ایک ٹرین آئے بغیر گذر جاتی ہے اور ان سارے گورکھ دھندوں کے بیچ ایک سگنل مین آ جاتا ہے جو ریٹائر ہو چکا ہے اور اس کا ایک عجیب وغریب نام ہے اور ایک عجیب وغریب کہانی ہے جسے وہ برسوں سے لوگوں کو سناتا آ رہا ہے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کہانی کو کوئی نہیں جانتا، نہ اس کا کوئی سر پیر ہے نہ کوئی آغاز ہے نہ انجام۔ تو میرے لئے کیا بچتا ہے سوائے اس کے کہ اس اسٹیشن کے کھمبوں اور دیواروں سے سر ٹکراتا پھروں؟

میرا مشورہ مانیں تو آپ اپنے سفر کا ارادہ ملتوی کر دیں، اسٹیشن ماسٹر ایک بار پھر اپنی

سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ وہ اپنی دونوں ہتھیلیاں مسل رہا ہے جیسے اسے سچ مچ میرے لئے افسوس ہو رہا ہو۔ آپ نئے سرے سے کسی دوسری ٹرین کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے بلکہ میں تو آپ کو مشورہ دوں گا کہ اپنی منزل ہی بدل لیں۔ جب اتنے سارے واقعات آپ کے خلاف کام کر رہے ہوں تو آپ کو سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہئے۔ ہم ایک ایسے دور میں آچکے ہیں جب ہم نے ناپ تول کر قدم نہ رکھا تو ہم کسی بھی وقت کسی نہ نظر آنے والی کھائی کے اندر گر سکتے ہیں۔

شکریہ، آپ ایک اسٹیشن ماسٹر کا رول بخوبی نبھا رہے ہیں۔

میں سوٹ کیس کے ساتھ باہر نکل آیا ہوں۔ باہر کھپریل کے چھپر سے سائے غائب ہو چکے ہیں اور درخت کا تارکول سے رنگا ہوا تنا سورج کی افقی کرنوں میں چمک اٹھا ہے۔ پٹریوں کے دوسری طرف کا پلیٹ فارم اسٹیشن کے داخلے کی عمارت کے سائے میں ڈوب گیا ہے۔ وہاں مسافروں کا اچھا خاصا ہجوم ہے جن کی بے چینی سے لگ رہا ہے کہ کسی گاڑی کی آمد کا اعلان ہو چکا تھا۔ کیا مجھے فٹ برج سے گزر کر اس پلیٹ فارم پر جانا چاہئے۔ کون جانے اس پر آنے والی ٹرین میری ٹرین نکل آئے۔

کیا بکواس ہے، مجھے اپنی بیوقوفی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ پلیٹ فارم تو مخالف سمت جانے والی ٹرینوں کے لئے ہے۔ کیا واقعی زمین اپنے مدار پر اس طرح گھوم گئی ہے کہ مجھے اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے مخالف سمت جانے والی ٹرین پکڑنی چاہئے؟

////////

سورج داخلے کی عمارت کے پیچھے جا چکا ہے۔ مجھے زور کی بھوک لگی ہے۔ شاید پیٹ کے اندر کچھ جائے تو میں ٹھیک سے سوچ سکوں، ان عجیب وغریب حالات کا سامنا کر سکوں جنھوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، ان کا سر پیر نکال سکوں۔ پلیٹ فارم پر قمقمے جل اٹھے ہیں مگر پٹریوں کے کنارے کھڑے درختوں کی پھننگیں اور اسٹیشن کی عمارتوں کے بالائی حصوں کی چوبی آرائشیں اب بھی دھوپ کا فرغل پہنے کھڑی ہیں۔ کینٹن کے اندر روشنی ہو رہی ہے۔ اس کی فائبر کی میزیں خالی پڑی ہیں سوائے ایک کو چھوڑ کر جس پر ایک شخص جس کی مرغ فرعون کی طرح لمبی گردن ہے، بیٹھا اپنی چائے کی پیالی کے اندر گھور رہا ہے۔ ابھی جاڑا پوری طرح سے آیا نہیں ہے مگر اس نے ابھی سے ایک دھاری دار مفلر اپنی گردن کے نچلے حصے میں

لپیٹ رکھا ہے اور پلاسٹک کے سڑے گلے سینڈل کے اندر سے اس کے پیروں کی انگلیاں بڑے ہی بے ڈھنگے انداز سے باہر نکلی ہوئی ہیں۔ اس کی میز پر ایک ریکسن کی تھیلی رکھی ہے، جو کسی حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح پھولی ہوئی ہے۔ اس سے لالٹین کا قوس نما ہینڈل جھانک رہا ہے۔

کینٹن کے شوکیس میں المونیم کی ٹریز پر کیک، آلو چاپ اور سموسے پڑے جانے کب سے گاہکوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ کولڈ ڈرنک کے کریٹ کا زیادہ حصہ خالی بوتلوں سے بھرا ہوا ہے۔ ان میں سے کچھ بوتلوں سے نکلے ہوئے پلاسٹک کے پائپوں پر مکھیاں قطار سے بیٹھی اپنی سنڈیاں رگڑ رہی ہیں۔ کینٹن کا واحد ویٹر میری آنکھوں سے گریز کرتے ہوئے مجھے نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور جب یہ ممکن نہیں ہو پاتا تو وہ طوعاً کرہاً کندھے پر ایک غلیظ تولیہ چپکائے میرے پاس آتا ہے۔ اس نے اپنی

کمزور آنکھوں پر ایک بہت ہی دبیز لینس والی سستی عینک چڑھا رکھی ہے جس کے اندر اس کی آنکھیں کسی الّو کے دیدوں کی طرح گول نظر آ رہی ہیں۔

کھانا؟ اس کا وقت تو پورا ہوا، وہ طلاع دیتا ہے۔ اب تو بس کیک اور سموسے ہی مل سکتے ہیں یا ایک آدھ آلو چاپ۔ گرم؟ نہیں، چولھے کی راکھ گرائی جا چکی ہے۔ آپ نے خود دیکھا ہوگا، سورج ڈوبنے کے بعد اس اسٹیشن میں مسافر نظر نہیں آتے، وہ تو ٹینڈر کے قانون کے تحت ہمیں کینٹن کو ایک خاص وقت تک کھلا رکھنا پڑتا ہے۔ ہاں، مجھے پتہ ہے، میں کہتا ہوں۔ اس شہر میں لوگ رات کا سفر پسند نہیں کرتے۔ یہ علاقہ چاروں طرف سے لٹیروں سے گھرا ہوا ہے۔ تو ٹھیک ہے، ایک کیک اور گرم چائے ہی سہی۔ چائے تو گرم مل سکتی ہے نا؟ کیوں نہیں۔ ویٹر مسکراتا ہے۔ اور ان لٹیروں کے بارے میں آپ نے ٹھیک کہا۔ ابھی پچھلے ہفتے میں رات کے وقت کام کے بعد گھر لوٹ رہا تھا جب ایک شخص نے مجھ سے دیا سلائی مانگی اور میری پوری تنخواہ چھین لی۔ بعد میں وہ پکڑا بھی گیا۔ وہ سنڈریٹی میں جہاں کچھ برس پہلے تک اسٹیم انجنوں کی راکھ ڈالی جاتی تھی، بانس کی ایک جھونپڑی میں ایک کمسن لڑکی کے ساتھ رہ رہا تھا جسے وہ کہیں سے بھگا کر لایا تھا اور ہر رات اس کا جنسی استحصال کیا کرتا۔ ایک ہفتہ قبل یہاں چائے پینے کے بہانے اس نے باتوں باتوں میں پتہ چلا لیا تھا کہ مجھے کس دن تنخواہ ملتی ہے۔

راتیں اس شہر کے لئے نہیں ہوتیں، میں ایک ٹھنڈی سانس لیتا ہوں۔ یہاں سورج نہ

ڈوبے تو بہتر ہے۔ ویٹر تائید میں سر ہلا کر میری میز پر چینی مٹی کی ایک دبیز رکابی رکھتا ہے جس پر ایک چاکلیٹ کے رنگ کا کیک پڑا ہے۔ کیک کیک سے زیادہ کیچڑ کا ایک ٹکڑا نظر آرہا ہے۔ اس نے اس کے برابر چینی مٹی کی ایک دبیز پیالی کھڑی کی ہے جس کی انگلی والا حلقہ اتنا تنگ ہے کہ آپ اس میں اپنی انگلی ڈالنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہ اس میں کیتلی سے اسٹوو پر گرم کی ہوئی چائے انڈیل کر کاونٹر کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ وہ منیجر سے سرگوشی میں کچھ کہتا ہے اور کینٹن کے پیچھے کا دروازہ کھول کر باہر چلا جاتا ہے۔ باہر ایک اوور ہیڈ ٹینک پوری طرح بھر جانے کے سبب اس کا زائد پانی فوارے کی شکل میں نیچے گر رہا ہے جس میں رہ رہ کر ایک کتا گھس کر باہر نکل آتا ہے۔ شاید کتے کو اس کھیل میں مزا آرہا ہے۔ پانچ منٹ بعد، جب کہ میں کیک اور بار بار کی کھولائی ہوئی بدمزہ چائے زہر مار کر چکا تھا کینٹن کے داخلے پر ویٹر دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ریلوے پولس کا وہی کیلوں مہاسوں والا وردی پوش جوان ہے جسے اسٹیشن ماسٹر نے جادب کے نام سے پکارا تھا۔

اگر آپ نے چائے پی لی ہو تو ہم چل سکتے ہیں، دو ستارے والے انسپکٹر نے اپنی بیلٹ سے لگے ہولسٹر سے جھانکتے ریوالور پر ہاتھ رکھ کر نفاست سے کہا ہے۔ آپ کا مطلب مجھ سے ہے؟ میں حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ ظاہر ہے ہم دیوار سے بات تو نہیں کر رہے ہیں، آپ کے سلسلے میں ہمیں چھان بین کا حکم ملا ہے۔ اسٹیشن ماسٹر نے شکایت کی ہوگی، میں بٹوے سے پیسے نکال کر کاغذ کے پرزے پر نظر ڈالتا ہوں جس پر بل کی رقم کسی پنسل کی کند نوک سے لکھی ہوئی تھی۔ نہیں، ہم پولس والے اپنا فیصلہ خود بھی لیتے ہیں۔ میں اپنا سوٹ کیس اٹھا لوں؟ آپ کیوں تکلیف کریں گے۔ نورل، سوٹ کیس اٹھا لو، جادب اپنے ماتحت کو حکم دیتا ہے جس نے ایک بھاری رائفل اپنے کندھے سے لٹکا رکھی ہے۔ اس کی ٹھوری کافی نیچے لٹکی ہوئی ہے اور اس کے بال کسی گیدڑ کے بالوں کی طرح پیشانی پر کھڑے ہیں۔ ویٹر باقی کے پیسے ایک ٹرے پر لاتا ہے جنھیں اٹھا کر میں اپنے بٹوے کے اندر رکھ لیتا ہوں۔ ٹپ کے طور پر میں نے دو روپے کا ایک سکہ چھوڑ دیا ہے جس پر ایک سرسری نظر ڈال کر ویٹر نظر انداز کر دیتا ہے۔ شاید اسے اتنی حقیر رقم ٹرے پر دیکھنے کی عادت نہیں ہے۔ کینٹن سے باہر جاتے ہوئے میں دیکھتا ہوں مفلر پہنا ہوا آدمی پہلے کی طرح اپنی جگہ چپ بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں میں کوئی تجسس نہیں ہے۔ شاید اب ہم

ایک ایسے دور میں آ چکے ہیں کہ اپنی حفاظت کے لئے اس طرح کا غیر جانبدار چہرا رکھنا لازمی ہو گیا ہے!

سنسان پلیٹ فارم پر دونوں کے بیچ مختلف تاریک اور نیم تاریک گھروں اور سائبانوں کے سامنے چلتے ہوئے ہم ایک اونچے درجے کے ویٹنگ روم اور پھر ایک زنانہ پیشاب گھر کے سامنے سے گزرتے ہیں جس کے باہر بڑا سا بلب جل رہا ہے۔ ویٹنگ روم کے اندر تیز سفید روشنی ہو رہی ہے مگر چمکتی دیواروں کے بیچ رکھی آرام کرسیوں پر ایک بھی مسافر دکھائی نہیں دیتا۔ ان سے گذر کر ہم دیر تک شام کے دھندلکے میں سنسان پلیٹ فارم پر چلتے رہتے ہیں۔ یہاں ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہے اور اکے دکے آسیب زدہ درختوں کے نیچے یا تو بھکاری آگ جلا رہے ہیں یا بلیوں کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں۔ آخر کار ہم ایک پرانی تین منزلہ عمارت کے سامنے نکل آتے ہیں جو اس جانب پلیٹ فارم پر آخری عمارت ہے کیونکہ اس کے بعد پٹریوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ لکڑی کی گھماؤ دار سیڑھی کو الگ کر دیں تو اس عمارت کا زیادہ تر حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔ قدمچوں پر احتیاط سے پیر رکھتے ہوئے جہاں ایک آدھ لینڈنگ پر اچانک کوئی غیر متوقع بلب جل اٹھتا ہے، ہم سب سے اوپر کی منزل پر پہنچتے ہیں جہاں مجھے ایک ہال نما کمرے میں لے جایا جاتا ہے جس کی مستطیل کھڑکیوں کے پلّے ایک روشن شہر کی طرف کھلے ہوئے ہیں۔ ہال کے بیچوں بیچ صرف ایک سیاہ رنگ کی کافی بڑی جسامت کی بیضوی میز رکھی ہے جس پر چھت سے تار کے سہارے ایک بلب بہت نیچے تک لٹک رہا ہے۔ اس کی تیز روشنی میں میز کی پالش کی ہوئی سطح آئینے کی طرح چمک اٹھی ہے جب کہ اس کے پائے اندھیرے میں غرق ہیں۔ پورے ہال میں ایک بھی کرسی نہیں جہاں آدمی اپنے جسم کو آرام دے سکے۔ لیمپ بریکٹ کے کم پاور کے بلب نے چاروں دیواروں پر تتلیوں کے پروں کی طرح روشنیاں پھیلا رکھی ہیں۔

یہ کسی طرح کا اذیت کا کمرا تو نہیں؟ میں پلٹ کر ان دونوں کی طرف لاپرواہی سے دیکھتا ہوں۔ جانے کیوں، اس کے باوجود کہ ماحول ہیبتناک ہے میں اندر سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ شاید ایسا اس لئے ہے کہ میں ایک ایسے ملک میں جینا سیکھ گیا ہوں جس کے رات دن آپ کے نہیں ہوتے۔ یوں بھی میرے پاس کھونے کے لئے ایک بیکار سی زندگی کے علاوہ کیا تھا؟ کیا آپ کو لگتا ہے ہم اذیت دینے والے لوگ ہیں؟ جاذب جواب دیتا ہے۔ اوہ، پھر تو غلطی ہو گئی۔ دراصل ایسا کمرا میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا، جاذب دوبارا

کہتا ہے۔ ہو سکتا ہے، اس کمرے کے بہت سارے استعمالوں میں سے ایک یہ بھی ہو، دراصل ہمیں ایک منٹ پہلے بھی یہ پتہ نہیں ہوتا کہ ہم کیا کرنے والے ہیں، وہ اپنے دونوں ہات میز پر رکھ کر میری آنکھوں میں دیکھ رہا ہے۔ تو آپ کا تعلق اسی شہر سے ہے؟ بالکل، میرے پاس شناختی کارڈ ہیں۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ کتنے سال گذارے ہیں آپ نے یہاں؟ کتنے سال سے کیا مطلب ہے آپ کا؟ میں یہیں پیدا ہوا، بڑا ہوا، یہاں کے قبرستان میں میرے آبا و اجداد دفن ہیں۔ آپ نے پوچھا کتنے سال؟ تو میں آپ کو بتا دوں میں اس شہر کے علاوہ اور کسی شہر کو جانتا بھی نہیں گرچہ اب یہ شہر میرے لئے بھی اتنا مانوس نہیں رہا۔ یہ اب پوری طرح میرے لئے اجنبی بن چکا ہے۔ اور اس پورے عرصے میں جب ٹرین کے انتظار میں آپ ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم پر بھٹک رہے تھے کسی نے موبائل پر آپ کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی کوشش تک نہیں کی نہ ہی آپ نے کسی کو فون کرنے کے بارے میں سوچا؟ میں لوگوں کو اطلاع دیے بغیر گھر سے نکل آیا تھا۔ آپ دیکھ سکتے ہیں میرے پاس کوئی سیل فون نہیں ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ میں نہیں چاہتا تھا اب میرے لوگ مجھ سے رابطہ قائم کریں۔ کوئی تو وجہ ہوگی اس کی؟ کوئی اپنے گھر سے اچانک اس طرح قطع تعلق نہیں کرتا۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ میرے جسم میں ایک غلط ہڈی لگی ہوئی ہے جس نے سب کچھ ملیامیٹ کر رکھا ہے اور میں اس شہر سے ہار گیا ہوں۔ بلکہ اب مجھے لگتا ہے یہاں میرے کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے۔

جادب ایک پل کے لئے گہری سوچ میں ڈوب گیا ہے۔ شاید وہ میری عجیب و غریب کہانی کے لئے تیار نہ تھا۔ اور جب کہ کمرے کی خاموشی مجھے کسی بھاری پتھر کی طرح لگ رہی ہے جس نے ہم تینوں کو اپنے بوجھ کے نیچے دبا رکھا ہے مجھے گیدڑ نما کانسٹبل کی سرگوشی سنائی دیتی ہے، وہ کس غلط ہڈی کی بات کر رہا ہے، سر؟ جادب اس کی طرف اکتاہٹ کے ساتھ دیکھتا ہے۔ اس کی پیشانی پر گہری سلوٹیں ابھر آئی ہیں۔ وہ ہمارا معاملہ نہیں ہے، وہ اپنے ماتحت کو مختصر سا جواب دیتا ہے اور چہرا میری طرف پھیر کر سوٹ کیس میز پر لانے کا حکم دیتا ہے۔

سوٹ کیس میز پر رکھ دیا گیا ہے جسکا کمبی نیشن لاک میں کھول دیتا ہوں۔ جادب میرے سامانوں کو ایک ایک کر کے میز پر پھیلاتا جا رہا ہے۔ اس کے چہرے کی طرف تاکتے

ہوئے میں سوچ رہا ہوں ایک انسان کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ کب اس نے اپنے فرض کا چولا بدل لیا ہے اور اپنی فطری درندگی کے اندر لوٹ آیا ہے۔ کپڑوں کے نیچے سے کاغذات باہر نکال کر وہ بلب کی تیز روشنی میں آنکھیں سکوڑ کر ان کا جائزہ لے رہا ہے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ اس کی آنکھیں کمزور ہو چکی ہیں جس کا اسے احساس نہیں ہے۔ اسے چاہئے کہ وہ کسی ماہرِ چشم سے رجوع کرے۔ کچھ دیر تک میرے سامانوں کے ساتھ سر کھپانے کے بعد شاید اسے مایوسی ہوئی ہے۔ وہ انھیں بے ترتیبی سے واپس سوٹ کیس کے اندر ٹھونسنے لگتا ہے جب کہ میں اس پورے معاملے سے الگ تھلگ کھڑکی کے سامنے کھڑا شہر کی روشنیوں کا جائزہ لے رہا ہوں۔ یہ شہر، میں سوچ رہا ہوں، میں کیوں اس کا حصہ نہ بن سکا، اس کے باغات، اس کے میدان اور تالاب، اس کے بازار اور ہوٹل، اس کی درس گاہیں، ایسا کیا ہوا کہ دھیرے دھیرے یہ چیزیں میرے لئے معدوم ہوتی گئیں اور لوگ میری پرچھائیں سے دور ہوتے چلے گئے۔

میں نہیں جانتا اس شہر نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ میں اپنے کندھے اچکا کر با آواز بلند کہتا ہوں اور خود اپنی آواز سے چونک پڑتا ہوں۔ ایمانداری سے دیکھا جائے تو میں اس وقت شعوری طور پر کسی سے مخاطب بھی نہیں تھا۔ میں نے اس شہر سے بہت زیادہ کی مانگ تو نہیں کی تھی۔ میں نے تو صرف یہ چاہا تھا کہ میرے حصے کی آکسیجن مجھے ملے۔

جواب میں مجھے چوبی قدمچوں پر دھم دھم کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں کھڑکی سے مڑ کر دیکھتا ہوں، میں ہال میں تنہا کھڑا ہوں۔ میری سوٹ کیس کا ڈھکن کھلا ہوا ہے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ بے ترتیبی سے ٹھنسے ہوئے سامانوں کے سبب اس نے بند ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ میں سامان باہر نکال کر انھیں دوبارا ترتیب سے سجاتا ہوں اور ماحول کا دہشت کم کرنے کے لئے سوٹ کیس کا ڈھکن زور سے بند کرتا ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اس آواز سے گھبرا کر کھڑکی سے چپکی ہوئی کوئی چڑیا پر پھیلا کر اڑ گئی ہو۔ مگر یہ میرا وہم بھی ہو سکتا ہے۔

میں ہال سے باہر آ کر لینڈنگ کے سامنے کھڑے ہو کر گھماؤ دار سیڑھی کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں جو دھندلی ہوتی ہوئی اپنے چوبی جنگلے کے ساتھ نیچے کی طرف چلی گئی ہے۔ جنگلے کی مرغولے دار پرچھائیں دیوار پر اس طرح گر رہی ہے جیسے وہ نیچے جانے کے لئے مجھ پر کسی طرح کا نفسیاتی دباؤ بنا رہی ہو۔ ہیلو، اس کا کیا مطلب ہے؟ میں جنگلے کا اوپری سرا تھام کر سیڑھی کے

کنویں کے اندر اپنی آواز بھیجتا ہوں۔ کیا میں یہاں قید ہو چکا ہوں؟ میری آواز نیچے سے لوٹ آتی ہے۔ نیچے کسی لینڈنگ پر ایک دروازہ کھل کر بند ہو جاتا ہے۔ دور شہر سے پٹاخوں اور بینڈ پارٹی کی ملی جلی آوازیں آرہی ہیں جن میں سب سے نمایاں آواز ٹرمپٹ کی ہے۔ جو کچھ میرے ساتھ پیش آرہا تھا اس کے پیشِ نظر یہ شور مجھے عجیب لگ رہا ہے۔ مگر پھر میں سوچتا ہوں کہ اس کے باوجود کہ جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا تھا اور میری سمجھ سے بالاتر تھا، کسی بھی فرد کے ساتھ پیش آنے والا کوئی بھی واقعہ اتنا اہم نہیں ہوتا کہ ایک شہر کی پوری زندگی پر اثر انداز ہو سکے۔ دوسری طرف اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ میں جب ان عجیب وغریب حالات سے گذر رہا تھا تو میرے پیدائشی شہر کے لوگ اپنے روز مرہ کے کاموں میں مصروف ایک شور اور ہنگامے کے اندر اپنی زندگی کا مفہوم تلاش کرنے میں مصروف تھے کیونکہ جب ہمیں اپنے خالی پن کا کوئی جواز نظر نہیں آتا، ہم اسے شور سے بھرنا چاہتے ہیں، بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ جب ہمیں اپنے سوالوں کے جواب نہیں ملتے تو ہمارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں رہ جاتا کہ ہم اپنے ڈرم پیٹتے ہوئے، لاؤڈ اسپیکر پر چیختے چلاتے ہوئے ایک ایسے غل غپاڑے کی تخلیق کریں جس میں ہر چیز غرق ہو کر رہ جائے۔ میں ان خیالوں میں اتنا غرق تھا کہ لکڑی کا زینہ اترتے ہوئے میں پہلی منزل کی لینڈنگ پر ایک شخص سے ٹکراتے ٹکراتے بچتا ہوں جس نے داہنے ہات میں کولڈ ڈرنک کی تین بوتلیں اور بائیں ہات سے کاغذ کا ایک پیکٹ اٹھا رکھا ہے جس سے آملیٹ کی تیز مہک آرہی ہے۔ اس نے وردی نہیں پہنی ہے مگر وہ کوئی پولس والا ہی ہے۔ اس کے یہاں ہونے کا اور کیا سبب ہو سکتا ہے؟

احتیاط سے سر، وہ مسکراتے ہوئے کہتا ہے۔ صاف نظر آرہا ہے کہ وہ نشے کے آخری پائدان پر ہے جب خیر سگالی کا جذبہ انسان کے اندر بلاوجہ موجیں مارنے لگتا ہے۔ سیڑھی کے قدمچے گھسے ہوئے ہیں۔ آپ اپنی ٹانگ تڑا سکتے ہیں۔

شکریہ، مجھے ذرا جلدی ہے۔ کہیں میری ٹرین نہ نکل گئی ہو۔

عمارت سے باہر نکل کر میں دیکھتا ہوں، پلیٹ فارم پر تیز ہوا چل رہی ہے، تاروں سے ڈھکا آسمان میرا منتظر ہے اور ایک کتا مجھ پر بھونکنے کی تیاری کر رہا ہے۔

////////

تیز ہوا سے لڑتے ہوئے میں اندھیرے میں چل رہا ہوں۔ پلیٹ فارم کی روشنیاں کچھ فاصلے پر میرا انتظار کر رہی ہیں۔ میں پلٹ کر عمارت کی طرف دیکھتا ہوں جس سے میں ابھی ابھی باہر آیا تھا۔ اس کی سب سے اوپر کی منزل کی کھڑکیاں اب بھی روشن ہیں جیسے اندر کسی دوسرے شخص کی جرح چل رہی ہو۔ کتا ایک محفوظ فاصلہ بنائے ہوئے دبی دبی آواز میں بف بف کرتا ہوا میرا تعاقب کر رہا ہے مگر جس تناسب سے میں روشنی کے قریب آتا جا رہا ہوں اسی تناسب سے میرے اور اس کے درمیان کا فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے یہاں تک کہ وہ میرے پیچھے اندھیرے میں چھوٹ جاتا ہے جہاں سے اس کے بھونکنے کی آواز متواتر آتی رہتی ہے جیسے وہ نہیں بلکہ اندھیرا بھونک رہا ہو۔ میرے پیر شل ہو چکے ہیں۔ اب اس پلیٹ فارم پر ایک آدھ ہی مسافر بچے ہیں۔ میں روشنی کے سمندر میں داخل ہوتا ہوں اور لکڑی کے ایک خالی بینچ کا انتخاب کر کے جو ایک رنگین تھوکدان سے بالکل سٹا ہوا ہے سوٹ کیس کو سر کے نیچے رکھ کر اپنی ٹانگیں پھیلا دیتا ہوں۔ گرچہ میرے پپوٹے نیند سے بوجھل ہو رہے ہیں مجھے دیر تک نیند نہیں آتی اور میں ایک ٹک اپنے جوتے کی نوک پر نظریں ٹکائے آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس وقت طرح طرح کے خیالات میرے ذہن میں چکر لگا رہے ہیں جن سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو رہا ہے جن میں بینڈ پارٹی اور شہر کے لوگوں کا شور بھی شامل ہے گرچہ اس وقت پلیٹ فارم پر قبرستان جیسی خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ دیر تک میں اسی طرح بینچ پر کروٹیں بدلتا رہتا ہوں۔ شاید اس کی ایک دوسری وجہ بھی ہو۔ شاید میں خوفزدہ تھا کہ مجھے نیند آ گئی تو میرا سوٹ کیس چرا لیا جائے گا۔ اور شاید یہ اسی خوف کا نتیجہ تھا کہ اچانک مجھے گہری نیند آ دبوچتی ہے۔ اور جب کہ میں اپنے خواب میں اپنے سوٹ کیس کی تلاش میں جسے چرا لیا گیا تھا حیران و پریشان ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم کا چکر لگا رہا تھا، اچانک مجھے کوئی جھنجھوڑ کر جگا دیتا ہے۔ آنکھیں کھول کر میں دیکھتا ہوں، صبح ہو چکی ہے اور میرے عین سامنے ایک ٹرین کھڑی ہے جو مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی ہے۔ دور تک ٹرین کے دروازوں کے باہر مسافروں اور انھیں چھوڑنے والوں کا ہجوم ہے، اخبار والے اور خوانچہ والے کھڑکیوں کے سامنے سے آواز لگاتے ہوئے گذر رہے ہیں اور میرے سامنے کسی نے ڈبے کی کھڑکی سے قئے کر دی ہے جس نے ٹرین کی دیوار پر ایک لمبی لکیر کھینچ ڈالی ہے۔

یہ وہی بوڑھا قلی ہے جو مجھ پر جھکا ہوا ہے۔

حضور، آپ کی ٹرین آچکی اور آپ ہیں کہ خراٹے لے رہے ہیں۔آپ جلدی کریں۔ گارڈ کبھی بھی ہری جھنڈی دکھا سکتا ہے۔میں نے آپ کے لئے ایک سیٹ لوٹ لی ہے۔اور کچھ نہیں، آپ صرف چائے پانی کا خرچ دے دیجئے گا۔

قلی مجھ سے اجازت لئے بغیر میرا سوٹ کیس اٹھا لیتا ہے اور میں اس کے پیچھے پیچھے کسی روبوٹ کی طرح چل پڑتا ہوں۔میری جوڑوں سے درد کی ٹیسیں ابھر رہی ہیں گرچہ مجھے اس اعتراف میں کوئی شرمندگی نہیں کہ مجھے اپنے سوٹ کیس کے واپس مل جانے پر ایک عجیب مسرت کا احساس ہو رہا ہے اس سے قطع نظر کہ اس کے کھونے کا واقعہ خواب میں پیش آیا تھا۔ٹرین کافی لمبی ہے اور ہر دو کمپارٹمنٹ کے بیچ سے نجاست اور پیشاب کی تیز سڑاندھ پھیل رہی ہیں جس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ٹرین رات بھر کا سفر کرتے ہوئے آرہی ہے۔میں قلی کے پیچھے پیچھے ڈبے میں داخل ہوتا ہوں اور اس بات کی چھان بین کیے بغیر کہ یہ واقعی میری ٹرین تھی بھی یا نہیں اس کی بتائی ہوئی سیٹ پر بیٹھ جاتا ہوں۔مجھے یہ سوچ کر حیرت ہو رہی ہے کہ پہلے مجھے اس بات کا خیال کیوں نہیں آیا کہ جب میری کوئی منزل نہیں تو میں تو کسی بھی ٹرین کی سواری کر سکتا ہوں! تو میں ٹرین کے اندر اپنی سیٹ پر بیٹھا اطمینان کی سانس لے رہا تھا جب میرے روبرو بیٹھا ہوا کوتاہ قد آدمی میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھتا ہے۔اس کے پاس کوئی گردن نہیں ہے اور اس نے صبح کی ٹھنڈک سے مقابلہ کرنے کے لئے ایک خاکستری رنگ کی لمبی وردی پہن رکھی ہے جس کے کالر اس کے کانوں تک پہنچ رہے ہیں۔یہ وہ وردی ہے جسے عام طور پر ریلوے کے عملے جاڑے کے دنوں میں پہنا کرتے ہیں۔

شاید آپ کو میری تلاش تھی؟ وہ مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔آپ نے میرا نام تو سنا ہوگا۔میں سگنل مین گوچرن رائے ہوں۔کیا آپ مجھ سے بند گھڑی کی کہانی سننا چاہیں گے؟

کیا کہانی لمبی ہے؟

آپ جتنی لمبی چاہیں میں اسے اتنی لمبی کر سکتا ہوں۔بلکہ میں تو اسے اتنی لمبی کر سکتا ہوں کہ یہ سفر کٹ جائے اور یہ کہانی ختم نہ ہو۔آخر کہانیوں کا مقصد ہی کیا ہے اگر وہ وقت کو پیچھے چھوڑنے میں ہماری مدد نہ کریں۔

پھر تو ہمارا سفر اچھا گذرنے والا ہے، میں ہنس کر اپنی ٹانگیں سامنے کی سیٹ کے نیچے دور تک پھیلا دیتا ہوں اور کھڑکی سے باہر تاکنے لگتا ہوں جہاں کھیتوں کے بیچ سورج نمودار ہو چکا ہے اور درخت تیزی سے پیچھے چھوٹتے جا رہے ہیں۔

ہَول

مجھے ایک خط ملا ہے جس میں میری موت کی پیشن گوئی کی گئی ہے۔ لکھنے والے نے اپنا نام امید علی لکھا ہے۔ کیا وہ مجھے جانتا ہے؟ ہاں، اس نے مجھے سینکڑوں بار مقبرہ عام کے پُل پر دیکھا ہے جس سے پانی کا بڑا پائپ گذرتا ہے۔ مجھے تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ یہ پُل مجھے پسند ہے جب کہ اس کے پائپ پر بھکاریوں کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ بیٹھی رہتی ہے۔ کون انھیں بھیک دیتا ہے؟ میں نے تو کبھی نہیں دیا۔ میں نے کسی کو انھیں بھیک دیتے بھی نہیں دیکھا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ لوگ جو چیتھڑوں میں ملبوس بڑے پائپ پر خاموش بیٹھے رہتے ہیں، بھیک ان کا پیشہ نہیں۔ اس کی آڑ میں وہ گرد کا کاروبار کرتے ہیں، جھگی جھونپڑیوں میں دھندا کرنے والی طوائفوں کے لئے گاہک رجھاتے ہیں، گذرتے راہگیروں کی جیب کاٹتے ہیں اور اکثر پاس پڑوس کے محلّوں سے نادار اور مفلس بچے بچیوں کے غائب ہونے کے واقعات کے پیچھے ان ہی کا ہات ہوتا ہے۔ معاملہ کچھ بھی ہو اس پُل کے وسطی حصّے میں ایک عجیب طرح کی ویرانی چھائی رہتی ہے جہاں ریلنگ کے سامنے کھڑے ہو کر سورج کو ڈوبتے یا نکلتے دیکھنا ایک الگ ہی قسم کا تجربہ ہے۔ لیکن اصل مزا تو تب ہے جب چاندنی رات ہو اور آسمان میں تارے چمک رہے ہوں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس خط میں ان چاندنی راتوں کا بھی ذکر ہے جب میں پُل پر کھڑے کھڑے ایک بے جان مجسمے میں بدل جایا کرتا ہوں۔ لیکن کسی کو میری ذات سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے کہ وہ میری موت کی پیشن گوئی کرتا پھرے اور پھر مجھے خط لکھ کر ہوشیار کرے؟ خط میں خاص طور پر لکھا گیا ہے کہ میری موت اسی ماہ ہونے والی ہے۔ گرچہ میری موت کس طرح ہوگی امید علی نے اس پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔ شاید اسے خود پتہ نہ ہو کیونکہ اگر یہ پتہ چل جائے کہ موت کس طرح ہوگی تو شاید

اسے ٹالنا ممکن ہو جائے۔ آخر کار ہم ایک سائنس کے دور میں جی رہے ہیں جہاں اگر معاملہ نا قابلِ علاج بیماری کا نہ ہو تو کچھ تو کیا ہی جا سکتا ہے۔ بلکہ اب تو نا قابلِ علاج بیماریاں تک کچھ برس کے لئے ٹالنا ممکن ہو گئی ہیں۔ نہیں، یہ اٹل ہے، اس موت کو ٹالا نہیں جا سکتا، خط میں پورے وثوق کے ساتھ یہ بات دہرائی گئی ہے۔ تو پھر اسے یہ خط لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کیا اس پیشن گوئی کے ذریعے وہ مشہور ہونا چاہتا ہے؟ پھر اس کے لئے کیا ضروری نہ تھا کہ مجھے خط نہ لکھ کر وہ یہ پیشن گوئی میرے حوالے سے کسی اخبار میں شائع کرواتا؟ امید علی! شاید یہ نام میں نے کہیں سنا ہے۔ یہ وہی آدمی تو نہیں جو کھال کے کنارے بکرا ہاٹ میں بانسری بجایا کرتا ہے اور لوگ اسے ایک ٹھگ کے طور پر جانتے ہیں؟

بکروں کا یہ ہاٹ میری گلی سے تھوڑی دور واقع ہے جہاں سے بڑی بدبو آیا کرتی ہے گرچہ ہمارے اور اس ہاٹ کے بیچ مکانوں کی ایک بڑی تعداد حائل ہونے کے سبب ہم تک یہ بدبو شاذ و نادر ہی پہنچ پاتی ہے۔ اس ہاٹ کے کنارے کھڑے ہو کر ہزاروں کی تعداد میں ان بکرے بکریوں کو دیکھا جا سکتا ہے جنہیں بیوپاری دس دس کی تعداد میں باندھے رکھتے ہیں۔ ان جانوروں کی طرف دیکھتے ہوئے کسی کا بھی اس تاثر سے گذرنا فطری ہے کہ یہ شہر ایک راکشش ہے جو ہر روز ہزاروں کی تعداد میں ان جانوروں کو ان کے سینگ اور کھال سمیت نگلتا رہتا ہے، مگر پھر بھی اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ میں جب خط لے کر اس کی تلاش میں ہاٹ کی طرف گیا تو وہ مجھے کئی دن تک نظر نہ آیا۔ ہاٹ کی زمین جانوروں کے کھروں کی چوٹ کھا کھا کر دھول اور مٹی میں بدل گئی تھی جس پر جگہ جگہ سوکھے پتے پڑے تھے جنہیں جانوروں نے کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ ان انسانی پیروں سے کچلے ہوئے پتوں پر جانوروں کے پیشاب کے نشان تھے جن سے تیز بخارات نکلا کرتے۔ اس ہاٹ سے مقبرہ عام کا وہ کمانی پل دکھائی دیتا جو اس کھال سے گذرنے کا واحد ذریعہ تھا۔ کھال کے کنارے لوہے کے ریلنگ سے لنگیاں، توشک اور کمبل لٹک رہے تھے جن میں سے کچھ دھوپ اور بارش میں سڑ گل کر ریلنگ کے ساتھ دائمی طور پر چپک گئے تھے۔ صبح کی طرف کھال کے گدلے پانی میں جسے پانی کی بجائے کیچڑ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، ننگ دھڑنگ بچوں کا ہجوم دکھائی دیتا جو مچھلی اور گھونگے کی امید میں آس پاس کی جھگی جھونپڑیوں سے نمودار ہوتے۔ مگر دوپہر ہوتے ہوتے یہ کھال بالکل سنسان ہو جاتا۔ ہاٹ کے ایک بڑے حصے پر جانور کے

بیوپاریوں کا ناجائز قبضہ تھا جو اپنی چٹائی کی بنی جھونپڑیوں کے باہر چارپائی پر بیٹھے چائے پی رہے ہوتے یا آپس میں گفتگو کیا کرتے۔ میں نے ایک بیوپاری کو چارپائی پر اکیلے بیٹھے دیکھ کر اس بانسری والے کے بارے میں پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ وہ تہبند اور کرتا پہنے ہوئے تھا اور اس کے ہات میں ایک کاؤنٹنگ مشین تھی جس پر اپنا انگوٹھا چلاتے ہوئے وہ بھنبناتے ہوئے وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ پہلے تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا، پھر اسے کچھ کچھ یاد آنے لگا۔ وہ ٹھگ؟ اس نے کہا اور خاموش ہو رہا۔ باقی بات کہنے کے لئے اس نے بہت کم آواز کا استعمال کیا تھا۔ میرا خیال ہے اسے پولس اٹھا کر لے گئی ہوگی، اس نے بس اتنا ہی کہا۔

تو وہ بانسری بیچنے والے سے زیادہ ایک ٹھگ کے طور پر مشہور تھا! اس سے تو یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس نے یہ خط مجھے کسی سازش کے تحت لکھا ہوگا۔ شاید اس نے سوچا ہوگا اس طرح میں اس کے شکنجے میں آ جاؤں گا۔ اس طرح موت کا خوف دل کے اندر ڈال کر اس نے کئیوں کی جیبیں خالی کی ہوں گی۔ میں گھر لوٹ رہا تھا تو ایک بار خیال آیا کہ اس خط کے ریزے ریزے کر کے پھینک دوں۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ گھر لوٹ کر میں نے وہ خط دوبارا پڑھا۔ بہت چھوٹا سا خط تھا۔ لکھنے کے انداز سے پتہ چل رہا تھا وہ کوئی خاص پڑھا لکھا نہ تھا۔ میں نے پلنگ کے نیچے سے گھسیٹ کر لوہے کا پرانا ٹرنک باہر نکالا۔ اس میں لکڑی کا ایک بکس تھا جس میں بہت سارے پرانے خطوط اور دستاویزات پڑی تھیں جن کی اب کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔ میں نے یہ خط اس بکس کے اندر ڈال کر اسے واپس ٹرنک کے اندر رکھ دیا۔ اس کے ایک ہفتے کے بعد اس کمانی پل کے فٹ پاتھ پر ایک ٹیکسی چڑھ گئی اور اس نے ایک شخص کو کچل ڈالا جو میں تھا۔ اس وقت میں لوہے کے ریلنگ پر ہات رکھے تاریک آسمان میں چمکتے ستاروں کی طرف دیکھ رہا تھا جب میں نے بریک لگنے کی تیز آواز سنی۔ روشنی کا جھماکہ ہوا، کوئی بھاری چیز میری کمر سے ٹکرائی اور میں ریلنگ پر جا گرا۔

//////////
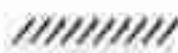
میں ایک ماہ تک سرکاری ہسپتال میں بے ہوش پڑا رہا۔ میری ریڑھ اور کمر کے ایک حصے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ میرے کئی آپریشن کئے گئے۔ تین ماہ زیر علاج رہ کر میں ہسپتال سے گھر واپس لوٹا تو میری کمر کے نیچے کا حصہ دائمی طور پر مفلوج ہو چکا تھا۔ اب میری ٹانگیں بے حس و

حرکت میرے جسم سے ٹھیک اسی طرح جڑی ہوئی تھیں جس طرح کسی کٹھ پتلی کی ٹانگیں پتلی بازی کی ڈور کے سہارے دھڑ کے ساتھ جڑی ہوتی ہیں۔ بظاہر ان ٹانگوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، سوائے اس کے کہ یہ تھوڑی سے بیڈھب ہوگئی تھیں، نسیں کہیں کہیں سوکھ کر دب سی گئی تھیں، کہیں پر ابھر آئی تھیں، جلد میں ایک طرح کی مردنی چھا گئی تھی۔ یا پھر کون جانے، شاید یہ ٹانگیں ہمیشہ سے ایسی ہی رہی ہوں، شاید اس سے پہلے میں نے کبھی انھیں غور سے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی ہو۔ کوئی بھی نہیں کرتا جب تک ان پر کوئی چوٹ نہ آجائے۔ میری رانوں کی بیلن نما جامد ڈھلانیں، میری گھٹنوں کی گولائیاں، پنڈلیاں جن کا بھاری پن عجیب ڈھنگ سے ہلکا ہوگیا تھا اور ان کا اگلا حصہ جہاں کی نرمی اب ایک ایسی سختی میں بدل گئی تھی جو مریضوں کے جسم میں در آتی ہے، ایڑیاں جن کے نیچے کی کھال جسم کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے کل تک مردہ نظر آتی تھی، مگر جو اب دھیرے دھیرے ملائم ہونے لگی ہے، پیروں کے انگوٹھے جنھیں اب میں ہلانے سے معذور ہوں اور پشتِ پا کے گٹھے جو آج بھی ویسے ہی سیاہی مائل نیلے ہیں، یہ سب چیزیں مل کر مجھے اس دنیا کے بارے میں بتا رہی تھیں جسے میں دائمی طور پر کھو چکا ہوں۔ ظاہر تھا اب میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارا نہیں رہ گیا تھا کہ باقی زندگی ان کی طرف تاکتے ہوئے بستر پر پڑے پڑے گذاروں۔ میں جس آئینہ ساز کی دکان میں شیشوں پر پارا چڑھانے کا کام کیا کرتا تھا اس کے مالک نے رسمی افسوس کا اظہار کیا اور ایک ماہ کی تنخواہ کے ساتھ مجھے نوکری سے برخواستگی کی اطلاع دی جو میرے لئے حیران کن نہ تھی۔ اب میں اس کے کسی کام کا نہیں رہ گیا تھا۔ میری بیوی کو، جسے پہلے بھی مجھ سے کچھ خاص امیدیں نہ تھیں، کوئی حیرت نہ ہوئی۔ اسے یقین تھا، کسی خیراتی ادارے سے مجھے کوئی وھیل چیئر یا ٹرائی سائکل مل جائے گی اور میں اس قابل ہو جاؤں گا کہ آئینہ ساز کی دکان پر جا سکوں۔ شاید وہاں مجھے پرانا کام مل جائے یا پھر میرے لئے کوئی دوسرا کام نکل آئے۔ آخر میں نے برسوں تک وہاں کام کیا ہے۔ ہفتوں بیت گئے، مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ ایک شخص نے مجھے رائے دی کہ میں اپنے حلقے کے ایم ایل اے کو خط لکھوں۔ ایم ایل اے نے فوراً خط کا جواب دے کر افسوس کا اظہار کیا اور مجھے امید دلائی کہ بہت جلد وہ لوگ میرے لئے کسی چیز کا انتظام کر دیں گے۔ اس نے وعدہ پورا کرنے میں دیر نہ لگائی۔ دو ماہ کے اندر اندر ایک جلسے میں اور بھی دوسرے معذور لوگوں کے ساتھ مجھے ایک ٹرائی سائکل پیش کی گئی جس کے پیڈل اپنے کرینک

کے ساتھ اوپر کی طرف لگے ہوئے تھے اور انھیں ہاتوں سے چلانا پڑتا تھا۔

میں جب پہلی بار ٹرائی سائکل پر بیٹھا تو مجھے ایسا لگا جیسے اب میں ایک ایسا انسان بن گیا تھا جس کے پیروں کی جگہ پہیے اگ آئے ہوں۔ ٹرائی سائکل کی پشت پر اس ادارے کا نام لکھا تھا جس کا سرپرست ایم ایل اے تھا۔ اس ٹرائی سائکل کو چلانے میں مجھے کچھ خاص دقت نہیں آئی کیونکہ مجھے بائی سائکل چلانی آتی تھی۔ صرف شروع شروع میں اس میں چڑھتے اور اترتے وقت مجھے کسی کے سہارے کی ضرورت پڑتی تھی۔ میری بیوی یہ کام بخوبی انجام دینے لگی۔ اسی درمیان میری بیوی نے، جو اپنے محلے کے اردو میڈیم اسکول سے درجہ ہشتم تک تعلیم حاصل کر چکی تھی، ایک زیراکس مشین کی دکان میں نوکری کر لی تھی۔ میرے دونوں بچے کارپوریشن کا اسکول جایا کرتے جہاں انھیں دن کا کھانا مل جاتا۔

مجھے یقین ہے کہ کچھ دنوں کے اندر میں اس قابل ہو جاؤں گا کہ تمہارے کام آسکوں، میں نے اپنی بیوی سے کہا۔ تم اکیلے اتنا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ تم گھر سے زیادہ دور نہ جایا کرو، میری بیوی نے میرے جذبے کو محسوس کیے بغیر کہا۔ گھر میں ویسے ہی پریشانیاں زیادہ ہیں۔ لیکن ابھی میرے دونوں ہات سلامت ہیں، میں نے کمزور سا احتجاج پیش کیا۔ میری بیوی کچھ دیر چپ رہی، پھر بولی، دیکھو تم کیا کر سکتے ہو؟

میں نے آئینہ ساز کو فون کیا اور اس سے کام مانگا۔ اس نے مجھے اگلے ہفتے کسی دن آنے کے لئے کہا۔ وہ ایک نیک انسان ہے، وہ یقیناً میرے لئے کوئی نہ کوئی کام ڈھونڈ نکالے گا۔ اس فون کے بعد مجھے تھوڑی سی طمانیت کا احساس ہوا۔ سورج ڈوبنے میں ابھی کافی وقت تھا جب میری بیوی کام سے لوٹ آئی۔ یہ اس کے آنے کا وقت نہ تھا۔ وہ کافی تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں نے اپنی بیوی سے ٹرائی سائکل پر بیٹھنے کے لئے مدد مانگی۔ اس نے مجھے کھانا پکانے کا اسٹوو کپڑے کی ایک تھیلی میں ڈال کر دیا۔ یہ کچھ دنوں سے ٹھیک سے کام نہیں کر رہا تھا اور کھانے کی چیزوں سے کراسین تیل کی بو آنے لگی تھی۔

تم گھبراؤ مت، میں نے کہا۔ میں اس کی مرمت کر کے لے آتا ہوں۔ مرمت کرنے والے نے مجھ سے ایک گھنٹے کا وقت مانگا۔ جو لڑکا اس کا کام کیا کرتا تھا وہ کہیں گیا ہوا تھا۔ وہ مجھے پہچانتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے میرے لئے افسوس ٹپک رہا تھا۔ اس کی لکڑی کی دکان پل کے

داخلے سے تھوڑا ہٹ کر مقبرہ عام کی پشت کی دیوار سے لگی ہوئی تھی اور وہ بچن کا وہ ہر سامان مرمت کرلیا کرتا جو مرمت کے قابل ہوتا۔ میرے ہات میں ایک گھنٹے کا وقت تھا کیونکہ میں اسٹو و لئے بغیر واپس نہیں لوٹ سکتا تھا۔ اس کے بغیر ہمیں رات کا کھانا ہوٹل سے منگانا پڑتا۔ میں کچھ دیر کے لئے پُل کا چکر لگا کر آتا ہوں، میں نے دکان کے مالک سے کہا اور ٹرائی سائکل کے ہینڈل بار کے دستے کو تھام کر، جو سہولت کے لئے بیٹھنے والے کے سامنے لگایا گیا تھا ٹرائی سائکل کا رخ پُل کی طرف موڑ دیا۔ پُل پر کافی چڑھائی تھی۔ اسکے درمیانی حصے تک پہنچنے کے لئے مجھے سخت محنت کرنی پڑی۔ میرا دم پھول گیا۔ ایک وقت تو ایسا آیا کہ پیڈل کے کرینک پر جھکے جھکے مجھے لگا پیڈل میرے ہات سے چھوٹ جائے گا، یا اس کی چین رِم کے دندانوں سے باہر نکل آئے گی جس کے نتیجے میں ہوسکتا ہے ٹرائی سائکل ڈھال پر پیچھے کی طرف دوڑتی چلی جائے اور میں ایک بار پھر کسی حادثے کا شکار ہو جاؤں۔ مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور کسی طرح ٹرائی سائکل کو پُل کے وسطی حصے پر لے آیا جہاں کی زمین ہموار تھی۔ میں نے سائکل روک کر سانس درست کرتے ہوئے دونوں اطراف کے ریلنگ پر نظر ڈالی اور مجھے احساس ہوا اب یہ پُل میرے کسی کام کا نہیں رہ گیا تھا کیونکہ اس کے ایک طرف تو وہ بڑا سا پائپ تھا جس نے سارا فٹ پاتھ گھیر رکھا تھا اور دوسری طرف کا فٹ پاتھ کم از کم آدھا فیٹ اونچا تھا جس پر ٹرائی سائکل کے پہیوں کو چڑھانا ممکن نہ تھا۔ سڑک سے ہر طرح کی سواریاں گذر رہی تھیں۔ یہاں کسی کو گاڑی کھڑی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ظاہر تھا، مجھے دیکھ کر ایک پولس والا سیٹی بجاتا آنکلا۔ شاید اسے ڈر تھا میں اس جگہ اپنی ٹرائی سائکل کھڑی کر کے بھیک مانگنا شروع نہ کر دوں۔

آہ! میں نے سوچا۔ واقعی اب یہ پُل میرے کسی کام کا نہیں رہ گیا تھا سوائے اس کے کہ میں اسے کھال سے گذرنے کے لئے استعمال کروں۔ میں نے یوٹرن لے کر ٹرائی سائکل کا رخ اپنے محلے کی طرف موڑ لیا۔ اس وقت ہوا کا ایک جھونکا آیا جس میں بکراہاٹ اور کھال کی ملی جلی بو شامل تھی۔ مجھے معلوم نہیں کیوں، شاید اس لئے کہ اب بھی میرے پاس کافی وقت تھا یا شاید اس لئے کہ میرے نہ چاہتے ہوئے بھی ڈھلان اترتے اترتے میری ٹرائی سائکل نے رفتار پکڑ لی تھی، اس کا ہینڈل بار خود بخود بائیں جانب مڑ گیا، جیسا کہ اکثر سائکلوں کے ساتھ ہوتا ہے، اور دیکھتے دیکھتے میں بکراہاٹ کی سڑک پر جا نکلا۔

اس دن ہاٹ میں بلا کی بھیڑ تھی۔ میں واپس لوٹنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ میرے کانوں سے بانسری کی آواز ٹکرائی۔

//////

جسمانی طور پر معذور لوگوں کی ٹرائی سائکل کے ساتھ ایک بڑی راحت یہ ہوتی ہے کہ ایک ایمبولنس کی طرح لوگ آسانی سے اسے راستہ دے دیتے ہیں۔ ظاہر تھا، انسانوں اور جانوروں کی بھیڑ کے باوجود مجھے بانسری بجانے والے تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہ لگا۔ وہ ایک چودہ برس کا لڑکا تھا جس کی بھویں جڑی ہوئی تھیں۔ اس کے سر پر تنکے کا ایک پرانا ہیٹ تھا جو اس کے سر کے مقابلے کافی بڑا تھا۔ وہ بانسریوں سے بھری تھیلی بغل سے لٹکائے لکڑی کے ایک کھمبے کے نیچے کھڑا خود ایک بانسری بجا رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف تاکتے دیکھ کر ایک ممکنہ گاہک کی امید میں اس نے ایک کالے رنگ کی بانسری نکال کر میری طرف بڑھا دی۔ تم امید علی ہو؟ میں نے بانسری تھامتے ہوئے پوچھا۔ میں ان کا بیٹا ہوں مکرم۔ تمہارا باپ ادھر نہیں آتا؟ لڑکا اپنے ہونٹوں سے بانسری لگاتے لگاتے رک گیا۔ آپ انھیں جانتے ہیں؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ پھر تو آپ کو میرے ساتھ گھر جانا ہوگا۔ تم لوگ کہاں رہتے ہو؟ قریب ہی ایک محلے میں۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا جو سرمئی ہو چلا تھا۔ آج میرے پاس وقت کم ہے۔ یوں بھی اندھیرا ہونے کے بعد میں کم باہر نکلتا ہوں۔ کوئی بات نہیں، لڑکے نے سر ہلا کر کہا۔ میں ہر روز سورج ڈوبنے سے پہلے یہاں آیا کرتا ہوں۔

لڑکے نے بانسری کو ہونٹوں سے لگا لیا۔ وہ کوئی خاص دھن نہیں بجا رہا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے بانسری بجانا نہیں آتا۔ وہ بانسری کی آواز کو یوں ہی کسی سُر میں ڈھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسٹوولے کر میں گھر پہنچا تو پوری طرح اندھیرا چھا چکا تھا۔ اپنی بیوی کی مدد سے میں نے ٹرنک کو پلنگ کے نیچے سے باہر نکالا اور اس سے وہ پیشن گوئی والا خط برآمد کیا۔ میں نے بلب کی روشنی میں خط کو کئی بار پڑھا۔ گرچہ اس کی پیشن گوئی غلط ثابت ہوئی تھی مگر یہ پوری طرح سے غلط بھی نہیں کہی جا سکتی تھی۔ میں موت کے منہ سے لوٹا تو تھا مگر غیر جانبداری کے ساتھ دیکھا جائے تو میری موجودہ زندگی موت سے بھی بدتر تھی۔

تم نے اس سے پہلے کبھی کسی خط کا ذکر نہیں کیا؟ میری بیوی نے خط مجھ سے لیتے ہوئے

کہا۔ وہ جیسے جیسے اسے پڑھتی گئی اس کی آنکھیں بڑی ہوتی چلی گئیں۔ تم نے مجھے اس خط کے بارے میں پہلے کبھی نہیں بتایا، اس نے اپنی بات دہرائی۔ اس سے کیا فرق پڑ جاتا؟ ہم کسی سے مشورہ لے سکتے تھے۔ صاف نظر آ رہا ہے یہ حادثہ ایک قسم کی وارننگ ہے۔ اس واقعے کو کئی مہینے گذر چکے ہیں، میں نے خط واپس لیتے ہوئے کہا۔ اب اس میں کیا رہ گیا ہے۔ نہیں، بات ابھی ٹلی نہیں ہے۔ تمہیں ہوشیار رہنا چاہئے۔ میں نے خط کو لکڑی کے بکس میں ڈال کر ٹرنک کا ڈھکن بند کر دیا۔ اب مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا۔ تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟ میری بیوی شکایت بھرے انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ تمہارے دو بچے ہیں۔ کیا تمہیں ان سے کوئی ہمدردی نہیں؟ مجھے حیرت ہوئی۔ مردوں کی صحبت میں رہ کر اس کی گفتگو کا لہجہ کتنا بدل گیا تھا! اور یہ وہی عورت تھی جو کل تک چولھا چوکا سے باہر سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ شاید یہ بات سچ ہے کہ برے وقت میں ہی انسان کی خوبیاں اجاگر ہوتی ہیں۔

دوسرے دن موبائل پر آئینہ ساز کا فون آ گیا۔ اس نے مجھے ملنے کے لئے کہا۔ جو سفر میں بس میں منٹوں میں طئے کر لیا کرتا تھا، آج اسے طئے کرنے میں مجھے آدھے گھنٹے سے زیادہ لگ گیا۔ اوّل تو اپنی ٹرائی سائکل پر مجھے کسی بڑی سڑک سے گذرنے کا اس سے پہلے اتفاق نہیں ہوا تھا، دوسرے ایک ہات سے پیڈل گھمانا اور دوسرے ہات سے ہینڈل بار کو کنٹرول میں رکھنا عام سائکل کے مقابلے ایک الگ ہی قسم کا تجربہ تھا۔ شاید اسی لئے پل سے گذر کر جب میں بڑی سڑک پر پہنچا تو بسوں اور لاریوں کے بڑے بڑے پہیوں کے درمیان مجھے کافی ڈر لگ رہا تھا۔ میں ٹرائی سائکل کو گھونگے کی رفتار سے چلانے پر مجبور ہو گیا۔

ایک سرجنٹ جو ٹریفک کنٹرول کر رہا تھا میری دھیمی رفتار سے بے صبر ہو کر سیٹی بجاتا ہوا میرے سر پر آ کھڑا ہوا۔ اس سائکل کے ساتھ تمہیں اس وقت اس سڑک پر نہیں آنا چاہئے تھا، اس نے میرے دونوں طرف کی ٹریفک کو میرے لئے روکتے ہوئے کہا، تمہیں پتہ چلنا چاہئے اس وقت اسکولوں میں چھٹی ہوتی ہے۔ مجبوری تھی سر، میں نے ممنونیت کا اظہار کیا۔ سڑک سے گذر کر میں آئینہ بنانے والوں کی گلی میں داخل ہو گیا۔ آئینہ ساز مجھ سے تپاک سے ملا۔ دوسرے ملازم بھی ملنے آئے۔ آئینہ ساز نے کہا، شیشوں پر پارا چڑھانے کا سارا کام زمین پر ہوتا ہے اور میرے لئے ممکن نہیں کہ فرش پر جگہ بدل بدل کر یہ کام کر سکوں۔ اگر مجھے ایک ٹیبل مل جائے تو میں یہ کام

کرلوں گا، میں نے تجویز پیش کی۔میرے پہیے ہر طرف مڑ سکتے ہیں۔مگر آئینہ ساز کی رائے دوسری تھی۔اس کے مطابق یہ کام میں کسی مددگار کے بغیر اکیلا نہیں کرسکتا تھا۔کام کرتے وقت بڑے بڑے شیشوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا پڑتا ہے جو میرے لئے ممکن نہ تھا۔اس سے شیشوں کے ٹوٹنے کا خدشہ تھا۔اس نے کہا، ہمارا چھوٹا کارخانہ ہے۔ہم پرانے طریقے سے کام کرتے ہیں۔چھوٹے سے چھوٹا نقصان بھی ہمارے کاروبار کے لئے جان لیوا ثابت ہوسکتا ہے۔لیکن تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔میں نے ایک بیڑی کے کارخانے سے تمہارے لئے بات کی ہے۔میں نے انکار میں سر ہلایا۔مجھے بیڑی باندھنی نہیں آتی۔یہ کام بالکل آسان ہے، آئینہ ساز نے اعتماد کے ساتھ کہا۔جلد سیکھ جاؤ گے۔تمہیں بیڑی کے پتے، تمباکو اور تاگے مل جائیں گے۔تم خوش نصیب ہو،تمہارے پاس ایک ٹرائی سائکل ہے،تم آسانی سے یہ کام گھر لے جاسکتے ہو۔تم جتنی محنت کروگے تمہیں اتنا زیادہ پیسہ ملے گا۔میں جی لگا کر محنت کروں گا، میں نے عزم کے ساتھ کہا۔یقیناً تم محنت کروگے،آئینہ ساز نے میری پیٹھ پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔اتنا بڑا حادثہ ہونے پر بھی تم ٹوٹے نہیں ہو۔تم جیسے لوگ سماج کے لئے مثال ہو۔

اس دن میں ٹرائی سائکل پر واپس لوٹا تو میرے ساتھ ایک تھیلی تھی جسے میں نے سیٹ پر رکھ کر سائکل کے فریم کے ساتھ باندھ دیا تھا۔شروعات کے لئے مجھے تھوڑے سے ہی سامان دیے گئے تھے۔پتوں کو قینچی سے کاٹنے،موڑنے،ان میں تمباکو بھرنے،ایک خاص طریقے سے ان کا منہ بند کرنے اور تاگوں سے باندھنے کی ٹریننگ بھی دی گئی تھی۔انھیں یقین تھا،گھر میں میں یہ کام آسانی سے سیکھ جاؤنگا۔میری بیوی کو سامان دیکھ کر خوشی ہوئی۔اس نے کہا،یہ اچھا ہوا،اس طرح تم گھر پر بھی رہ سکو گے اور تمہاری آمدنی کا ایک ذریعہ بھی نکل آیا۔میں نے بتایا،یہ میرے پچھلے مالک کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔مگر تمہیں بڑی سڑک سے گذرتے وقت احتیاط سے کام لینا چاہئے۔اس میں آئے دن حادثے ہوتے رہتے ہیں۔میں دھیرے دھیرے چلانا سیکھ جاؤں گا،اس کا ڈر دور کرنے کی خاطر میں مسکرایا۔ٹرائی سائکل کے ساتھ ان سڑکوں پر میں اکیلا انسان نہیں ہوں۔

اس نئے دھندے نے ایک طرح سے اس خط اور خط لکھنے والے سے میری توجہ ہٹا دی۔جلد ہی میں نے بیڑی باندھنے میں اچھی خاصی مہارت حاصل کرلی۔شاید میرے پیر ناکارا ہوجانے کی بھرپائی کے طور پر قدرت نے یہ انتظام کردیا تھا کہ میری انگلیاں کافی فعال ہوگئی

تھیں۔تم ایک اچھے کاریگر ثابت ہوئے ہو، ہفتے کے آخر میں مجھے کارخانے کے منیجر نے پیسہ چکاتے ہوئے کہا۔شاید اس لئے کہ اب میرے پاس صرف یہ دو ہات بچے ہیں جنھیں میں اپنی ساری طاقت، ساری توجہ دے سکتا ہوں۔ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے، اس نے کہا۔ وہ ایک صوم وصلوٰۃ کا پابند انسان تھا جسے خدا کی ذات پر پورا بھروسہ تھا۔ اس نے کہا، پروردگار ایک ہات سے جو کچھ لیتا ہے دوسرے ہات سے دوگنا واپس کر دیتا ہے۔

گرچہ میرے لئے یہ بات پورے طور پر صحیح نہیں کہی جا سکتی تھی، مگر میں اللہ کا شکر گذار تھا کیونکہ میرے ساتھ اس سے بھی برا ہو سکتا تھا۔ صرف میں اللہ سے دعا مانگا کرتا کہ میرے دونوں ہات سلامت رہیں۔ میں نے اب اس خط کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔ وہ جانور کا ہاٹ اب محض تعفن کا ایک ذریعہ تھا پل سے گذرتے وقت جس سے مجھے سامنا کرنا پڑتا۔ مگر اب میں آخری شخص تھا جو اس ہاٹ کے اندر جانے والا تھا۔

اس واقعہ کو چھ ماہ گذر چکے تھے جب ہمارے گھر چوری ہوئی۔ بچے اسکول گئے ہوئے تھے اور میں اپنی ٹرائی سائکل پر باہر نکلا ہوا تھا جب کوئی پلنگ کے نیچے سے ٹرنک چرا کر لے گیا۔ گرچہ اس ٹرنک میں کوئی قیمتی سامان نہیں تھا، مگر جانے کیوں اس خط کو کھو کر میں کافی خوفزدہ ہو گیا۔تم خوامخواہ پریشان ہو رہے ہو، میرے بیوی نے مجھے ڈھارس دلانے کی کوشش کی۔تمہارا یہ ڈر جائز نہیں ہے۔ اب ہمارے برے دن ختم ہو گئے ہیں۔ وہ ایک حادثہ تھا جو تمہارے ساتھ ہونے والا تھا، سو ہو گیا۔ میں نہیں جانتا، میری آواز کمزور تھی۔ مجھے وہ خط جلا دینا چاہئے تھا۔ ہمیں اس ٹرنک پر قفل نہیں ڈالنا چاہئے تھا۔ چور کو لگا ہوگا اس کے اندر قیمتی سامان ہوں گے۔

میں نے اپنے کام میں اس واقعہ کو بھلانے کی کوشش کی۔ مگر دھیرے دھیرے میرے اندر ایک عجیب تبدیلی آگئی۔ اب میرے کام کرنے کی رفتار نہ صرف سست ہو گئی تھی بلکہ کام کے وقت میری انگلیاں بھی کانپنے لگی تھیں۔ ہر وقت مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے کچھ برا ہونے والا ہے یا کوئی روحانی ابتلا مجھے اپنی لپیٹ میں لینے والی ہے۔ دوسری طرف سڑکوں پر اچانک گاڑیوں کی تعداد میں اچھا خاصہ اضافہ ہو گیا تھا جن کے درمیان ٹرائی سائکل کے لئے راستہ نکالنا مشکل ہوتا جا رہا تھا یا شاید میرے اندر کے خوفزدہ انسان کے لئے تمام چیزیں بتدریج خوفناک ہوتی جا رہی تھیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ پولس والوں کے رویوں میں بھی اچھی خاصی تبدیلی آگئی تھی جیسے میں

خوامخواہ ان کے کام میں رکاوٹیں پیدا کر رہا ہوں۔

اس کا وولٹیج اتنا لو کیسے ہو گیا ہے؟ ایک دن میں نے تار سے لٹکتے بلب کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ ہمارے ایک کمرے والے کرایہ کے گھر میں صرف ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جو پانچ فیٹ کی بلندی پر واقع تھی۔ اس کھڑکی کے دوسری طرف ایک ہات کے فاصلے پر پڑوس کی ایک غیر قانونی چار منزلہ عمارت کی دیوار تھی جس پر کہیں بھی کوئی روشن دان یا کھڑکی نہیں تھی۔ ظاہر ہے ہمارے گھر میں قدرتی روشنی کا انتظام برائے نام تھا اور ہمیں دن کے وقت بھی بلب جلا کر رکھنا پڑتا۔ تمہیں بجلی والے سے بات کرنی چاہئے، کام سے لوٹنے پر میں نے بیوی سے کہا۔ بجلی والا دراصل وہ آدمی تھا جو محلے میں بجلی کے عملے کے ساتھ ساز باز کر کے چوری کی بجلی سپلائی کیا کرتا۔ میں بلب صاف کئے دیتی ہوں، میری بیوی نے بلب اتار کر پہلے تو کپڑے سے رگڑ کر اس کا شیشہ صاف کیا پھر اس پر کچھ پانی کے قطرے ڈال کر اسے چمکایا۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ بلب کا شیشہ تو چمک اٹھا مگر اس کے اندر کا فلامنٹ ٹوٹ گیا۔ مجبوراً ہمیں بازار سے ایک نیا بلب منگوانا پڑا۔ اس سے روشنی میں اضافہ ہو تو گیا مگر پھر بھی جانے کیوں میرے لئے یہ روشنی اب بھی ناکافی تھی۔ میرے خیال سے تمہیں کسی آنکھ کے ڈاکٹر کے پاس جانا چاہئے، میری بیوی نے مجھے مشورہ دیا۔ اب میری آنکھوں کو کیا ہوا ہوگا؟ مجھے غصہ آ گیا۔ میں مشکل سے تیس برس کا ہوں۔ تم بجلی والے سے بات کیوں نہیں کرتیں؟ کی تھی، وہ کہتا ہے روشنی اپنی جگہ ٹھیک ہے، کہ ہم بیجا شکایت کر رہے ہیں۔ پکا شیطان ہے وہ بجلی چور، میں نے جواب دیا، مگر پھر چپ ہو رہا کیونکہ اگر وہ بجلی دینا بند کر دے تو ہمیں لالٹین سے کام چلانا پڑے گا۔ اس معاملے میں وہ بڑا سخت انسان تھا۔ ہمارے محلے میں ایسے درجنوں لوگ تھے جو اس روشنیوں سے جگمگاتے شہر کے بیچوں بیچ رہتے ہوئے بھی لالٹین سے کام چلا رہے تھے۔

تم دیکھ رہے ہو، تمہارا کام پہلے جیسا نہیں رہا، کارخانے کے منیجر نے ایک دن مجھے بلا کر میری بنائی ہوئی بیڑیوں کے بنڈل میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ میں نے سنا ہے تمہاری انگلیاں کانپنے لگی ہیں۔ اس کے لئے یہ عمر تو نہیں ہے۔ شاید مجھے آنکھ کے ڈاکٹر کے پاس جانا چاہئے، میں نے سر جھکا کر کہا۔ تم ہی نے بتایا تھا تمہاری آنکھوں میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے، پھر بھی لگتا ہے مجھے ایک بار آنکھ کے ڈاکٹر کے پاس جانا چاہئے۔ آنکھ کے ڈاکٹر نے مشین سے میری

آنکھوں کو جانچنے اور پھر دیوار پر لکھے گئے حروف پڑھوانے کے بعد اعلان کیا، میری آنکھوں میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ میں پھر بھی ایک دوا لکھ رہا ہوں۔ صبح شام تین تین ڈراپ ڈالتے رہا کرو۔

گھر واپس آکر میں دیر تک چپ بیٹھا رہا۔ شام ہو گئی تھی مگر میں نے بلب نہیں جلایا۔ میری بیوی واپس لوٹی تو اس نے بلب جلا کر حیرت سے میری طرف دیکھا۔ تم اندھیرے میں اس طرح کیوں بیٹھے تھے؟ اور بچے کہاں گئے؟ مجھے یہ اچانک کی روشنی پسند نہیں آئی تھی۔ میں نے جواب دیا، باہر کھیل رہے ہوں گے۔ یہ اچانک تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ میری بیوی میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔ وہ اپنی بیگ کے اندر ہاتھ ڈال کر کوئی چیز ڈھونڈ رہی تھی۔ میری ٹرائی سائکل میں کچھ خرابی آ گئی ہے۔ یہ کافی سست ہو گئی ہے۔ اس پر اب مجھے کافی محنت کرنی پڑتی ہے۔ میری بیوی کو شاید اپنی مطلوبہ چیز مل گئی تھی۔ پھر بھی اس نے اپنا ہات بیگ کے اندر رہنے دیا۔ کسی سائکل مستری کو کیوں نہیں دکھاتے؟ میں نے دکھائی ہے، اس نے سروس کر دی ہے۔ مگر اس کا وہی حال ہے۔ تم ٹھیک تو ہو؟ میری بیوی ہات بیگ سے باہر نکال کر میرے کندھے پر ہمدردی سے رکھتے ہوئے بولی۔ مجھے نہیں معلوم، یہ کہتے ہوئے میری آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ کہیں پر کچھ غلط ہے جو میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔

ہاں، یہ سچ ہے۔ کہیں پر کچھ غلط ہو گیا ہے جو میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میرے ساتھ کیا ہونے لگا ہے؟ انگلیوں کے کانپنے کے ساتھ ساتھ اب قینچی استعمال کرتے وقت ان کے حلقوں کے دباؤ سے میری انگلیوں کے جوڑوں سے دلخراش ٹیسیں ابھرنے لگی ہیں جو انگشتی ہڈیوں میں آگ لگا دیتی ہیں اور میں اپنے دوسرے ہات سے قینچی کو نکال پھینکنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ میں بہت دیر تک کام نہیں کر پاتا۔ کام کرتے کرتے چیزیں میری آنکھوں کے سامنے دھندلی لکیروں میں بدل جاتی ہیں اور میں انھیں آپس میں گڈمڈ کرنے لگتا ہوں۔ جاڑے کا موسم ابھی ٹھیک سے آیا بھی نہیں ہے، مگر مجھے ابھی سے ٹھنڈ لگنے لگی ہے۔ رات کی تنہائی میں اکثر میں ٹھنڈے بستر پر بیٹھا ہوا کانپتا رہتا ہوں مگر اس ڈر سے بیوی کو نہیں جگاتا کہ مجھے اس کے لئے کیفیت دینی پڑے گی۔ پُل سے گذر کر بیڑی کے کارخانے کی طرف جاتے وقت کبھی کبھی ٹرائی سائکل کی گھنٹی کی آواز جانے کہاں غائب ہو جاتی ہے جب کہ میں اس کا کان مروڑتے مروڑتے تھک جاتا ہوں۔ ان سب چیزوں کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ میں گھنٹوں کام کئے بغیر اپنے

سامنے رکھے سامانوں کی طرف خالی پن کے ساتھ دیکھتا رہتا ہوں جیسے انھیں سمجھنے کے لئے میرے پاس دماغ کی کمی ہو۔اور یہ کھڑکی سے اچانک بکراہاٹ کی بدبو کیسے آنے لگی ہے؟ اس سے پہلے تو یہ بدبو کبھی ہماری گلی میں نہیں آتی تھی۔دھیرے دھیرے نہ چاہتے ہوئے بھی میں ایک مریضانہ ماحول میں جینے لگا۔

جس دن میں ایک ٹریلر کے نیچے آتے آتے بچا جس پر ایک خالی کنٹینر لدا ہوا تھا اور جس کے ان گنت پہیے سڑک کے گڈھوں پر اچھل رہے تھے،تو میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے یہ کام چھوڑ دینا چاہئے۔یوں بھی اب میں زیادہ کام کرنہیں پارہا تھا اور کارخانے کے منیجر کو میرا کام سخت ناپسند آنے لگا تھا۔تم کیا سمجھتے ہو،ہم نے کوئی خیرات خانہ کھول رکھا ہے؟ایک دن اس نے مجھ پر غصہ سے چنگھاڑتے ہوئے کہا۔تم سارا سامان برباد کردیتے ہو،اوپر سے تمھیں اس کا معاوضہ چاہئے۔تم ٹھیک سے کام کیوں نہیں کرتے؟میں کوشش تو کرتا ہوں۔ہاں،تم کوشش کرتے ہو کہ سارا سامان برباد ہوجائے۔

میری بیوی کو میرا کام چھوڑنا پسند نہیں آیا۔تم دن بدن کاہل ہوتے جارہے ہو،اس نے غصے سے کہا۔تمھیں بیٹھے بیٹھے کھانے کی لت پڑگئی ہے۔یہ انگلیوں کا کانپنا،یہ کم دکھائی دینا،یہ سب تمہارا ناٹک ہے۔میں کوئی دوسرا کام ڈھونڈلوں گا،میں نے اپنے دفاع میں کہا۔تمہارے لئے دنیا میں شاید ہی کوئی دوسرا کام ہو۔

وہ شاید ٹھیک کہہ رہی تھی۔اب میرے دل کی دھڑکنیں کافی تیز ہوگئی تھیں اور رہ رہ کر میرے کانوں میں عجیب طرح کی آوازیں گونجنے لگی تھیں جیسے ایک ساتھ سینکڑوں لوگ دور کھڑے مائک پر چلا رہے ہوں۔اب میں خود سے ٹرائی سائکل پر بیٹھ نہیں پاتا جب کہ میں نے یہ مہارت حاصل کرلی تھی۔تھوڑی سی محنت سے ہی میرا دم پھولنے لگا ہے۔پچھلے کئی ہفتے سے میں دیکھ رہا ہوں،میری جلد پر چیونٹیاں رینگنے لگی ہیں جنھیں کپڑوں سے مجھے جھاڑتے رہنے کی عادت پڑگئی ہے۔میرے دونوں بچوں کو یہ تماشہ لگتا ہے،مگر میری گرم مزاجی کے خوف سے وہ اپنے تاثرات چہروں پر آنے نہیں دیتے۔میری نیند جانے کہاں چلی گئی ہے۔میں رات رات بھر اپنے بستر پر بیٹھا اونچائی پر بنی کھڑکی کی طرف دیکھتا رہتا ہوں جس سے پڑوس کے گھر کی دیوار کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا،مگر بہت دیر تک ایک ٹک دیکھتے رہنے کے بعد اچانک یہ کھڑکی ایک خط

کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔جس سے الفاظ پتوں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے رہتے ہیں۔ میں ان لفظوں کو پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں مگر میری آنکھوں میں اندھیرا امنڈ آتا ہے۔جس میں الفاظ غائب ہوتے چلے جاتے ہیں۔

//////

میں پچھلے دو ہفتے سے اس ہاٹ کا چکر لگا رہا ہوں مگر وہ بانسری والا لڑکا مجھے کہیں پر دکھائی نہیں دیتا۔

میں کئی دنوں سے دیکھ رہا ہوں تم روز اپنی ٹرائی سائکل پر یہاں آتے ہو،ایک دن ایک بیوپاری نے مجھے مخاطب کیا۔وہ ریلنگ سے لگی چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔تمہیں یہاں کیا کام ہے؟ تم جانور خریدنے تو نہیں آتے۔ مجھے ایک لڑکے کی تلاش ہے جو یہاں بانسری بیچا کرتا ہے۔چائے پیو،اس نے چائے والے کو دیکھ کر کہا جو کیتلی سے اس کے لئے پلاسٹک کے کپ میں چائے انڈیل رہا تھا۔نہیں، مجھے صرف اس لڑکے کا پتہ چاہئے۔اس کا نام معلوم ہے؟ مکرم علی، یہی نام بتایا تھا اس نے۔ میں اسے نہیں پہچانتا۔تم اسے جانتے ہو؟ بیوپاری نے چائے والے سے پوچھا۔ میں اس کا گھر نہیں جانتا، چائے والے نے جواب دیا۔ وہ آس پاس ہی کہیں پر رہتا ہے۔ میں نے کئی بار اسے بڑے نالے کی طرف بانسری بیچتے دیکھا ہے۔

یہ اطلاع میرے کسی کام کی نہ تھی۔ میں نے ہاٹ جانا چھوڑ دیا اور اپنی ٹرائی سائکل کے ساتھ کھال کے کنارے کے محلوں میں چکر لگانے لگا۔ یہاں کے زیادہ تر راستے تنگ تھے جن میں لوگ اچھی خاصی تعداد میں کھڑے رہتے جیسے اس کے علاوہ انھیں کوئی کام نہ ہو۔ یہ بالکل ہمارے محلّے جیسا معاملہ تھا۔چونکہ مجھے کہیں جانے کی جلدی نہ تھی مجھے اپنی سائکل کو چلانے میں دقت نہ پیش آتی۔ میرے اس کھوج کا میری بیوی کو پتہ نہ تھا۔وہ سمجھتی تھی میں کام کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔وہ صبح صبح اپنے کام کے لئے نکل پڑتی اور سورج ڈوبنے سے پہلے لوٹ آتی۔ ان دنوں اس کے اندر چڑ چڑا پن آ گیا تھا کیونکہ میری کمائی سے جو بوجھ اس پر سے عارضی طور پر ہٹ گیا تھا وہ پھر سے لوٹ آیا تھا۔ دن کا کھانا میں نے چھوڑ دیا تھا۔ اپنی بیوی کو معاشی طور پر مدد دینے لئے میں نے یہ طریقہ ڈھونڈ نکالا تھا۔ اپنے شکم کے مطالبات کو نظر انداز کرنا کوئی معمولی کام نہ تھا۔ مگر دھیرے دھیرے میں اس کا عادی ہو گیا اور اب تو مجھے دن کے وقت سرے سے کوئی

بھوک نہ لگتی۔اب مجھے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ ٹرائی سائکل پر بیٹھنے والے زیادہ تر لوگ کیوں بھکاری کا پیشہ اپنا لیتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ انھیں بیٹھے بیٹھے بھیک مل جاتی ہے بلکہ بھیک دینے والے کو بھی تشفی رہتی ہے کہ وہ صحیح آدمی کو پیسے دے رہا ہے۔لیکن میں نے بھیک مانگنے سے سختی سے احتراز کیا ہے اس بات سے قطع نظر کہ اب تھوڑے سے ہی پیسے میرے پاس بچے ہیں۔شاید اس لئے کہ اب میرا سارا خرچہ صرف چائے اور بیڑی تک محدود ہے۔ بیڑی کی یہ لت میرے پچھلے پیشے کی دین ہے۔ مجھے آئینہ ساز کو فون کرنا چاہئے۔ وہ شاید میرے لئے کوئی دوسرا کام ڈھونڈ نکالے۔مگر میں کوئی دوسرا کام کیسے کرسکتا ہوں جب کہ میرے جسم کا ہر عضو میرے خلاف سازش میں مصروف ہے؟ اب تو دن کے وقت بھی میری آنکھوں میں اندھیرا اتر آتا ہے جیسے سورج بھی کوئی بلب ہو جس کی وولٹیج دن بدن کم ہوتی جا رہی ہو۔وہ بانسری والا ہی اب میرے لئے کچھ کرسکتا ہے جس نے وہ خط لکھ کر یہ سارا معاملہ شروع کیا تھا۔ میں نے اس کی تلاش شروع کردی۔ میں نے کھال کے کنارے کے تمام محلے چھان مارے۔ چائے والے نے جس بڑے نالے کا ذکر کیا تھا، اسے میں جانتا تھا، چھپروں کے بیچ یہ گندا نالا سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے جانے کہاں تک چلا گیا تھا۔ایسا لگتا جیسے شہر کے سارے محلے اسی کے دونوں کنارے آباد ہوں۔ویسے ان میں رہنے والے لوگوں کی زندگیاں ایک جیسی تھیں۔صرف بڑی سڑک سے گذرتے وقت تھوڑا بہت کچھ الگ دکھائی دیتا ورنہ پھر وہی کھپریل کے چھپر، تنگ راستے، انسانوں کا ازدہام، لاؤڈ اسپیکروں پر بے وجہ کا شور اور افراتفری۔ آخر کار ان سب چیزوں کے درمیان ایک دن میں نے اسے ڈھونڈ ہی نکالا۔نہیں، شاید یہ کہنا بہتر ہوگا کہ اس نے مجھے ڈھونڈ نکالا۔

سورج مکڑی کے جالے کی طرح دھندلا پڑ چکا تھا یا شاید یہ میری آنکھوں کا قصور تھا۔شہر کے کسی دوسرے حصے میں بارش ہوگئی تھی جس سے ہوا میں خنکی آگئی تھی۔ٹرائی سائکل پر بیٹھے بیٹھے میں نے کانپتی انگلیوں سے سوئٹر نکال کر اسے اپنے بدن پر چڑھا لیا۔یہ سوئٹر اب میں اپنے ساتھ رکھنے لگا تھا۔سوئٹر میں کئی بڑے سوراخ تھے جنھیں اون کے تاگوں سے رفو کرنے کی میں نے بھونڈی کوشش کی تھی۔ میں بڑے نالے کے کنارے ایک جگہ سے گذر رہا تھا جہاں بے وجہ کھڑے رہنے والوں کی بھیڑ تھی جب اس کے گندے پانی میں مجھے ایک مرے ہوئے جانور کا ہیولا کھائی دیا جسے کووں نے ڈھک رکھا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ کون سا جانور ہو سکتا ہے جسے لوگ یہاں

ڈال گئے ہیں کہ مجھے بانسری کی آواز سنائی دی اور میرے کان کھڑے ہو گئے۔

یہ آواز آس پاس کے کسی چھپر سے آ رہی تھی۔ میں اپنی ٹرائی سائکل پر اس چھپر کی تلاش میں گھومنے لگا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں اس کی نشاندہی کر پاتا بانسری کی آواز رک گئی۔ ایک بونا شخص، جس کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا، ایک بند دکان کے تھڑے پر بیٹھا دیر سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اشارے سے مجھے قریب بلایا۔ تمہیں امید علی کی تلاش ہے؟ تمہیں کیسے پتہ؟ تم بار بار کان پر ہات رکھ کر بانسری کی آواز کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے، تمہیں اسی کی تلاش ہے نا؟ ہاں، میں اسی کا گھر ڈھونڈ رہا ہوں۔ وہ سامنے کی گلی دیکھ رہے ہو، وہ جس کے دہانے پر گنے کا رس نکالنے والے کی گاڑی کھڑی ہے، امید علی کا گھر تمہیں اس گلی کے اندر مل جائگا۔ اندر داخل ہوتے ہی داہنی طرف تین دروازہ چھوڑ کر ان کا ٹن کا دروازہ ہے۔

گلی بالکل تنگ تھی جس میں داخل ہونے کے بعد ٹرائی سائکل کو موڑنا شاید ناممکن تھا۔ مگر میں نتیجہ کی پرواہ کئے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ مخصوص دروازے پر پہنچ کر میں نے دستک کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ میرے سامنے جڑی ہوئی بھوؤں والا لڑکا کھڑا تھا۔

میں تمہیں یاد ہوں؟ میں نے کہا۔ اندر آ جایئے۔ لڑکا دروازے سے ہٹ گیا۔ اس نے اندر سے ایک پلاسٹک کا اسٹول اٹھالایا اور اسے چوکھٹ کے اندر رکھ دیا۔ میں اپنی ٹرائی سائکل سے اٹھا اور لڑکے کی مدد سے اس اسٹول پر بیٹھ گیا۔ سہارے کے لئے میں نے چوکھٹ کو تھام رکھا تھا۔ باہر کی روشنی کے سبب اندر مجھے گھپ اندھیرا نظر آیا۔ پھر دھیرے دھیرے اندھیرا کم ہونے لگا اور میری آنکھیں چیزوں کو دیکھنے کے قابل ہو گئیں۔ دیوار سے لگے تختہ پوش پر ایک شخص بیٹھا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ گھنے بالوں اور اتنی ہی گھنی داڑھی کے سبب اس کے چہرے کا صرف اوپری حصہ نظر آ رہا تھا جس میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کے دونوں بازو کندھوں سے کٹے ہوئے تھے۔ اس کی ٹانگیں سامنے کی طرف پھیلی ہوئی تھیں جن پر پاجامے کے پائچوں کو گھٹنوں کے اوپر سمیٹ کر ایک عورت تیل کی مالش کر رہی تھی۔ کونے میں ایک جوان لڑکی زمین پر بیٹھی ریکسن کی پٹیوں میں ایک زیرو پاور کے بلب کی روشنی کی مدد سے پلاسٹک کے موتی پرو رہی تھی۔ دیوار پر جگہ جگہ کیلوں سے کپڑے لٹک رہے تھے جو بساند مار رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ کپڑے نہ ہوں، انسانی ہیولے ہوں جو دیوار سے لگ کر ہماری بات سن رہے ہوں۔ بانسریوں

سے بھری ہوئی کئی تھیلیاں، جن سے مختلف جسامت کی بانسریاں تنکوں کی طرح باہر نکلی ہوئی تھیں، چھپر کے کنڈے سے لٹک رہی تھیں۔ چھپر میں ایک جگہ کھپریل کے کھسک جانے کے سبب باہر کی سفید روشنی کسی سیال مادے کی طرح اندر گر رہی تھی۔

میرے لڑکے نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا، مگر یہ تو کئی ماہ قبل کا واقعہ ہے، بغیر بازو والے آدمی نے سر ہلا کر عورت کو مالش بند کرنے کا اشارا کیا۔ عورت نے اس کے پائچوں کو کھینچ کر ٹخنوں کے برابر کر دیا اور تیل کا کٹورا اٹھا کر باورچی خانے کے اندر چلی گئی۔ شانوں پر گرے ہوئے گھنے گیسوؤں اور مچھلی کی دم نما داڑھی کے سبب تختہ پوش پر بیٹھا ہوا آدمی قدرت کا ایک شاہکار نظر آ رہا تھا ایک ایسا شاہکار جیسے قدرت بازو دینا بھول گئی ہو۔ وہ رقیق آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟ تم ہی امید علی ہو؟ ہاں۔ تو تم ہی نے وہ خط لکھ کر پیشن گوئی کی تھی کہ میں ایک ماہ کے اندر اندر مرنے والا ہوں؟ میرے تو دونوں ہات کٹے ہوئے ہیں، اس نے جواب دیا۔ میں کوئی خط کیسے لکھ سکتا ہوں؟ میں وہ خط دیکھ سکتا ہوں؟ میرے گھر چوری ہوئی تھی۔ وہ جس ٹرنک میں رکھا تھا چور اسے اٹھا کر لے گئے۔ تم نے ہی وہ خط لکھا تھا؟

کوئی جواب دینے کی بجائے وہ سامنے دیوار پر نظریں ٹکائے بیٹھا رہا۔

یہ کتنے دنوں پہلے کی بات ہے؟ ایک مختصر سی خاموشی کے بعد اس نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ تقریباً دس مہینے گذر چکے ہوں گے۔ مگر آپ تو زندہ ہیں۔ اس خط کے ایک ہفتہ کے اندر اندر میں ایک حادثے کا شکار ہو گیا اور میری کمر سے نیچے کا حصہ مفلوج ہو گیا۔ مگر اس خط میں تو موت کی بات لکھی تھی اور آپ زندہ ہیں۔ اسے بھول جاؤ، مجھے بتاؤ، وہ خط تم نے لکھا تھا؟ دیکھئے، آپ کو کسی طرح کا مغالطہ ہوا ہے، اس نے میری طرف دیکھا۔ خدا کا شکر ادا کیجئے کہ آپ زندہ ہیں، اس نے سر سے اپنے دونوں کٹے ہوئے بازوؤں کی طرف اشارا کیا۔ مجھے دیکھئے اب میں اس لائق بھی نہیں کہ اپنی گندگی صاف کر سکوں۔ تمہارے ساتھ بھی کوئی حادثہ پیش آیا تھا؟ میں نے ایک آدمی سے جھوٹ بولا تھا۔ اس نے مجھے یہ سزا دی۔ جھوٹ کی اتنی بڑی سزا؟ وہ جھوٹ یقیناً بہت بڑا ہوگا، میں اپنے تمسخر کو چھپا نہ سکا۔ یقین کرو، ڈرگس کے دھندے میں یہ عام بات ہے۔ میں نے زندگی میں بہت سارے برے کام کئے ہیں۔ اس کا کچھ نہ کچھ تو انجام نکلنا تھا۔

میں نے اس کے کمرے کا جائزہ لیا۔ تم اتنے برے نہیں ہو سکتے۔ اگر برے ہوتے تو

تمہارے گھر میں خوشحالی ہوتی۔ بغیر بازو والے آدمی نے اپنا سر سینے پر کافی نیچے جھکا لیا جس کے سبب اس کے کندھے کا اوپری حصہ گھنے بالوں کا ڈھیر نظر آنے لگا۔ میں گھر کے لوگوں کے لئے بھی برا تھا، اس کی اشک آلود آواز آئی ابّو!' لڑکے نے مداخلت کی اور وہ خاموش ہو گیا۔

اس خط کے لکھنے کا مقصد کیا تھا؟ میں نے آخری بار پوچھا۔

آپ کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے؟ ابو کے ہات ایک سال پہلے ہی کاٹے جا چکے ہیں، لڑکے نے اونچی آواز سے کہا۔ اسے مجھ پر غصہ آ گیا تھا۔ میں چپ بیٹھا رہا۔ شاید وہ بھی جھوٹ بول رہا تھا۔ شاید وہ اپنے باپ کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ میرے پاس کوئی ثبوت نہ تھا، اس کے دونوں ہات کٹے ہوئے تھے اور میں وہ خط کھو چکا تھا۔

میں جب گلی سے باہر آیا تو نالے کے کنارے بے وجہ کھڑے رہنے والوں کی بھیڑ میں ایک غبارے والے کا اضافہ ہو گیا تھا جس کے غباروں کا رنگ ضرورت سے زیادہ گہرا نظر آرہا تھا۔ دکان کے تھڑے پر بیٹھا بونا اپنی جگہ سے غائب تھا۔ ایک ایسے آسمان کے نیچے، جس کا سورج میرے ساتھ مر چکا تھا، اپنی ٹرائی سائکل کے پیڈل گھماتے ہوئے میں سوچ رہا تھا، میں اس دنیا میں واحد بدنصیب انسان نہیں ہوں۔ اس خط نے جو پیشن گوئی کی تھی وہ درست ثابت ہوئی تھی۔ موت کو ہم جن معنوں میں جانتے ہیں، ان سے باہر بھی موت کی کئی شکلیں ہیں، ایسی موت جنھیں جینے والوں کی اچھی خاصی تعداد اس آسمان کے نیچے موجود ہے۔

☆☆

چوردمسکو

چوردمسکو سورج نکلنے سے پہلے گھر لوٹ آیا تھا۔ اس کی رات بیکار گئی تھی۔ اس شہر کو ہو کیا گیا ہے کہ یہ دن بدن لوہے کے پیچھے چھپتا جا رہا ہے؟ اور پولس کو ہرنا کے پر وہی کیوں مل جاتا ہے؟

'تم وہی ہونا، چوردمسکو جس کا اپنا گھر بار نہیں ہے؟' ڈیوٹی کا نسٹبل دیودت اسے ہمیشہ اندھیرے میں پہچان جاتا۔ 'یہ ہم پولس والوں کا خاص تکیہ کلام ہے۔ ہم چور کے بارے میں ایسا اس لئے کہتے ہیں کیونکہ اگر اس کا گھر ہوتا تو وہ رات رات بھر سڑکیں کیوں ناپتا؟'

وہ دیودت کے ساتھ ایک سگریٹ پیتا اور اسے یقین دلاتا کہ وہ کبھی اس کے ہاتھ آنے والا نہیں۔ 'جو تمہارے لئے اچھا ہے،' دیودت ہنستا۔ 'کیونکہ اگر تم پکڑے گئے تو لڑکے میں تمہاری ایسی مشکیں کسوں گا کہ اندر کی سانس اندر ہی رہ جائے گی۔'

یہ دیودت ایک بڑا شگن تھا۔ وہ کوشش کرتا کہ کبھی ان کا سامنا نہ ہو، مگر ہر دوسرے ہفتے کسی نہ کسی ناکے یا چوراہے پر دونوں کی ملاقات ہو جاتی۔ 'اور میں یہی بات تم پولس والوں کے بارے میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ تم لوگوں کا کوئی گھر نہیں ہوتا،' وہ دیودت پر کبھی کبھار اپنا غصہ اتارتا۔ 'اس معاملے میں تم ہم چوروں سے بھی بدتر ہو۔'

'گھر کی کسے ضرورت ہے؟' دیودت جواب دیتا جس کی زیادہ تر راتیں طوائفوں کے بستر پر گذرتیں۔ رات جتنی گہری ہوتی وہ اتنا گہرے نشے میں ہوتا۔ کسی وجہ سے اسے چوردمسکو پسند تھا۔ وہ اسے دور سے پہچان جاتا اور چوردمسکو کے لئے بھاگ کھڑا ہونا ناممکن ہو جاتا۔ پھر تو نہ صرف یہ کہ اس کا بہت سارا وقت دیودت کے ساتھ برباد ہوتا بلکہ سارے علاقے کو اس کی موجودگی کا علم ہو جاتا اور لوگ اپنے گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے ٹھیک طرح سے بند کر لیتے۔

اس دن دمسکو نے جب اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اس کی بیوی نے نیند سے بوجھل آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ 'کیا تم تھوڑی دیر بعد نہیں لوٹ سکتے تھے؟ اور خدا کے لئے مجھے دیودت کی کہانی نہ سنانا۔'

'تم اب بھی سو رہی ہو میری گوریا جب کہ چڑیاں چہچہا کر چپ بھی ہو چکیں۔' دمسکو بستر پر بیٹھ کر اپنی بیوی کے سڈول کولھے سہلاتا جو اسے خاص طور پر پسند تھے۔ 'اور میں کیا کر سکتا ہوں اگر کارخانے سے نکلنے میں مجھے دیر ہو جاتی ہے۔ تو یہ صرف اس نانجار دیودت کے سبب ہے۔ لیکن تم چاہو تو میں دوسرا بہانہ بھی بنا سکتا ہوں۔'

ایسا نہیں تھا کہ اس کی بیوی کو اس کے پیشے کا علم نہ تھا۔ مگر اس جھوٹ سے دونوں کو سہولت ہوتی تھی۔ اور پھر پاس پڑوس میں اسے لوگوں کا سامنا بھی تو کرنا پڑتا تھا۔ مگر کہیں نہ کہیں اس کے اندر ایک چور چھپا بیٹھا تھا جو اسے بتایا کرتا کہ سارے محلے کو اس کے شوہر کی بری عادت کا پتہ ہے۔

چارپائی پر گرتے ہی دمسکو گہری نیند سو جاتا۔ مگر پھر اس کے خراٹے کے سبب اس کی بیوی کو نیند نہ آتی۔ اس دن وہ دوپہر ایک بجے تک سویا کیا یہاں تک کہ مکھیاں بھی اس کے چہرے پر بھنبھناتے ہوئے تنگ آ گئیں۔ اس کی دونوں لڑکیاں اسکول سے آ چکی تھیں اور باورچی خانے میں کھٹر پٹر کر رہی تھیں۔ اپنی بیوی کو گھر میں نہ پا کر دمسکو نے اندازہ لگایا کہ وہ گیہوں پسوانے چکی پر گئی ہوگی۔ اس کی دونوں بیٹیاں دس برس کی ہو چکی تھیں مگر بڑی جو اپنی چھوٹی بہن سے بیس منٹ پہلے پیدا ہوئی تھی اسے دمسکو نے اپنے گھٹنوں پر بٹھا کر کہا: 'تم پڑھائی میں کافی تیز ہو۔ اور یہ ایک لڑکی کے لئے اچھی بات نہیں۔ تمہیں کون سی ناک پر عینک چڑھانی ہے!' جب کہ حقیقت یہ تھی کہ چھوٹی زیادہ تیز دماغ رکھتی تھی۔ اسے تو یہ تک پتہ تھا کہ اس کا باپ رات رات بھر غائب رہ کر کیا کارنامہ انجام دیتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ دمسکو اپنی چھوٹی بیٹی سے آنکھیں ملا نہ پاتا۔ 'خاتون، کیا تم میرے لئے ایک کپ چائے بنا سکتی ہو؟' وہ اس سے کہتا۔ 'تم تو بس اسی کے لئے ٹھیک ہو، اماں کی بیٹی۔'

//////

ریس کورس سے ملحق ایک میگزین گھر کا کھنڈر واقع تھا جسے مقامی لوگ بارود گھر

کے نام سے بلایا کرتے۔ اس بارود گھر کے دونوں ٹاور پر چیلوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے اور اس کی چار دیواری کو مقامی لوگوں نے چھوٹا راستہ نکالنے کے لئے کئی جگہ پر توڑ ڈالی تھی۔ چار دیواری سے لگا ہوا بارود گھر کا اپنا تالاب تھا جو اب کائی اور پلاسٹک کے کچڑوں سے ڈھک چکا تھا۔ اس تالاب کے دوسرے کنارے مسلمانوں کی بستی تھی۔ اس بستی میں ان لوگوں کا دو کمروں والا گھر اور بڑا سا آنگن تھا جس میں کھپریل کے چھپر کی ورکشاپ تھی جس کے برامدے پر کبھی کوئلے کی بھٹی پر گھوڑوں کے لئے نعلیں نرم کی جاتی تھیں۔ یہ ورکشاپ اور آنگن، جہاں کبھی گھوڑے ہنہنایا کرتے تھے، اسے اپنے باپ کی یاد دلاتے جو شہر کا سب سے ماہر نعل بند تھا۔ بوڑھے کو افیم کی لت تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب افیون قانونی طور پر کھلے بازار میں ملا کرتی۔ مگر پچھلے کئی برسوں سے افیم کی محرومی نے اس کے دماغ کی چولیں ہلا دی تھیں۔ جس کا یہ نتیجہ نکلا تھا کہ کچھ دنوں سے وہ رہ رہ کر اچانک خود کو بنجاروں کی نسل سے سمجھنے لگا تھا۔ بوڑھے کے سر پر ایک بڑا سا گومڑ تھا جیسے اس کے سر پر ایک دوسرا سر ابھرتے ابھرتے رہ گیا ہو۔

'دمسکو، میرے بیٹے، میں اس گومڑ کے ساتھ پیدا ہوا۔ یہی میری نشانی ہے اور تمہیں اسی کے ساتھ مجھے برداشت کرنا ہوگا۔ لیکن تم یہ نہیں بھول سکتے کہ یہاں سے پچھم کی طرف ایک شاندار ملک ہے دمشق جس کے نام پر تمہارا نام رکھا گیا تھا جسے لوگوں نے بگاڑنے میں دیر نہیں لگائی کیونکہ ہم بنجاروں کو اور آتا بھی کیا ہے۔ اور یاد رکھو اس گھر کی چار دیواری کے باہر دنیا کسی بھوکے شیر کے مانند منہ پھاڑے تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔ تمہارے لئے بہتر ہے کہ تم جلد گھر لوٹ آؤ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ تم تیز بھاگو۔ ہم بنجاروں نے جب بھٹکنا بند کر دیا تو آسمان کو یہ پسند نہیں آیا۔ اب دیکھو ہم لوگ کتنی بدحالی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ ان دنوں زمین خدا کی تھی، جہاں چاہے ڈیرا ڈال لو، جہاں چاہے سبزی اگا لو، جتنا چاہو پرندوں کا شکار کر لو، جانوروں کے لئے تو چراگاہیں بھری پڑی تھیں۔ ایسا کون سا پانی کا گڈھا تھا جس میں مچھلیاں نہ تیر رہی ہوں۔ بس جال پھیلاؤ یا بنسی ڈالو اور موج کرو، مگر تمہارے دادا نے جانے کیا سوچ کر اس جگہ رہنا قبول کیا۔ اس نے زمیندار سے جس کا اپنا گھوڑے کا اصطبل تھا، یہ زمین ٹھیکے پر لے کر اپنی ورکشاپ بنائی جس کی باقی بچی ہوئی زمین پر میں نے بعد میں یہ دو کمرے تعمیر کروائے۔ مگر اب زمین کی قیمت آسمان کو چھونے لگی ہے، زمیندار کا اصطبل بک چکا ہے، اس پر

ایک کافی اونچی عمارت بن چکی ہے۔ جس کی کابکوں میں لوگ رہنے لگے ہیں، تمہارے دادا زمین کے سارے کاغذات لے کر دوسری دنیا میں جا چکے ہیں، ہمارے پاس صرف یہی گھر اور ورکشاپ بچے ہیں اور میں ایک ہارے ہوئے انسان کی طرح دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں۔'

دمسکو کو اپنے باپ کی موت کا پورا واقعہ یاد تھا اور اکثر وہ حیرانی سے سوچا کرتا کیا اس طرح مرنا بھی کسی کو زیب دیتا ہے؟ دراصل اچانک ملک میں افیون غیر قانونی قرار دئے جانے کے بعد بازار سے افیم غائب ہو چکی تھی۔ اس واقعے نے اس کے باپ سے گویا اس کی دنیا چھین لی۔ وہ اپنی چارپائی پر بیٹھا لاچاری سے اس کی طرف دیکھا کرتا۔ افیم کے نہ ملنے سے وہ دن بدن کاہل اور سست ہوتا جارہا تھا۔ آخر کار اس نے اپنا کارخانہ بند کر دیا اور اس کا آنگن جہاں سائیس گھوڑوں کے نعل لگوانے آتے تھے سنسان ہو گیا۔ اس نے دمسکو کو نعل لگانے کا ہنر سکھا تو دیا تھا مگر دمسکو کو نعل بندی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی ساری دلچسپی صرف دھونکنی تک محدود تھی۔ جس کی زنجیر سے لٹکتا ہوا وہ بڑا ہوا تھا۔ حد اس وقت ہو گئی جب ایک دن اس نے ایک نعل کو جو پوری طرح سے ٹھنڈی نہ ہو پائی تھی سندان سے ننگے ہات اٹھالیا۔ یہ اس کے لئے آخری کیل ثابت ہوئی۔ اس دن اس کے باپ نے فیصلہ کیا کہ وہ دمسکو کا کچھ نہیں کر سکتا۔ 'گھوڑے اپنی بدنصیبی اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں،' اس نے دمسکو سے کہا۔ 'کوئی ان پر بوجھ نہیں ڈالتا۔ تمہیں پتہ ہے جب گھوڑا بیمار پڑ جاتا ہے یا اپاہج ہو جاتا ہے تو اس کا کیا کرتے ہیں؟ اسے گولی مار دیتے ہیں تاکہ وہ تکلیف سے نجات پا سکے۔ مگر ہم یہ کام انسانوں کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ کیوں؟ کیونکہ اگر ایسا کیا جائے تو دنیا کی آدھی آبادی ختم ہو جائے گی جو ناکارہ لوگوں سے بھری پڑی ہے جو پیٹ پر ہات دھر کر بیٹھے رہتے ہیں اور اللہ کے نام پر دوسروں کی کمائی ہوئی دولت پر جیتے ہیں۔ تو تم نے سوچا ہے، آگے تمہارا کیا کرنے کا ارادہ ہے، میرے بدنصیب گھوڑے؟'

'میں...' دمسکو نے اپنی داہنی آنکھ چھوٹی کر کے آسمان کی طرف دیکھا جو شیشے کی طرح تمتما رہا تھا جیسے وہ بھی بوڑھے کے غصے کا شریک ہو۔ وہ اٹھارہ برس کا ہو چکا تھا اور گرچہ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی مگر وہ جان چکا تھا کہ اس طرح کے سوالات اس سے کئے جا سکتے تھے۔ '... میں کوئی آسان کام ڈھونڈ لوں گا۔ اس آسمان کے نیچے کچھ تو ہوگا میرے لئے!'

'میں دعا کروں گا کہ تمہیں تمہارا آسان کام مل جائے گرچہ میں تمہیں بتانا چاہوں گا کہ

اس دنیا میں آسان کام سے زیادہ مشکل کام کچھ نہیں ہوتا۔'

اور دمسکو کو اس کا آسان کام مل گیا۔ اس کام پر اسے اس کے دوست پھلندر نے لگایا تھا جس کی بہن خوشبو کماری کے کسے ہوئے بدن کی مہک ہر دوسرے دن اسے کھینچ کر پھلندر کا گھر لے جاتی جو ندی کے کنارے واقع تھا۔ ندی کے مٹیالے پانی میں ناؤ اور بجروں کے ساتھ ساتھ سارے ملک کے بول و براز بہہ کر آیا کرتے۔ اس کے کنارے کنکریٹ کی سڑک پر جہاں ٹرکوں سے ریت اور بجری اتاری جاتیں اسوستوس کی چھتوں اور اینٹ کی بدنما دیواروں والے ایک جیسے مکانوں کی قطار تھی جنھیں دوسری جنگِ عظیم کے دوران برٹش آرمی نے ہندوستانی سپاہیوں کو برما کے محاذ پر بھیجنے سے پہلے عارضی پڑاؤ کے طور پر بنوایا تھا مگر اب یہ سارے گھر مقامی لوگوں کے غیر قانونی قبضے میں جا چکے تھے جہاں ہر آٹھ دس گھر کے بعد ایک مندر کی بنیاد پڑ چکی تھی جو اور کچھ نہیں گھاٹ پروہت کی آمدن کا ایک ذریعہ تھا۔ اس ندی پر دھوبیوں کے کئی سلسلہ وار گھاٹ تھے جن کے صحن پر گدھے بڑی تعداد میں کان جوڑے کھڑے رہتے اور پسوؤں کو بھگانے کے لئے اپنی دم ہلایا کرتے۔ پھلندر کا باپ اپنے گھاٹ کا سب سے پرانا دھوبی تھا۔ پھلندر کے ڈھیر سارے بھائی بہن تھے۔ خوشبو کماری سب سے بڑی تھی جس کی بھاری بھرکم چھاتیوں کو دیکھ کر دمسکو کی سانس اٹکنے لگتی۔ خوشبو کو اس بات کا پتہ تھا۔ مگر جو بات وہ نہیں جانتی تھی وہ یہ تھی کہ دمسکو اب اپنے تصور میں اس کے کپڑے اتارنے کا عادی ہو گیا تھا۔ ایک دن اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ اس کے ننگے پستانوں پر پھسل رہا ہے۔ نیند ٹوٹنے پر اسے پتہ چلا کہ اس نے اپنا بستر گیلا کر لیا تھا جس پر وہ پھسل رہا تھا۔ اس کا دوست کسی لومڑی کی طرح چالاک تھا۔ اس نے پہلی نظر میں ہی بھانپ لیا تھا کہ دمسکو اب اس کے لئے نہیں آتا۔

'تم دونوں کے بیچ کیا پک رہا ہے؟' ایک دن اس نے دمسکو سے کہا۔ دونوں ندی کی ڈھال پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے اور پانی پر بچھے ہوئے پتوں سے نکلے ہوئے کنول کے گلابی پھولوں پر پتھر سے نشانہ لگا رہے تھے۔ کنارے کی زمین پر ایک از کار رفتہ ناؤ الٹی پڑی تھی جس پر بنگلہ دیش کی بنی چرکٹ لنگیاں اور دھاری دار انڈر ویئر سوکھ رہے تھے۔ 'کتوے، تم آگ سے کھیل رہے ہو۔ تم میرے باپ کو نہیں جانتے۔ اسے پتہ چل گیا تو وہ اسے ہندو مسلم فساد میں بدل دے گا۔'

'تمہارے باپ کو اس معاملے سے کیا لینا؟' دمسکو نے چہرا بناتے ہوئے کہا۔ 'کیا اس

کے لئے کافی نہیں کہ تمہاری ماں کی کھال ادھیڑتا رہے؟'

'تم میرے باپ کے سلسلے میں اس طرح کی بات نہیں کر سکتے۔'

پھر اس کے دوست نے اسے مشورہ دیا کہ پہلے وہ کچھ کمانا سیکھ لے۔ 'تم میرے ساتھ دھندے سے لگ جاؤ۔ میں نے ایک منصوبہ بنایا ہے۔ ٹرام ڈپو کے پچھواڑے مردہ گھر کے راستے پر ایک سنسان گلی ہے جہاں بہت کم لوگ جاتے ہیں۔ مجھے وہاں ایک گھر کے بارے میں پتہ چلا ہے جس میں ایک بہت ہی بوڑھا بنگالی جوڑا رہتا ہے جو بالکل اندھے ہو چکے ہیں۔ تمہیں تو پتہ ہے یہ بنگالی بچے پیدا کرنے سے کتنا ڈرتے ہیں۔ تو اس کی ایک ہی بیٹی ہے۔ پہلے وہ اپنی بیٹی کے گھر جایا کرتے تھے جب تک بوڑھے کی آنکھ سلامت تھی۔ مگر اب وہ وہاں بھی نہیں جا پاتے۔ کیا تم میرا ساتھ دو گے؟ مجھے ایک آدمی کی ضرورت ہے جو تمہاری طرح تیز اور بہادر ہو۔'

'تم مجھے کسی مصیبت میں تو نہیں ڈال رہے ہو نا؟'

'تو میں کہوں گا کہ جتنی جلد ہو سکے مصیبت میں پڑنا سیکھ لو۔ تمہاری دنیا بدل جائے گی۔ زندگی میں کامیاب ہونے کے لئے اس سے بہتر نسخہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔'

تو دوسرے دن دونوں نے مل کر اس سنسان گھر کی ایک عقبی کھڑکی توڑ ڈالی۔ دونوں نے بوڑھا بڑھیا کی آنکھوں کے سامنے ہی گھر کا صفایہ کیا تھا مگر انھیں پتہ تک نہ چلا۔ یہ وہ شروعات تھی جس سے دسکو پھر کبھی ابھر نہ پایا۔ دونوں کی ساجھے داری کافی کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ دسکو کے پاس آسان پیسہ آ گیا تھا جسے وہ دل کھول کر خوشبو کماری پر خرچ کر سکتا تھا۔ خود خوشبو کے لئے اب یہ ناممکن ہو گیا تھا کہ گھر والوں کی نظروں میں دھول جھونک کر اس کے ساتھ مٹر گشتی سے باز آئے۔ دسکو نے ایک سنسان گھر کے اندر، جس کی بغیر کواڑ والی کھڑکی کے چارچوب فریم میں ہمیشہ ایک گدھے کے کان اور تمسخر سے مسکراتے ہوئے دانت دکھائی دیتے، بہت ہی پھوہڑپن کے ساتھ خوشبو کے ساتھ جسمانی تعلق قائم کرنے کی کوشش کی۔ خوشبو پورے وقت ہنستی رہی۔

'رہنے دو، یہ تم سے نہیں ہو سکتا۔' وہ رہ رہ کر اس کی ننگی پیٹھ میں اپنے تیز ناخن چبھو رہی تھی۔ 'اتنی دیر سے تم کوشش کر رہے ہو اور تمہیں یہ تک نہیں پتہ کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ تم ڈرے ہوئے ہو۔ رہنے دو یہ تم سے نہیں ہو سکتا۔'

اس نے خوشبو کے ساتھ اور بھی کئی بار کوشش کی مگر ہر بار انجام ایک ہی نکلا۔ آخر کار اس نے اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔ اب جب کبھی دونوں کا سامنا ہوتا خوشبو اپنی دونوں کلائیوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر اس کی دی ہوئی کانچ کی قیمتی چوڑیاں کھنکھناتیں۔ 'دمسکو، کچھ یاد آرہا ہے۔' اور ایسا کہتے وقت اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی مستی امنڈ آتی۔ 'ایسی کوئی چیز جس میں تم ماہر ہو؟'

دمسکو اس سے کترانے کی کوشش کرتا مگر وہ کسی نہ کسی بہانے اسے گھیر لیتی۔ پھلندر کو اپنی بہن کے پاگل پن کے بارے میں پتہ تھا۔ 'جانے تم نے اسے کیا پڑھا ہوا پانی پلایا ہے۔' اس نے ایک دن شراب کی میز پر گھونسا مارتے ہوئے دمسکو سے کہا۔ 'تمہیں پتہ ہونا چاہئے کہ خوشبو کی شادی طئے کردی گئی ہے۔ لڑکے کا چہرا تھوڑا سا جلا ہوا ہے۔ وہ کافی کماؤ ہے۔ گودی میں اس کا اپنا غیر قانونی شراب کا دھندا ہے اور لاٹری کا کاروبار بھی ہے۔ پولس والوں سے اس کی اچھی دوستی ہے۔ لوگ کہتے ہیں وہ پیدائشی بزنس مین ہے۔'

'پھر تو اسے جلد سے جلد سسرال چلا جانا چاہئے۔ وہ وہاں خوش رہے گی۔ اور پھر یہی تو بچے پیدا کرنے کی عمر ہے۔'

'کیا لڑکیاں اس لئے سسرال جاتی ہیں کہ وہ خوش رہیں؟' اس کا دوست ہنسا۔ 'تمہیں ابھی سے نشہ چڑھ رہا ہے۔ تمہیں علم نہیں، اس کا چہرا پہلی جورو کو بچانے کی کوشش میں جل گیا تھا جس نے اپنے اوپر کراسین تیل چھڑک کر آگ لگالی تھی۔'

'میں سوچ رہا ہوں، میں کوئی دوسرا دھندا کیوں نہ شروع کرلوں۔' دمسکو نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

'دوسرا دھندا؟ دمسکو تم اتنے سنکی کب سے ہو گئے؟' پھلندر ہنسا۔ 'تم گھوڑوں کے کھر کترنے یا نعل لگانے سے تو رہے۔ اور وہ تمہارا افیمچی باپ! اس نے تم لوگوں کو اس گھر کے علاوہ دیا ہی کیا ہے۔ جس کا آنگن ہر برسات بارود گھر کے گندے پانی میں ڈوب جاتا ہے؟'

'تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔' دمسکو نے سر جھکا لیا۔ اسے اس کا دکھ تھا کہ طرح طرح کی بیماریوں سے گھرے ہونے کے باوجود اس کا باپ مرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ شاید یہ برسوں کی افیم خوری کا نتیجہ تھا کہ وہ اب بھی ایک پرشکم اور ہٹا کٹا انسان تھا۔ صرف اس کے زیادہ تر دانت

گر چکے تھے اور چہرے پر ایک عجیب سی جھاڑ جھنکار داڑھی اگ آئی تھی جو اس کے منگول چہرے کو اور بھی منگول بناتی تھی۔ 'میں نے اور کچھ درجے پڑھ لیے ہوتے تو ممکن تھا مجھے کوئی ڈھنگ کا کام مل جاتا۔ شاید میں پوسٹ مین کی نوکری کر لیتا اور سائکل پر گھوما کرتا یا چنگی پر بیٹھ کر رسید کاٹا کرتا۔ اب تو اینٹ ڈھونے کے علاوہ میں کچھ نہیں کر سکتا جو مجھ سے نہ ہوگا۔'

'یہی تو میں تمہیں بتانے کی کوشش کر رہا ہوں۔' اس کا دوست ہنسا۔ 'یہ کام اتنا برا نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ اور اگر تم پکڑے گئے تو پولس سے تمہاری دوستی پکی۔ پھر تو تمہارا کوئی بال بھی بانکا نہیں کر سکتا۔ صرف گاہے بگاہے ان بہن چودوں کی مٹھی گرم کرتے رہنا۔'

اس کا دوست کئی بار جیل جا چکا تھا مگر دمسکو کی بدنصیبی تھی کہ وہ کبھی جیل نہیں گیا۔ شاید اس لئے کہ وہ اپنے دوست سے پانچ برس چھوٹا تھا اور شاید اس لئے بھی کہ وہ بھاگنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اس کا دوست کئی مہینے بعد جیل سے رہا ہو کر آیا تھا جب دمسکو سے اس کی دوبارا ملاقات ہوئی۔ اسے پتہ چلا خوشبو کا بیاہ ہو چکا تھا اور خود اس کا دوست شادی کرنے والا تھا مگر اس کے باپ کو اس کے لئے لڑکی ڈھونڈنے میں دقت ہو رہی تھی کیونکہ ایک چور کی حیثیت سے اس کی شہرت کافی دور تک پھیل گئی تھی۔

'کیا شادی کرنا ضروری ہے؟' دمسکو نے پوچھا۔

'بالکل۔ ذرا سوچو، پیشہ کرنے والیوں پر پیسہ لٹانے سے تو یہ بہتر ہے۔'' پھلندر نے کہا۔ 'تم اپنی بیوی کے ساتھ جب چاہے اور جب تک چاہے سو سکتے ہو اور اس کی پٹائی بھی کر سکتے ہو۔ اس سے بہتر انتظام اور کیا ہو سکتا ہے؟'

'شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'

مگر اس کے اینچی باپ کی رائے دوسری تھی۔ اس نے دبے لفظوں میں اپنے باپ کے سامنے شادی کا ذکر کیا تو وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔ 'اسے کھلاؤ گے کیا؟ کوئی ڈھنگ کا کام بھی ہے تمہارے پاس؟ رات رات بھر جانے کہاں مارے مارے پھرتے ہو۔ اور اس چور پھلندر سے تو دور ہی رہو تو بہتر ہے۔ مجھے تو وہ انسان سے زیادہ لومڑی نظر آتا ہے۔ ایسی بھینگی آنکھیں میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھیں۔ ایسے آدمی کو تو گھوڑے کا چشمہ پہنانا چاہیے۔'

'اگر آپ نے میری شادی نہیں کی تو میں دریا میں کود کر جان دے دوں گا۔'

'جسے دیکھو دریا میں کود کر جان دے رہا ہے۔ دریا ویسے ہی بہت گندا ہو چکا ہے۔' اس کا اینچی باپ ہنسا۔' اس پر تو رحم کھاؤ۔'

مگر اس کی دھمکی کام کر گئی تھی۔ اس کے باپ نے گاؤں میں اپنے رشتے داروں کو پیغام بھجوایا۔ کئی جان پہچان والوں سے بات کی، مولیوں اور مشاطاؤں سے رابطہ قائم کیا اور محلے کے حجام ٹیپو میاں کی خدمات بھی حاصل کیں جو فلمی دھن پر حمد و نعت پڑھنے میں نہ صرف اچھی خاصی شہرت رکھتا تھا بلکہ قینچی چلاتے چلاتے رشتوں کی اچھی خاصی جانکاری حاصل کر لیا کرتا۔ آخر کار دمسکو کے لئے ایک لڑکی مل ہی گئی جو صرف تیرا برس کی تھی اور چار کلاس پاس تھی۔'' وہ اس لئے...'' اس کے باپ نے جو ریلوے انجن میں خلاصی تھا اور اس وقت بھی جب وہ مہمانوں کی خاطر داری میں مصروف تھا نشے میں ڈول رہا تھا، مہمانوں کو بتایا۔'' ...کیونکہ اسکول میں چار کلاس تک فیل ہونے کا کوئی رواج ہی نہیں ہے۔''

'یاد رکھو،' اس کے اینچی باپ نے کہا۔' تم خود اپنا سر اوکھلی میں ڈال رہے ہو۔ اس کے لئے تم مجھے ذمہ دار ٹھہرا نہیں سکتے۔'

نکاح کے دن دمسکو کافی پریشان نظر آیا۔ اسے اچانک خوشبو کماری کے ساتھ اپنی ناکامی یاد آ گئی تھی۔ اس کا چہرا تاریک پڑتے دیکھ کر اس کا باپ ہنسا۔' یہ پریشانی بالکل صحیح ہے دمسکو۔ ہر آدمی شادی سے پہلے اسی طرح گھبراتا ہے۔ خدا کے بندے تم ایک لڑکی سے شادی کر رہے ہو جو اسی مقصد کے لئے بنائی گئی ہے جو تم سوچ رہے ہو اور اسے اسی ڈھنگ سے انجام تک پہنچانا ہے۔ کیا تم جانور سے بھی کمتر ہو؟ اسے اتنا پیچیدہ مت بناؤ۔ تمہیں کوئی خراب بیماری تو نہیں؟ تو اس کا بھی علاج ہے۔ تم نے شیلا جت کا نام تو سنا ہوگا۔'

تو اس کی شادی ہو گئی اور اس کی سہاگ رات خیر و خوبی کے ساتھ گذر گئی۔ دمسکو اپنی مردانگی پر حیران رہ گیا۔ بعد میں بستر پر خون کے دھبوں کو دیکھ کر اسے یک گونہ مسرت کا احساس ہوا۔ اس کی بیوی کافی کمسن تھی اور ہم بستری کے دوران اس نے کافی افراتفری مچائی تھی جس نے دمسکو کا دل موہ لیا تھا۔ خود دمسکو کے لئے وہ ایک ایسا کھلونا تھی جس کی کنجی اس کے ہات میں تھی اور وہ جس طرح چاہے اس کے ساتھ کھیل سکتا تھا۔ وہ بھرے پرے بدن والی خوشبو نہ تھی جسمانی معاملات میں جس کی اپنی شرطیں ہوں۔ وہ تو وہی کچھ جانتی تھی جو دمسکو اسے سکھا رہا تھا اور ایک

استاد کے طور پر دسکو کے سنکی پن کی کوئی حد نہ تھی۔ دسکو کے دن پھر گئے۔ اس نے پھلندر کے ساتھ مل کر کئی بڑی چوریاں بھی کیں اور اپنی جورو کو سونے کے گہنے لا کر دیئے۔ ان گہنوں کو دیکھ کر اس کا باپ پریشان ہو گیا۔ 'اس گھر میں ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا،' اس نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے غصہ سے کانپتے ہوئے کہا۔ 'تم اپنی عورت کو خراب کر رہے ہو۔ وہ بگڑ جائے گی تو تم اسے سنبھال نہیں پاؤ گے۔'

رات کو اس نے اپنی بیوی سے، جو گہنے پا کر پھولی نہیں سما رہی تھی اور اپنے شوہر کو ہر طرح سے خوش کرنا چاہ رہی تھی، کہا۔ 'شادی سے پہلے تم نے کسی مرد کو دیکھا ہے؟'

'بہت سارے مردوں کو۔' اس کی کمسن بیوی بولی۔ 'وہ جنیو کان پر ڈالے مسواک کرتے ہوئے ریل کی پٹریوں سے گذر کر بمپوتالاب جایا کرتے تھے۔'

'میرا مطلب ہے ایسا کوئی مرد جس سے تمہیں واسطہ پڑا ہو، جس نے تمہیں ہاتھ لگایا ہو۔ تم سمجھ رہی ہو نا میں کیا کہہ رہا ہوں یا اس کے آگے بھی کہنا پڑے گا؟' دسکو سر کے نیچے ہتھیلی رکھ کر بستر پر لیٹا ہوا تھا اور دونوں پپوٹے نصف موند کر معنی خیز نظروں سے اپنی بیوی کی طرف تاک رہا تھا۔

اس کی بیوی کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ شاید اس کے ساتھ کوئی واقعہ گذر چکا تھا۔ اس دن سے دسکو کے اندر اپنی بیوی کے لئے اور بھی کشش بڑھ گئی جس طرح کسی پھل کو پلّو لگ جانا اس بات کا ضامن ہوتا ہے کہ وہ پھل میٹھا ہوگا۔ اب جب کہ وہ بستر پر اپنی جورو کے ساتھ پوری طرح کامیاب ثابت ہوا تھا تو اسے خوشبو کماری کی یاد آ گئی اور وہ اس کی تلاش میں دریا کنارے دھوبی گھاٹ پر منڈلانے لگا جہاں گدھوں کی تعداد کافی کم ہو گئی تھی کیونکہ اب دھوبی موٹر سائکلوں پر کپڑوں کے گٹھر ڈھونے لگے تھے۔ اسی درمیان خوشبو تین بچوں کی ماں بن چکی تھی اور پھلندر ایک بار پھر جیل میں تھا۔ کئی مہینوں کی تاکا جھانکی کے بعد ایک دن اس کے صبر کا بند ٹوٹ گیا اور اس نے کھلے عام پھلندر کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا جسے اس کے باپ نے کھولا تھا۔ پھلندر کا باپ کافی ڈیل ڈول والا آدمی تھا جس کا نچلا ہونٹ بھاری ہو کر نیچے لٹک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہمیشہ سرخ ڈورے تیرا کرتے۔ جب سے اسے پیٹ کی بیماری ہوئی تھی (اس کے ہانڈی جیسے پیٹ میں ہمیشہ گیس کے بگولے چھوٹتے رہتے) اس نے گھاٹ جانا بند کر دیا تھا جسے اب اس کے دونوں بڑے لڑکے سنبھال رہے تھے۔ وہ خود ایک بھجن منڈلی کا ممبر بن گیا تھا جس میں وہ مجیرا

بجایا کرتا اور بھنگ کے سوٹے لگاتا۔

'ایک کافی نہ تھا کہ تم آ گئے،' اس نے خونخوار نظروں سے دمسکو کی طرف دیکھا۔'ایک چور سے پیچھا چھوٹا نہیں کہ دوسرا حاضر۔'

'میں خوشبو سے ملنا چاہتا ہوں۔'

'راکھی بندھوانا ہے؟'

دمسکو ایک پل کے لئے پریشان ہو گیا۔'میں جیل میں پھلندر سے ملنے گیا تھا۔اس نے خوشبو کے بارے میں پوچھا ہے۔وہ اس کے لئے بہت پریشان ہے،' اس نے جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔'اس نے سنا ہے اسے سسرال والے بہت ستاتے ہیں۔کیا میں کچھ کر سکتا ہوں؟'

'ہاں، تم یہاں سے رفو چکر ہو سکتے ہو۔'

بوڑھے کے ماتھے کی رگیں پھڑک رہی تھیں جو کسی خطرے کی گھنٹی سے کم نہ تھی۔شاید اسے دمسکو کی نیت کا پتہ تھا۔یوں بھی اسے مسلمانوں سے نفرت تھی جو نہ صرف مسجد کے چونگوں پر رات دن اس کی نیند خراب کیا کرتے بلکہ آئے دن گلی کوچوں میں اور سڑکوں کے کنارے غیر قانونی طور پر تقریر اور میلاد کی محفلیں سجانے کے عادی تھے جہاں مقررین رات رات بھر مائکوں پر چنگھاڑ لگا کر محلے والوں کو سونے نہیں دیتے تھے۔اسے بیف کی دکانوں سے نفرت تھی جہاں کھلے عام گو ہتیا کا کاروبار چلتا رہتا اور اعلانیہ طور پر گائے کے سر اور دمیں چھپر سے لٹکتی رہتیں۔اسے ہر داڑھی ٹوپی والے سے نفرت تھی جو انہیں کافر بتاتے اور خود گندگی اور غلاظت کے ڈھیر میں جینے کے باوجود جانے کس احساسِ برتری کے جذبے کے تحت اکڑ کر چلا کرتے۔اسے کانوں سے بالی لٹکائے مسلم لڑکوں سے نفرت تھی (اس کے دھندلائے ہوئے ذہن میں ہر لڑکا جو برا تھا وہ مسلمان تھا) جو کھلے عام ماں بہن کی گالیاں دیا کرتے اور ہندو لڑکیوں کی طرف بے حیائی سے دیکھا کرتے کیونکہ ان کی اپنی عورتیں برقعے میں ہوتیں۔اس نے کئی چھوٹے بڑے دنگوں میں حصہ لیا تھا۔اسے یہ بالکل پسند نہ تھا کہ ایک مسلمان کے ساتھ اس کی بیٹی کا ناجائز رشتہ ہو چاہے وہ اس کے لڑکے کا دوست ہی کیوں نہ ہو۔

پھلندر کے بغیر دمسکو بہت کم چوری کے منصوبے بنا پاتا۔اسے اس پر حیرت تھی کہ چوری سے پہلے پھلندر کیسے کسی خاص گھر کے سلسلے میں اتنی جانکاری حاصل کر لیا کرتا ہے۔ظاہر

تھا، ان دنوں اس کی جیب خالی تھی اور اس کی بیوی نے اس ڈر سے کہ وہ دیے ہوئے گہنے واپس نہ مانگ لے اس سے سرد مہری اختیار کر رکھی تھی۔ اب وہ جب بھی بستر پر اسے اپنی طرف کھینچتا وہ ایام کا بہانہ بنا کر دوسرے کمرے میں اپنی بچیوں کے پاس چلی جاتی۔ ایک دن اس نے دیودت سے شکایت کی کہ وہ خوامخواہ اس کے معاملے میں ٹانگ اڑانے لگا ہے۔

'اور یہی تو کام ہے میرا،' دیودت ہنسا۔ 'تمہیں کس نے روکا ہے؟ یہ دنیا ہم دونوں کی وجہ سے چل رہی ہے۔ اگر تم نہ رہو گے تو میرا کام کیا ہے؟'

تو دسکو نے اسے خوش کرنے کے لئے ہاتھی دانت کا بنا ایک قیمتی ہیئر بینڈ پیش کیا جسے اس نے ایک اینگلو انڈین طوائف کے گھر سے چوری کے دوران ڈریسنگ ٹیبل سے اٹھا لیا تھا۔ یہ انگریزوں کے زمانے کا ہیئر بینڈ تھا جو عام طور پر نادرات کی دکانوں میں دیکھا جاتا ہے۔ 'میری رکھیل اسے پسند کرے گی،' دیودت نے اسے اپنی جیب کے اندر ڈالتے ہوئے کہا۔ 'اور میں اس سے کہوں گا کہ یہ ایک چور کا تحفہ ہے۔'

'تم کہہ سکتے ہو تم نے ایک مردہ عورت کے بالوں سے اسے نکالا ہے،' دسکو نے غصے سے کہا۔ 'جس میں تم پولس والے ماہر ہو۔'

دوسری بار اس نے دیودت کو ایک لائٹر دیا جو ایک منی پسٹل کی شکل کا تھا اور اس کا ٹریگر دبانے سے آگ کی لپٹ باہر آتی تھی۔ یہ لائٹر اس نے ریس کورس میں گھوڑا دوڑانے والے ایک جوکی کی کار سے میوزک سسٹم چراتے وقت ڈیش بورڈ سے نکال لیا تھا۔ شیشہ کے اندر اسکیل ڈال کر کار کی کھڑکی کھولنے کا گر اسے پھلندر نے سکھایا تھا۔ دیودت نے اسے اپنی جیب کے اندر رکھ لیا۔ 'ڈاکٹر نے مجھے سگریٹ پینے سے منع کر رکھا ہے۔ مگر شاید اس کے سبب پھر سے پینے لگوں۔'

'جو تمہیں پینا چاہیے، تا کہ تم کینسر کا شکار ہو کر مر سکو اور تم سے پیچھا چھوٹے۔'

اور دسکو نے جس دن اسے ایک چھوٹا سا قالین تحفے میں دیا جسے اس نے قالین کے ایک گدام سے اس کے دربان کے ساتھ ملی بھگت کر کے دوسرے قالینوں کے ساتھ اڑایا تھا تو دیودت کے لئے تو یہ حد ہو گئی۔ 'میری جورو اسے پسند کرے گی۔' اس نے قالین واپس رول کر کے تتلی سے باندھتے ہوئے کہا۔ 'اسے اسی طرح کی چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے جو کسی کام کی نہ ہوں۔'

'اور جب تم اپنی جورو سے اکتا جاؤ گے تو اسی دری میں لپیٹ کر اسے دریا میں پھینک

سکتے ہو۔' دمسکو نے کہا۔' جو یقیناً تم نے کرنے کے بارے میں کئی بار سوچا ہوگا۔'

ایک دن اس نے دیکھا خوشبو اس کے گھر کی چار دیواری پر ہات رکھے کھڑی ہے اور چنا چبا نکلتے ہوئے اس کی بیوی کے ساتھ بات کر رہی ہے۔ اس کی دونوں جڑواں بیٹیاں تھوڑے فاصلے پر آنگن میں کھڑی ان کی طرف تاک رہی تھیں۔ یہ ان دونوں کی پہلی ملاقات نہ تھی مگر دمسکو کی بیوی کو پتہ تھا اس کے خوشبو کے ساتھ کس قسم کے تعلقات تھے۔ اس نے دیکھا خوشبو اور بھی موٹی ہو گئی تھی اور اس کے چہرے پر مار کے نشان تھے۔ نہ صرف اس کے کولھے بڑے ہو گئے تھے بلکہ بچوں کو دودھ پلاتے پلاتے اس کے من زور پستان اور بھی بھاری ہو کر لٹک گئے تھے۔

'میں واپس سسرال جانے والی ہوں،' اکیلا ہونے پر اس نے دمسکو سے کہا۔' کیا ہم اکیلے میں مل سکتے ہیں؟'

'تمہیں پتہ ہے تمہارا باپ تمہارے بارے میں کیا سوچتا ہے؟ میں نے سنا ہے وہ گھر میں گنڈاسے کے ساتھ تیار رہتا ہے۔'

'مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ ہاں مجھے اس کی پرواہ ہے کہ تم میرے بارے میں کیا سوچتے ہو؟ کہ تم نے بالکل سوچنا بند کر دیا ہے؟'

'تمہیں پتہ چلنا چاہئے اب میں بدل گیا ہوں،' دمسکو ہنسا۔' میں وہ لڑکا نہیں رہا جسے تم نے خراب کرنے کی کوشش کی تھی۔'

'وہی تو۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں تم اب کتنے خراب ہو چکے ہو؟' خوشبو نے سمجھداری سے مسکراتے ہوئے کہا۔ کسی وجہ سے دمسکو کو خوشبو کی مسکراہٹ اچھی نہیں لگی۔ اسے ایسا لگا جیسے عورت کے معاملے میں اس کے اندر کی خود اعتمادی میں پھر سے اس نے سیندھ لگا دی ہو۔ اس رات اطمینان کے لئے اس نے اپنی بیوی کے ساتھ کافی دیر تک ہم بستری کی اور اس کا تردد جاتا رہا۔' اتنے سال ہو گئے،' بعد میں ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے اس نے اپنی بیوی سے کہا۔' تمہیں نہیں لگتا ہمارے اور بھی بچے ہونے چاہئیں۔'

'ہو جائیں گے، ہو جائیں گے۔' اس کی بیوی اس کی چٹکی لیتے ہوئے بولی۔' میں نے تمہیں بچے نہیں دیے ہیں کیا؟ بس تم محنت جاری رکھو اور اس چھنال کو بھول جاؤ۔ اور دیکھو کبھی کبھار اپنے باپ کی بھی خبر لے لیا کرو۔ آج وہ تمہیں یاد کر رہے تھے۔'

'میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں؟ میری زندگی میں وہ پہلی عورت ہے۔' دسکو نے کہا۔ 'لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ میرے لئے کوئی خاص چیز ہے۔ اور اس بوڑھے کو اب میری ضرورت کیوں پڑنے لگی؟'

پھر بھی دوسری صبح وہ ورکشاب کے اندر گیا جہاں اس کا باپ دھول اور مکڑی کے جالوں سے ڈھکی ہوئی دھونکنی کے سامنے چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے منہ کے اندر اب صرف دو دانت بچے تھے جنھیں چارپائی پر بیٹھا وہ چوسا کرتا۔ اینچی کے لئے آخری وقت آچکا ہے، دسکو نے سوچا اور انتظار کرنے لگا کہ اس کا باپ کچھ کہے۔

'مجھے لگتا ہے میں کچھ ہی دنوں کا مہمان ہوں۔' بوڑھا اپنے داہنے پیر کے بوڑھے انگوٹھے کو دونوں ہاتوں سے پکڑ کر مروڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ 'جب بھی یہ انگوٹھا پھڑکتا ہے مجھے پتہ چل جاتا ہے کیا ہونے والا ہے۔'

'کیا ہونے والا ہے؟'

'شاید وقت آگیا ہے کہ میں دوسری دنیا کے لئے بوریا بستر باندھ لوں۔' بوڑھے نے کہا۔ 'میں کبھی اچھا مسلمان نہیں رہا لیکن تم مجھ سے بھی بدتر نکلے۔ اور اس تمہارے پھلندر کا کیا حال ہے؟'

'جیل میں ہے۔'

'اس کے لئے صحیح جگہ ہے۔ اس معاملے میں تم بدنصیب نکلے۔' بوڑھا تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر اس نے اپنی لکڑی اٹھائی اور اس کی نوک سے ورکشاپ کی اندرونی کوٹھری کے ٹن کا زنگ کھایا ہوا دروازہ کھٹکھٹایا۔ کوٹھری کے اندر الم غلم سامان بھرے پڑے تھے جن کے درمیان رات رات بھر چوہے اور چھچھوندر دوڑا کرتے۔ دسکو نے دروازہ کھولا تو حبس کا ایک بھبھکا باہر آیا اور کئی چھپکلیاں دیوار پر بھاگ نکلیں۔ بوڑھا لکڑی ٹیکتا ہوا کوٹھری کے ندر داخل ہوا اور اس نے ایک تجوری نما صندوقچی کو باہر لانے کے لئے کہا جو زمین پر پڑی دھول کھا رہی تھی۔ صندوقچی اس قدر بھاری تھی کہ اسے برامدے تک لانے میں دسکو کا دم پھول گیا۔ 'کیا ہے اس کے اندر، کوئی جن؟' اپنے چہرا سے پسینہ صاف کرتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ صندوقچی پر کوئی قفل نہیں تھا اور اس کے ڈھکن کا ہنڈل اوپر کی طرف لگا ہوا تھا۔ ڈھکن اٹھانے پر اس نے دیکھا صندوقچی لوہے کی

نعلوں سے اوپر تک اٹی پڑی تھی جو ساری کی ساری زنگ کھائی ہوئی تھیں۔ اس کا باپ اپنا بھاڑ سا منہ کھول کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اپنے دونوں بچے کھچے دانتوں سے اس طرح مسکرا رہا تھا جیسے اس نے دسکو کے سامنے قارون کا خزانہ کھول دیا ہو۔ دسکو نے ہات جھاڑتے ہوئے کہا۔ 'اب یہ کسی کام کے نہیں ہیں۔'

'گدھے ہو تم۔' بوڑھے نے آپے سے باہر ہوتے ہوئے کہا۔ 'یہ وہ قیمتی نعل ہیں جو تمہاری دنیا بدل سکتی ہیں۔'

'انھیں کباڑی بھی نہیں خریدنے والا۔'

'گھوڑوں کی نعل کے بارے میں تم کتنا جانتے ہو؟ میری بات غور سے سنو بچے، یہاں سے پچھم کی طرف ایک ریلوے اسٹیشن ہے، منثور، وہاں نواب منثور کی حویلی ہے۔ تم یہ بکس منثور کے نواب کو پہنچا سکتے ہو۔ ان کا گھوڑے کا ایک شاندار اصطبل ہے۔ میں تمہارے دادا کے ساتھ کئی برس وہاں رہ چکا ہوں۔ تمہارے دادا نواب کے نہ صرف خاص نعل بند تھے بلکہ ان کے سلوتری کے معاون کے طور پر بھی کام کرتے تھے۔ وہ تمہیں سونے کے سکوں سے مالامال کر دیں گے۔'

'میں وہ اسٹیشن دیکھ چکا ہوں۔ وہ ایک اجاڑ سی جگہ ہے جہاں اب ٹرینیں بھی نہیں رکتیں۔ وہاں میں نے ایسے کسی نواب کے بارے میں کبھی نہیں سنا۔'

'کیونکہ تمہارے کان گدھے کے ہیں۔' بوڑھے نے غصے سے کہا۔ 'تمہیں اس اصطبل کا رخ کرنا چاہئے۔ وہاں تمہیں ایسے گھوڑے نظر آئیں گے کہ تم خواب وخیال میں بھی نہیں سوچ سکتے۔ خالص عربی ایرانی اور ترکی گھوڑوں سے لے کر ہسپانوی مستانگ اور منگولیا کی پونی تک، یہاں تک کہ نواب کے اصطبل میں تمہیں شٹ لینڈ کے ٹٹو اور ہالینڈ کی نسل کے گھوڑے تک دکھائی دیں گے۔'

بوڑھے کا دماغ سنک گیا ہے، دسکو نے جھونپڑی سے باہر آتے ہوئے سوچا۔ جانے وہ کس نواب کی بات کر رہا ہے۔ میں تو صرف ایک نواب کو جانتا ہوں جس کی کوتوالی والے علاقے میں اپنی حویلی ہے جس پر سرکار نے بے دخلی کا مقدمہ دائر کر رکھا ہے اور جو اپنی پھٹی ہوئی وردی پہن کر کرایہ داروں سے ادھار مانگا کرتا ہے۔ اس کے دوسرے دن بوڑھا جب اپنی کوٹھری سے باہر نہیں آیا تو دسکو کی بیوی نے اپنا سینہ پیٹنا شروع کر دیا۔ دسکو رات بھر شہر کا چکر لگا کر نا کام لوٹا

تھا اور اپنی چارپائی پر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ اسے جاگنا اچھا نہ لگا۔ کوٹھری کا دروازہ دستک دیتے ہی کھل گیا۔ بوڑھا اپنی چارپائی پر نہیں تھا۔ وہ ایک چار پہیوں والے تختے پر (جس پر وہ گذشتہ کئی دنوں سے کیل اور ہتھوڑے کی مدد سے پہیئے لگا رہا تھا) نعل کی صندوقچی رکھے اسے رسی سے کھینچتے ہوئے دریا کے کنارے دھیرے دھیرے اپنی لکڑی ٹیکتا ہوا چل رہا تھا جب دمسکو نے اسے جا لیا اور بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر گھر لے آیا۔ اس نے اپنے باپ سے وعدہ کیا کہ اس کے مرتے ہی نعل سے بھری صندوقچی کے ساتھ وہ نواب کے دربار میں حاضر ہو جائے گا۔ اور جب بوڑھے کو اس بات کا اطمینان ہو گیا تو اس نے اس دارِ فانی سے کوچ کرنے کی ٹھانی۔ اس نے دمسکو سے کہا۔ 'میرے چشم و چراغ، وقت آ چکا ہے کہ میں اپنے گناہوں کی جوابدہی کے لئے اللہ کا سامنا کروں جو بڑا رحیم ہے۔ مجھے صحیح قبرستان میں دفنانا جہاں مجھے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز سنائی دے۔' اس نے دمسکو کو ایک اور وصیت کی۔ 'اور اگر تم نے یہ چوری کا دھندا بند نہیں کیا تو میں واپس آؤں گا۔ تم تو جانتے ہو عالمِ ارواح سے لوگوں کو آنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ یہ دھونکنی دیکھ رہے ہو، یہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ اور یہ بھٹی، میں تمہیں وہ جگہ بتا سکتا ہوں جہاں تمہیں اس کے لئے سستہ چارکول مل سکتا ہے جو نہ بھی ملے تو کوئی بات نہیں تم کوئلہ سے کام چلا سکتے ہو۔ تمہارے جسم میں ایک نعل بند کا خون دوڑ رہا ہے۔ تم خاندانی نعل بند ہو۔ تم گھوڑوں سے زیادہ عرصے تک دور نہیں رہ سکتے۔'

دمسکو کو ایسے کسی قبرستان کا پتہ نہ تھا جہاں گھوڑے ہنہناتے ہوں یا جس کے آس پاس گھوڑوں کا اصطبل یا چراگاہ ہو۔ اس نے سوچا مرنے والوں کے لئے گھوڑوں کا ہنہنانا اور گدھوں کا رینکنا دونوں برابر ہوتا ہے۔ اس لئے جب بوڑھے کو موت آئی تو اس نے اسے ایک ایسے قبرستان میں دفنایا جس میں گدھے اینڈ رہے تھے۔ باپ کی وصیت کے مطابق اس نے کفن کے اندر ایک نعل رکھ دیا تھا۔ اور جب یہ سب کچھ ختم ہوا اور جب پھلندر جیل میں تھا اور جب کہ اچانک اس کی بیوی کا حمل ٹھہر گیا تھا اور مجبوراً اسے اپنی شہوانی خواہشات پر لگام ڈالنی پڑی تھی تو اسے خوشبو یاد آ گئی۔ ان دونوں کی ملاقات کا پتہ خوشبو کے باپ کو لگنا مشکل تھا کیونکہ وہ دھوبی گھاٹ سے دور دریا کے کنارے ایک دوسری جگہ ملنے لگے تھے جہاں جانوروں کے مردے ڈالے جاتے۔ مگر اب اچانک اسے محسوس ہونے لگا جیسے خوشبو کو اس سے صرف ملنے اور اس کے

ساتھ چوری چھپے سینما دیکھنے، پارک میں بیٹھ کر چوما چاٹی کرنے اور دہی کچوڑی کھانے سے دلچسپی تھی، اس سے آگے وہ ہر بات ٹال جاتی۔ اب جب بھی وہ اس ویران گھر کا ذکر کرتا جس کی کھڑکی سے ہمیشہ گدھے کے مسکراتے ہوئے دانت نظر آتے تو وہ کنی کاٹ جاتی۔

'تمہیں کس بات کا ڈر ہے؟' دمسکو نے ایک دن کہا۔ 'کتنے سال ہو گئے۔ تمہارا پتی تو تیسری شادی بھی کر چکا۔'

'مجھے تم سے ڈر ہے،' وہ بولی۔ 'مجھے نہیں لگتا تم اس کام کے لائق ہو۔'

'اچھا۔ تو پھر میں تمہیں بتا دوں میں ایک اور بچے کا باپ بننے والا ہوں۔'

'واقعی!' اسے یقین نہیں آیا۔ مگر دھیرے دھیرے اس کے اندر ایک تبدیلی دکھائی دینے لگی۔ وہ دمسکو سے کترانے لگی۔ دمسکو نے سوچا، شاید اسے کوئی اور مل گیا ہوگا؟ جانے کیوں اس سوچ کے ساتھ خوشبو کے لئے اس کی بے چینی اور بھی بڑھ گئی۔ ایسا ہی ہوتا ہے، اس نے خود سے کہا، جب کوئی چیز تم سے دور جاتی ہے تو تم اس کے لئے اور زیادہ بے چین ہو اٹھتے ہو۔ خوشبو نے دریا کے کنارے آنا بند کر دیا تھا۔ وہ اس کے گھر کے باہر منڈلانے لگا۔ خوشبو اس کے خوف سے بہت کم نکلا کرتی اور جب بھی باہر آتی یا دریا کل پر کپڑے دھونے بیٹھتی تو ہمیشہ اپنے کسی نہ کسی بچے کے ساتھ دکھائی دیتی۔ مگر ایک دن گھر کو بالکل ویران پا کر دمسکو اندر جا گھسا۔ خوشبو شاید اسی کا انتظار کر رہی تھی۔

'چوری کے دھندے نے تمہیں کافی سیانا بنا دیا ہے۔' اس نے بستر پر پڑے پڑے انگڑائی لے کر لہنگا سے اپنے داہنے پیر کا انگوٹھا باہر نکال کر اس سے دمسکو کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا۔ 'تمہیں پتہ چل جاتا ہے کہ کب کس کا گھر ویران رہتا ہے۔'

اس دن خوشبو کو شاید مرد کی ضرورت تھی کیونکہ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح پھول رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں ان تمام برسوں کا خمار ابھر آیا تھا جب اسے مرد سے محروم رہنا پڑا تھا۔ دمسکو کے لئے اس سے اچھا موقع اسے پانے کا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ دیر تک خوشبو کے جسم کے ساتھ کھیلتا رہا۔ خوشبو اس کا انتظار کرتی رہی۔ مگر دمسکو گویا واپس پھر سے پرانے دنوں میں لوٹ گیا تھا۔

'یہ صرف تمہارے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے؟' دمسکو نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

'بند بھی کرو،' خوشبو نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ 'باہر مجھے کچھ لوگوں کی آوازیں

سنائی دے رہی ہیں۔ میں کہتی ہوں جتنی جلدی ہو سکے بھاگ جاؤ۔'

کانپتی انگلیوں سے شرٹ کے بٹن لگاتے ہوئے جب کہ دروازے پر لوگوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا دمسکو ایک چور کی پھرتی کے ساتھ دیوار پھاند کر بھاگ نکلا۔ اس نے دور سے دیکھا، خوشبو کا باپ کافی لوگ اکٹھا کر چکا تھا۔ دمسکو تو ہاتھ نہ آیا مگر آس پاس کے کئی مسلمانوں کے گھر جلا دئے گئے۔ کچھ لوگ زخمی بھی ہوئے۔ ایک شخص ہندو فسادیوں سے بھاگنے کے چکر میں دریا کے اندر کود پڑا اور لوہے کے ایک ڈھانچے میں پھنس کر مارا گیا۔ اس کی لاش باہر نکالی گئی تو وہ ایک ہندو نکلا۔ اس بات نے فساد کو اور ہوا دی۔ بہت سارے لوگ پولس کی حراست میں لے لیے گئے جن میں دمسکو بھی شامل تھا۔ اسے حیرت تھی کہ پولس کو اس کے بارے میں پتہ کیسے چل گیا تھا جب کہ اسے بھاگتے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ وہ کئی ہفتے حاجت میں بند رہا۔ پھر سیاسی پارٹیاں نمودار ہوئیں، امن کمیٹیاں بنیں اور سارے لوگ رہا کر دئے گئے۔ جیل سے چھوٹ کر دمسکو نے دیکھا دنیا کوئی خاص بدلی نہ تھی گرچہ پھلندر ابھی تک جیل کی ہوا کھا رہا تھا۔ مگر جانے وہ کس جیل میں تھا؟ اس نے پھر سے چوری شروع کر دی اور جیسا کہ اس کے ساتھ ہوا کرتا تھا، اس کی ملاقات پھر سے دیودت سے ہو گئی۔

'تو تم نے جیل کی ہوا کھا لی،' دیودت نے اسے سگریٹ دیتے ہوئے کہا۔ 'کیا وہ اتنی کراری عورت تھی۔ تمہارے اپنے دھرم کی عورتیں مر گئیں کیا؟'

'اب کون نقاب اٹھا اٹھا کر عشق لڑاتا پھرے۔'

'میں سب سمجھتا ہوں،' دیودت ہنسا۔ 'اس کے فسادی باپ کو بہانہ چاہئے تھا اور تم اس کے جال میں پھنس گئے۔ تمہیں خبر بھی ہے تم جس عورت کے ساتھ تھے خود اس نے پولس کو تمہارا نام بتایا تھا۔ شاید اس کے لوگوں نے اسے دھمکایا ہو۔ تمہیں ہوشیار رہنا چاہئے۔ شہر کی ہوا ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی ہے۔ دھرم آدمی کو جانور بنا دیتا ہے۔'

'خوشبو ایسی عورت نہیں ہے۔' دمسکو نے غصے سے کہا۔ 'وہ تو سسرال میں جلتے جلتے رہ گئی۔' مگر اب اسے بھی خوشبو پر شبہ ہونے لگا تھا۔ ایک دن وہ پھلندر کا گھر گیا۔ دروازہ ہر بار کی طرح اس کے باپ نے کھولا۔ دمسکو کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اچانک پھلندر کا باپ بالکل بوڑھا ہو گیا تھا۔ نہ صرف اس کی ایک آنکھ میں چھالا پڑ چکا تھا اور کان کی لووں اور بھووں پر اگے ہوئے

بال سفید ہو گئے تھے بلکہ اسے کھڑے ہونے کے لئے ایک لکڑی کا سہارا بھی لینا پڑ رہا تھا۔ شاید وہ زندگی کا سامنا کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ 'تم پھر آ گئے،' اس نے کہا۔ 'اس بار مارے جاؤ گے بچے۔'

'میں پھلندر کے بارے میں جاننے آیا ہوں۔ وہ میرا دوست ہے اور آپ ہمیں ملنے سے روک نہیں سکتے۔'

'اسے چھوٹنے میں ابھی ایک برس اور ہے۔'

'یہ تو اچھی خبر ہے۔ آپ کو بتاشے بانٹنے چاہئیں۔' اس نے بوڑھے کی آنکھوں میں بے خوفی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ 'آپ کو صرف دنگا کروانا ہی آتا ہے کہ لڑکیوں کے بارے میں بھی سوچتے ہیں؟'

'تمہیں اس سے مطلب؟'

'گھر میں بیاہتا لڑکی کو بٹھا کر رکھو گے تو میرے جیسے لوگ تو آئیں گے ہی۔' بوڑھے کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا چھوڑ کر وہ چل پڑا۔

وہ اطمینان سے چل رہا تھا جیسے بوڑھے کا انتظار کر رہا ہو کہ وہ اس کے پیچھے آئے اور کوئی فتنہ کھڑا کرے۔ مگر بوڑھا اپنی جگہ کھڑا دھندلی آنکھوں سے اس کی طرف تاکتا رہا۔

//////

اپنی تیسری لڑکی کی پیدائش سے دسکو کو کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ اس نے سوچا، ہم جیسے برے لوگوں کے ساتھ اور کیا ہو سکتا ہے۔ پچھلے فساد کو دو سال بیت چکے تھے۔ مگر الیکشن کے آتے ہی شہر کی ہوا ایک بار پھر سے گرم ہو گئی تھی اور طرح طرح کی افواہیں گشت کرنے لگی تھیں۔ دسکو کے محلے میں مسلمانوں کے جھونپڑوں اور چھوٹے موٹے کھپریل کے مکانوں کے بیچ نیم کے درختوں سے ڈھکا ایک چھوٹا سا تالاب تھا جو دراصل برسات کے پانی کے ساتھ ساتھ گھروں سے بہہ کر آنے والے نالوں کے سبب بن گیا تھا۔ اس تالاب کے عین کنارے ایک دو منزلہ عمارت واقع تھی جو ایک ہندو وکیل کی تھی۔ چونکہ اس کے زیادہ تر موکل مسلمان تھے اپنے ایک موکل کی سستی زمین خرید کر اس نے مسلمانوں کے محلے میں اپنا دو منزلہ گھر بنا لیا تھا۔ دسکو اپنا جیل جانا بھولا نہ تھا۔ وہ اس کا بدلہ وکیل سے لینا چاہتا تھا۔ اسی دوران شہر میں ایک دو چھوٹے موٹے واقعات ہو گئے تھے۔ سڑکوں پر ملیٹری کے جوان گشت کرنے لگے تھے۔ دسکو شام ہوتے ہی نیم

کے درخت کی سب سے اونچی شاخ پر جا بیٹھتا جو وکیل کی دوسری منزل کی بالکنی سے لگی ہوئی تھی اور سگریٹ پیتے ہوئے کھڑکیوں کے اندر نظر رکھا کرتا۔ گرچہ وہ پوری طرح پتوں میں چھپا رہتا مگر اس کے وہاں ہونے کا نہ صرف پورے محلے کو علم تھا بلکہ خود وکیل کو اس کا پتہ تھا۔ اس نے دمسکو کو بچپن سے دیکھا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اپنے باپ کے برعکس جو پرانے دنوں میں وکیل کے گھوڑوں کے نعل لگایا کرتا، دمسکو نے چوری کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا۔ وہ خود دمسکو کے دادا کی عمر کا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس آتا اور پتوں کے اندر چھپے ہوئے دمسکو کو ملامت کرتا۔

'تمہیں شرم آنی چاہئے، میں تم لوگوں کو تمہارے دادا کے دنوں سے جانتا ہوں۔ اور پھر ہم پڑوسی نہیں ہیں کیا؟'

'یہ آپ کس سے بات کر رہے ہیں؟ میں تو یہاں ہوں ہی نہیں۔'

بوڑھا وکیل تھوڑی دیر تک پتوں کی طرف رخ کئے کھڑا رہتا جو بڑی دانشمندی سے ہلنا بند کر دیتے۔ پھر وہ کہتا 'تمہارا ارادہ کیا ہے برخوردار؟'

دمسکو اسے کبھی نہ بتاتا کہ اس کا ارادہ کیا ہے کیونکہ اسے خود اس کا پتہ نہیں تھا۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ شہر میں اگر فساد ہو گیا تو وہ وکیل کے گھر میں داخل ہو جائے گا۔

'کس لئے؟' جیسے وکیل کو اسکے منصوبے کا علم ہو۔ 'تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میرے پاس ایک بندوق ہے۔'

دمسکو ہنستا۔ 'آپ نے اسے کبھی چلایا بھی ہے کہ صرف دنیا کو دکھانے کے لئے ہر سال اسے تھانہ لے جاتے ہو' کیونکہ ایک بار اپنے باپ کے کہنے پر وہ وکیل کی بندوق ڈھو کر لائسنس کے رینیول کے لئے تھانہ لے گیا تھا۔

'تم چاہتے کیا ہو؟' بوڑھے کو غصہ آ جاتا۔ 'میں چاہوں تو پولس میں اطلاع دے سکتا ہوں۔ مگر تم میرے محلے کے آدمی ہو، اور میں یہ نہیں چاہتا۔'

'میں جا رہا ہوں۔' دمسکو پیڑ سے اتر آتا۔ مگر نیچے اتر کر وہ چلا کر یہ کہنا کبھی نہ بھولتا کہ وہ پھر سے لوٹ کر آئے گا اور بڈھو کو چاہئے کہ وہ اپنی کھڑکی کھلی رکھے۔

'تم چاہو تو میں تمہیں کچھ پیسے دے سکتا ہوں،' اگلی بار وکیل نے پتوں سے کہا جن کے اندر سے سگریٹ کا دھواں باہر آ رہا تھا۔ اسی درمیان اس نے کچھ شاخیں چھنٹوا دی تھیں جو بالکنی

تک پہنچتی تھیں۔

'کتنے؟'

'تم کہو۔' وکیل ہنسا۔ 'کیونکہ مجھے یقین ہے بہت جلد تم چوری کرتے ہوئے پکڑے جاؤ گے اور ضمانت کے لئے میرے پاس آؤ گے تو میں اپنا سارا پیسہ وصول لوں گا۔'

'مجھے پیسہ نہیں چاہئے۔' دسکو ہنسا۔ 'اگر مجھے پیسہ چاہئے ہوتا تو آپ کے گھر میں اب تک چوری نہ کر چکا ہوتا۔ میں نے ایسا اس لئے نہیں کیا کیونکہ مجھے محلے میں آنکھ کا پانی بچا کر رکھنا ہے۔'

مگر پھر چور دسکو کی دلچسپی اس معاملے سے دھیرے دھیرے ختم ہونے لگی کیونکہ الیکشن کے گذرتے ہی فساد کا بازار سرد ہو گیا تھا۔ ایک دن اس کی بیوی نے جو ایک بار پھر سے حمل سے تھی، کہا کہ بوڑھا لوٹ آیا ہے۔ اس نے ورکشاپ سے کھٹر پٹر کی آواز سنی تھی۔ یہ پرانے لوگ، دسکو نے سوچا، یہ کبھی اپنی بات نہیں بھولتے! اس نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ مگر اسے لگا تار کئی رات تک آنگن سے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔ وہ جب بھی دروازہ کھولتا آواز غائب ہو جاتی۔ اسے کہیں پر کوئی گھوڑا نظر نہ آتا۔ ایک رات جب کہ وہ پیشاب کرنے کے لئے دیوار کی طرف جا رہا تھا اس نے ورکشاپ کے برامدے سے سندان پر ہتھوڑے گرنے کی آواز سنی۔ برامدے پر آ کر اس نے دیکھا سندان تو اپنی جگہ کھڑا تھا مگر ہتھوڑے اور دوسرے اوزار ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ اس نے مسکرا کر سوچا، بڈھا اپنی چال چل رہا ہے۔ سندان پر ہتھوڑے کے واقعے کے بعد کئی ہفتے تک بالکل خاموشی چھائی رہی تو اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا، یہ اور کچھ نہیں اس کے دماغ کا فتور ہے۔ مگر ایک روز آدھی رات کے وقت، جب کہ بچی بلا وجہ روئے جا رہی تھی اور دسکو باہر نکلنے کے بارے میں سوچتے سوچتے اچانک سو گیا تھا، اس کی بیوی نے جھنجھوڑ کر اسے جگا دیا۔ وہ کھڑکی سے ورکشاپ کی طرف اشارا کر رہی تھی جس کے اندر روشنی ہو رہی تھی۔ وہاں سے دھونکنی کے تیز چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس کی دونوں بیٹیاں اپنے مشترکہ بستر پر بیٹھی ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی کانپ رہی تھیں۔ ڈرتے ڈرتے اس نے دروازہ کھولا۔ اسے لگا ورکشاپ کے برامدے سے کوئی گذرا تھا۔ 'کون ہے؟' اس نے چلا کر کہا۔ وہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ اسے خود اپنی آواز کسی دوسرے کی لگ رہی تھی۔ 'تم کسے آواز دے رہے ہو؟ وہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔' اسے اپنی بیوی کی آواز سنائی دی جو لالٹین اٹھائے اس کے پیچھے کھڑی تھی۔

لالٹین تھامے ہوئے وہ محتاط قدموں سے چلتا ہوا ورکشاپ کے برامدے تک آیا تو اس نے دیکھا کوٹھری تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اور اندر سے کسی دھونکنی کی آواز نہیں آرہی تھی۔ اسے قفل کھولنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ دوسری صبح وہ لوگ ورکشاپ کے اندر داخل ہوئے تو انھوں نے دیکھا، چولھا ٹھنڈا پڑا تھا اور اس کے سینچوں پر جمی برسوں پرانی راکھ پر چوہوں کی مینگنیاں پڑی تھیں۔ خود دھونکنی کی چرمی تھیلی اور لٹکتی زنجیر سے مکڑی کے جالے لپٹے ہوئے تھے جن سے مکڑی کے انڈے اور مردہ کیڑے مکوڑے لٹک رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا انھیں برسوں سے ہات نہیں لگایا گیا تھا

'یہ اس پرانے صندوق کے سبب ہے۔ بوڑھا اپنا کھیل کھیل رہا ہے۔' دمسکو نے اپنی بیوی سے کہا۔ 'مجھے چاہئے کہ اس سلسلے میں بوڑھے سے اپنا کیا گیا وعدہ پورا کروں۔'

دوسرے دن وہ بس میں بیٹھ کر منثور کے اسٹیشن کے باہر اترا جس کی پٹریوں سے اب ٹرینوں کا گذرنا بند ہو چکا تھا۔ اس میں اب صرف لوہے کے زنگ کھائے ہوئے ڈھانچے کھڑے تھے جن کی دیواروں کی پٹریاں چرالی گئی تھیں اور فرش پر جہاں کبھی غلہ اور سیمنٹ اتارے جاتے، مقامی لڑکے جوا کھیل رہے تھے۔ اس جگہ سے تھوڑی دور اسے پٹریوں کا جال نظر آیا جہاں پر کہیں کہیں ٹرینیں کھڑی تھیں۔ ان پٹریوں کے جال سے پرے خاردار جھاڑیوں سے ڈھکے ڈھلان اور کائی سے ڈھکے تالاب تھے جہاں ہر طرف سے فضلوں کی تیز باس آرہی تھی۔ اس ویرانے میں اسے ایک میل تک چلنا پڑا تب کہیں جا کر اسے نواب منثور کی حویلی کا کھنڈر نظر آیا۔ اس کی زیادہ تر چھتیں بیٹھ چکی تھیں، دیواروں سے شہد کی مکھیوں کے بڑے بڑے چھتے لٹک رہے تھے اور صاف ظاہر ہو رہا تھا اب یہ کھنڈر چمگادڑ اور سانپوں کے مسکن بن چکے تھے۔ خود اصطبل جو میدان کے ایک کنارے اپنے بچے کھچے ستونوں پر کھڑا تھا نصف سے زیادہ زمیں بوس ہو چکا تھا۔ اس کی منہدم شدہ دیواروں پر گھاس اگی ہوئی تھی، اینٹوں سے طفیلی پودے نکل آئے تھے جن میں سے کئی کافی تناور درخت کی شکل اختیار کر چکے تھے جب کہ سیڑھیوں اور ناندوں پر جن سے کبھی گھوڑے پانی پیا کرتے ہوں گے اونٹ کٹاروں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ میدان میں بکریاں اور بھینسیں گھاس چر رہی تھیں اور دھوبی رسیوں پر کپڑے سکھا رہے تھے۔ وہ حویلی کے اندر گیا تو اس نے دیکھا اس کی دیواروں اور ستونوں پر مقامی لوگوں نے پتھر سے کھرچ کھرچ کر فحش تصویریں بنا رکھی تھیں بلکہ ایک جگہ تو اسے فرش پر ایک مانع حمل کی تھیلی بھی نظر آئی جس سے پتہ چل رہا تھا کہ آس پاس کی

طوائفیں اپنے گاہکوں کے ساتھ یہاں آیا کرتی ہوں گی یا پھر لڑکے گاؤں کی لڑکیوں کو ورغلا کر یہاں لایا کرتے ہوں گے۔ بڈھا جانے کس زمانے کی بات کر رہا تھا، دسکو نے سوچا۔ اچھا ہوا جو میں صندوقچی کے ساتھ نہیں آیا ورنہ مقامی لوگ جانے کیا سوچتے!

اس نے جب اپنی بیوی کو یہ بات بتائی تو اس نے مشورہ دیا کہ وہ نعل سے بھری صندوقچی نالے میں پھینک آئے۔ 'تم خود یہ کام کیوں نہیں کر لیتی؟' دسکو نے کہا۔ 'تم تینوں ماں بیٹیاں اسے اٹھا کر کہیں پھینک کیوں نہیں آتیں؟ یا شاید کوئی لوہار انھیں خرید لے اور تمھیں کچھ پیسے مل جائیں۔'

مگر اس کی بیوی کو ورکشاپ میں داخل ہونے کی ہمت نہ تھی۔ اس نے چپی سادھ لی۔ شاید اب بوڑھے کو بھی تشفی ہو گئی تھی کیونکہ اب اس نے انھیں پریشان کرنا بند کر دیا تھا۔ اسی درمیان دسکو نے کئی اچھی چوریاں کیں۔ اب اسے پھلندر کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ خود اس کام میں ماہر ہو گیا تھا۔ ایک اچھی بات یہ ہو گئی تھی کہ دیودت کا تبادلہ کسی دوسرے تھانے میں ہو گیا تھا۔ شروع شروع میں اسے دیودت کے بغیر بڑی راحت کا احساس ہوا جیسے وہ ایک لمبی قید سے آزاد ہو گیا ہو مگر پھر اسے اس کی یاد ستانے لگی۔ آخر کار ایک دن اس نے اسے ایک دور کے تھانے میں ڈھونڈ ہی نکالا۔

'کیسے ہو لڑکے؟' دیودت تھانے کے کنویں پر اپنا لنگوٹ دھو رہا تھا۔ اس کی گل موچھوں کے بال سفید ہونے لگے تھے اور آدھا سر گنجا ہو جانے کے سبب وہ کافی صحتمند نظر آ رہا تھا۔ لنگوٹ تھانے کی چار دیواری پر پھیلا کر وہ اسے بارک کے اندر لے گیا۔ 'میرے بغیر کہیں تم سدھر تو نہیں گئے ہو؟' اس نے دسکو کے لئے کانچ کے گلاس میں رم انڈیلتے ہوئے کہا۔ 'اگر کسی پریشانی میں پڑ گئے تو مجھے بتانا۔ میرے بہت سارے ساتھی اب بھی پرانے تھانے میں موجود ہیں۔'

'تمہارے بغیر میں کسی پریشانی میں کیسے پڑ سکتا ہوں۔' دسکو نے رم کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ 'لیکن تمہارا یہاں کام کیا ہے؟'

'بس بیٹھے بیٹھے یاد تا رہتا ہوں۔' دیودت ہنسا۔ 'ہر تھانے میں تمہارے جیسے چور کہاں ملتے ہیں۔'

اس رات وہ شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرا کیا۔ جاڑا آ چکا تھا جس کے سبب لوگ گھروں

کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے سونے لگے تھے۔ صبح وہ خالی ہاتھ گھر لوٹا تو اس نے دروازے پر تالا جھولتے دیکھا۔ اس کے سسر کا انگریزوں کے زمانے کا ریلوے کوارٹر تھوڑی ہی دوری پر واقع تھا۔ اس کی بیوی اور بچوں نے اسے دیکھتے ہی گھیر لیا۔ 'اب میں اس گھر میں اس وقت تک نہیں جاسکتی جب تک تم اپنے باپ کے کارخانے سے نجات نہیں حاصل کر لیتے۔' اس کی بیوی نے کہا۔ 'آخر بات کیا ہے؟' اس نے جھنجلا کر پوچھا۔ 'کیا پھر سے بوڑھے نے پریشان کیا؟' 'تو کیا میری مت ماری گئی ہے کہ اپنا گھر چھوڑ کر کسی کنکھجورے کی طرح اس سرکاری کھنڈر میں رہنے چلی آؤں۔ تم خود جا کر کیوں نہیں دیکھتے؟'

اپنے بیوی بچوں کے ساتھ وہ گھر لوٹا تو اس کی نظر اس چیز پر پڑی جس پر پہلی بار کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ اس کے باورچی خانے کا سارا چھپر نعلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ خود لوہے کی خالی صندوقچی باورچی خانے کی کھڑکی کے باہر گندے پانی کے منحنی گڈھے کے کنارے الٹی پڑی تھی۔ 'یہ بوڑھے کا نہیں بلکہ کسی گاؤدی چور کا کارنامہ ہے۔' دسکو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ 'اس نے بکس چرانے کی کوشش کی ہوگی اور ان بیکار کی نعلوں کو دیکھ کر طیش میں آ کر انھیں چھپر پر پھینک کر بھاگ گیا ہوگا۔'

'بھلے آدمی، یہ ابا کی روح تھی، روح۔ وہ ساری رات چھپر پر نعل پھینکتے رہے۔ تم تو تھے نہیں، ہم نے اور بچیوں نے کتنے سورے پڑھے، کتنی دعائیں مانگیں، مگر بڈھے کو کون سمجھائے۔ وہ ساری رات گالیاں بکتے ہوئے چھپر پر نعل پھینکتے رہے۔ وہ تو خیر ہو ہمارے مرغے سلمان خان کا کہ اس نے بانگ دے کر انھیں بھاگنے پر مجبور کر دیا۔'

بیوی کی بات نے دسکو کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ اس نے چھپر پر چڑھ کر تمام نعل اکٹھا کئے اور انھیں ایک بورے میں بھر کر بڑے نالے کی پلیا کے نیچے چھپا آیا۔ چونکہ اسے ڈر تھا کہ اگر بوڑھے کی روح نے اس واقعے کو کسی دوسرے انداز سے لے لیا تو شاید وہ طوفان کھڑا کر دے اور اسے یہ نعل پھر سے واپس لانا پڑے اس نے خالی صندوقچی ورکشاپ کے اندر چھپا دی۔ 'تم ٹھیک کہتی تھی۔' اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ 'یہ مجھے پہلے ہی کر دینا چاہئے تھا۔ اب ہم آرام سے رہ سکتے ہیں۔'

'میں اس وقت تک یہاں نہیں آسکتی جب تک تم کارخانے کو یہاں سے ہٹا نہ دو۔ یوں بھی اب اس میں ٹن کی مورچہ کھائی ہوئی چادروں اور دیوار کے نام پر گھن کھائی ہوئی مٹی کے علاوہ رکھا کیا ہے؟ مجھے پورا یقین ہے بوڑھا دھونکنی کے اندر چھپا بیٹھا ہے۔ وہ وہیں سے باہر آتا ہے۔' پھر اس نے اپنے بڑے سے پیٹ کو جس کے اندر اس کا چوتھا بچہ پل رہا تھا دونوں ہاتوں سے تھام کر کہا۔ 'میں ایسے گھر میں بچہ نہیں جن سکتی جس پر بدروحوں کا سایہ ہو۔'

'اب میں کیا کرسکتا ہوں۔' دسکو تھک کر برامدے پر بیٹھ گیا۔ اسے اپنی بیوی پر غصہ آرہا تھا جو اس برے وقت میں اس کا ساتھ چھوڑ کر میکے جارہی تھی۔ بیوی کے جانے کے بعد وہ کئی دن تک گھر سے باہر نہ نکلا۔ آخر کار ایک دن نئے ارادے کے ساتھ اس نے اس مسئلے کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اس نے درگاہ سے پانی لاکر سارے گھر کا صحن اپنے ہاتوں سے دھویا، ورکشاپ کے ایک ایک سامان کی صفائی کی، مولوی صاحب کو بلا کر میلاد پڑھوائی، مدرسے کے بچوں کے ذریعے سات بار کلام پاک ختم کروایا، فقیروں کو کھانا کھلایا اور چراغی کے طور پر انھیں موٹی رقم عطا کی اور جب اسے پورا یقین ہوگیا کہ کارخانہ پوری طرح سے پاک ہو چکا ہے اس نے اپنی بیوی کو گھر لانے کی کوشش کی۔ اسے اس کی ان حرکتوں کی خبر مل چکی تھی۔ 'اگر بدروحوں سے اتنی آسانی سے نجات حاصل کی جاسکتی تو اتنے سارے مولوی مولانا کب کے بیکار ہو چکے ہوتے۔' اس کی بیوی بولی۔ 'میری سمجھ میں نہیں آتا اس کارخانے میں کیا رکھا ہے۔ تم اس سے پیچھا کیوں نہیں چھڑاتے؟'

'اگر میں نے ایسا کیا تو بڑھو میرے دادا کو جگا دیں گے۔ پھر معاملہ اور بھی بگڑ جائے گا۔ تم نہیں جانتیں وہ کتنے جلالی انسان تھے۔ گھوڑے تک انھیں دیکھتے ہی خود بخود اپنے کھر پیش کردیتے تھے۔ اور یقین کرو یہ افواہ نہیں تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے انھیں بقرعید کے دن محلے کی بڑی بڑی گایوں کو جن سے قصائی بھی ہار مان لیتے، پچھاڑتے دیکھا ہے۔'

'ٹھیک ہے۔ پھر تم اپنے گھر پر رہو، میں اپنے باپ کے گھر جاتی ہوں۔'

'تمھیں یہاں نہیں رہنا ہے نہ رہو۔' دسکو نے غصے سے چلا کر کہا۔ 'یہی ٹھیک رہے گا۔ تم اپنے باپ کے گھر پڑی رہو۔ تم بھی خوش اور بڑھو کی آتما بھی خوش۔'

اس دن وہ واپس گھر جانے کی بجائے سارا دن شہر میں آوارہ گردی کرتا پھرا۔ سورج

ڈوب رہا تھا جب اس نے طوائفوں کے محلے کا رخ کیا جہاں ایک ادھیڑ عمر کی طوائف کے ساتھ جس سے کنوارے پن کے دنوں سے اس کی شناسائی تھی اور جس نے مباشرت کے سارے طریقے اسے سکھائے تھے بہت دیر تک اپنا وقت خراب کیا۔ بعد میں اس نے شراب خانے کی راہ لی جہاں دیر رات تک وہ شراب پیتا رہا۔ آج وہ خود کو بالکل اکیلا محسوس کر رہا تھا اور اسے اپنے دوست پھلندر کی یاد آ رہی تھی۔ وہ لوگ اسی شراب خانے میں ملا کرتے تھے۔ وہ میز پر شراب کے گلاس کو دونوں ہاتوں سے تھامے سر جھکائے بیٹھا اسی کے بارے میں سوچ سوچ کر جذباتی ہو رہا تھا کہ ویٹر نے اس کی میز پر پانی کی بوتل رکھتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی 'وہ اوپر کے کمرے میں بیٹھا ہے۔'

'کون؟' ایک پل کے لئے وہ بھول گیا کہ ویٹر پھلندر کے بارے میں بتا رہا تھا۔

'تمہارا دوست، اور کون۔' ویٹر نے جواب دیا۔ 'وہ جیل سے باہر آ چکا ہے نا۔'

دسکولڑ کھڑاتا ہوا اوپر پہنچا۔ مگر پھلندر جا چکا تھا۔ اس نے میز پر اپنی بیئر کی بوتل آدھی خالی چھوڑ دی تھی۔ شاید اس نے اسے دیکھ لیا تھا اور اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ گھر پہنچا تو بری طرح نشے میں تھا۔ دروازہ کھولنے کے بعد اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس نے چابی تالے کے سوراخ میں ہی چھوڑ دی تھی۔ بستر پر گرتے ہی اسے گہری نیند آ گئی۔ اس نے خواب میں دیکھا وہ اور پھلندر چوری کے سامان بغل میں دبائے ایک پرانی سرکاری عمارت کی چھت پر کھڑے تھے جہاں سے پھلندر اسے نیچے کودنے کی ہدایت دے رہا تھا۔

'میں کہاں کودوں؟' وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ 'یہاں پر کوئی زمین تو ہے ہی نہیں۔'

جانے کیا وقت ہو رہا ہوگا جب پیشاب کے دباؤ سے اس کی نیند کھل گئی۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ باہر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی جس میں کچھ لوگ کھڑے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ باہر آیا تو اسے آنگن میں تین سفید گھوڑے نظر آئے جن کے پاس کچھ انسانی ہیولے کھڑے تھے۔ ابھی وہ ان لوگوں کو سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ ورکشاپ نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی جس میں تیز روشنی ہو رہی تھی۔ کوٹھری کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے دھونکنی کے چلنے کی تیز آواز آ رہی تھی۔ وہ کوٹھری کے دروازے پر پہنچا تو اس نے دیکھا ایک شخص بھٹی پر جھکا ہوا ایک سرخ نعل کو زنبور کی مدد سے انگاروں پر الٹ پلٹ رہا تھا۔ دھونکنی خود بخود چل رہی تھی جیسے اس

پر کسی بدروح کا قبضہ ہو۔ اس کی آہٹ پر اس شخص نے سر اٹھا کر دیکھا۔

'دمسکو، تم صحیح وقت پر آئے ہو۔' یہ اس کا افیمچی باپ تھا، بالکل چنگا اور چست جیسے اسے اس کے حصے کی افیم مل گئی ہو۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اب اس کے سارے دانت بھی واپس آ گئے تھے جو موتی کی طرح چمک رہے تھے۔ 'تم لوگ اسے دیکھ رہے ہو۔' بوڑھے نے باہر لوگوں کی گڈ مڈ ہوتی پرچھائیوں کو مخاطب کیا جو آپس میں کھلکھلا کر ہنس رہے تھے سرگوشیاں کر رہے تھے، اندر کا نظارا دیکھنے کے لئے ایک دوسرے پر گرے جا رہے تھے۔ 'یہ میرا بیٹا ہے دمسکو۔ بہت دم ہے اس میں۔ لیکن اسے ہر گدھے کی طرح آسان کام کرنے کی لت ہے۔ کیا تم لوگ اسے میرے لئے پکڑ سکتے ہو؟ مجھے اس کا علاج کرنا ہے۔'

ابھی دمسکو کچھ سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ چار مضبوط ہاتوں نے اسے جکڑ لیا اور برامدے پر لا کر چاروں خانے چت لٹا دیا۔ وہ لوگ اسے زمین پر جکڑے ہوئے کھلکھلا کر ہنس رہے تھے جب کہ آزاد ہونے کے لئے وہ غراتے ہوئے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ وہ تقریباً خود کو آزاد کر چکا تھا جب اس کے چہرے پر پانی کا زوردار چھپاکہ پڑا اور اس کی آنکھوں میں تارے ناچ اٹھے۔ وہ واپس دیکھنے کے قابل ہوا تو اسے اپنے چہرے کی جلد پر تیز آنچ کا احساس ہوا۔ اس نے پلکوں کو جھپکتے ہوئے دیکھا زنبور کی نوکوں میں پھنسی لوہے کی ایک گرم نعل کا نیم ہالہ اپنی غیض بھری سرخی کے ساتھ اس کے چہرے سے چھ انچ کے فاصلے پر تمتما رہا تھا جس کے پیچھے اس کے باپ کی سرخ آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ زنبور کے دباؤ سے چنگاریاں نعل سے اڑ اڑ کر بوڑھے کی داڑھی پر گر رہی تھیں۔ 'تمہیں یاد ہے دمسکو، میں نے کیا کہا تھا تم سے؟ مگر تم نے چوری بند نہیں کی۔ تو میں کیا کرتا اگر لوٹ کر نہ آتا۔ تمہیں تو پتہ ہے ایک روح کو اس دنیا میں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔'

//////

پھلندر بستر پر ننگا لیٹا ہوا تھا جب خوشبو نے اندھیرے میں ہات بڑھا کر اسکے چہرے کو اپنی مسالے کی مہک سے تر اور انگلیوں سے سہلاتے ہوئے کہا، 'تمہارے دوست کا کیا حال ہے؟ میں تم دونوں کو کبھی ساتھ نہیں دیکھتی؟'

'اس نے میرا دل توڑا ہے۔' پھلندر نے اس کا ہات چہرے سے جھٹک دیا۔ شہوانی

خواہش کے مٹتے ہی اسے ہمیشہ اپنی بہن کے بھدے جسم سے نفرت ہو جاتی۔ 'تمہیں پتہ ہے، وہ ایک بار بھی مجھ سے ملنے جیل نہیں آیا۔'

'اس میں اس بے چارے کا کیا قصور۔' خوشبو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے انگڑائی لے کر اپنا ہات برا کی طرف بڑھایا جو تکیہ پر پڑا تھا۔ اس کے دونوں ننگے پستان پسینہ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ 'تمہیں ایک بار اس سے ملنا چاہئے۔' برا پہنتے پہنتے اس نے ہنس کر اس کی طرف دیکھا اور اپنے دونوں ہات پیچھے لے جا کر ہک لگاتے ہوئے بولی۔ 'تمہیں اس سے مل کر یقین نہیں آئے گا۔ تمہارا دوست اب ایک دیکھنے کی چیز ہے۔'

پھلندر اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ خوشبو کے جانے کے بعد وہ دیر تک اندھیرے میں بیٹھا دیوار کو گھورتا رہا۔

//////

دمسکو کا گھر ہمیشہ کی طرح اپنی جگہ موجود تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ آج نہ صرف اس کا لوہے کا پھاٹک پاٹوں پاٹ کھلا ہوا تھا بلکہ آنگن میں دو گھوڑے بھی کھڑے تھے جن کے سائیس زمین پر بیٹھے بیڑی پی رہے تھے۔ اسے ورکشاپ کے اندر دمسکو نظر آیا۔ وہ سر پر ایک صافہ باندھے بھٹی کے سامنے بیٹھا دھونکنی کی زنجیر کھینچ رہا تھا اور چمٹے کی مدد سے کوئلے پر گرم ہوتی ہوئی نعل کو الٹ پلٹ رہا تھا۔ اس کے گال پر ہلکی ہلکی گھنگریالی داڑھی اگ آئی تھی جو پھلندر کے لئے بالکل نئی چیز تھی جس کے سبب دمسکو کا چہرا کافی بڑا ہو گیا تھا۔ پھلندر کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔ اس نے زنجیر چھوڑ دی، لوہے کی صندوقچی کا ڈھکن بند کر دیا جس میں پرانی نعلیں بھری ہوئی تھیں اور پھلندر کی طرف لوہے کا ایک اسٹول کھسکاتے ہوئے کہا۔ 'کیا دیکھ رہے ہو پھلندر؟ شاید تم حیران ہو کہ میں اپنے باپ دادا کے دھندے میں پھر سے کیسے واپس آ گیا؟'

پھلندر اسٹول پر بیٹھا اس کی طرف ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس آدمی سے زندگی میں پہلی بار مل رہا ہو۔

'تو چلو تمہاری پریشانی دور کئے دیتے ہیں۔' دمسکو ہنسا اور اس نے ایک جھٹکے سے اپنے سر سے صافہ اتار دیا۔ پھلندر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ دمسکو کی پیشانی پر نعل کا ایک زبردست نشان ابھرا ہوا تھا جس کا کھلا ہوا سرا نیچے ابروؤں کی طرف تھا۔ 'نعل

کا یہ نشان دیکھ رہے ہو۔' ڈمسکو نے ابھرے ہوئے نشان پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔' ایسا نشان تم نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ تم ہی بتاؤ کیا اس نشانی کے ساتھ اب میں تمہارے دھندے میں شامل ہو سکتا ہوں؟ کیا اس دنیا میں میرے پاس اب چھپنے کے لئے کوئی جگہ ہے؟ وہ لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ وہ اپنی آنے والی نسلوں کا اسی طرح خیال رکھتے ہیں۔ وہ پہلے تو تمہیں آگاہ کرتے ہیں، سمجھاتے ہیں اور جب تم نہیں سمجھتے تو تمہیں اپنے طریقے سے سیدھے راستے پر لاتے ہیں۔ اب مجھ سے یہ مت پوچھنا یہ نشان کیسے بنا ورنہ میں وہ کہانی سنانے پر مجبور ہو جاؤں گا جس پر تم کبھی یقین نہیں کرنا چاہو گے۔ تمہارے لئے بس اتنا جاننا کافی ہے کہ اس نے مجھے انسان بنا دیا۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔'

☆☆

غلط ہڈی

ہوسکتا ہے یہ ہڈی بالکل صحیح ہو، صرف ہم انسان غلط ہوں۔

سلیم چائنا

ایک شخص نے ایک دن خودکشی کرنے کی ٹھانی اور پھر اس سے ڈر کر دوبارا زندہ رہنے کا فیصلہ کرلیا۔

بعد میں اسے پتہ چلا کہ اس کے اس عمل سے اس کی زندگی کا سارا مقصد ہی فوت ہو چکا تھا۔

یہ کہانی دراصل سلیم چائنا کی ہے جو اب ہمارے شہر میں نہیں رہتا۔ لیکن یہ اس قابل ہے کہ اسے قلمبند کی جائے۔

سلیم چائنا کو سلیم چائنا بننے میں پینتیس برس لگے۔ اس سے قبل وہ ایک چپٹی ناک والا کم گو اور سرسری سا انسان تھا جو کسی بھی معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کا اہل نہ تھا۔ شاید اسی لئے وہ جس گھر کا پروردہ تھا اس کے لوگوں نے اس کے سلسلے میں بہت اونچے خواب نہیں دیکھے تھے۔ شاید یہ کہنا درست ہوگا کہ انھوں نے اس کے توسط سے کوئی خواب ہی نہیں دیکھا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ انھیں سلیم چائنا سے کسی طرح کی امیدیں نہیں تھیں، مگر جانے کیوں سلیم چائنا تک پہنچتے پہنچتے ان ساری امیدوں پر پانی پھر جاتا اور وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر سوچتے: "سلیم چائنا، جانے کیا معاملہ ہے۔ وہ بس کسی طرح اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔ صرف اس بات کو سوچتے ڈر لگتا ہے کہ اس کی ریڑھ کی ایک ہڈی غلط ہے۔"

اس غلط ہڈی کا علم سلیم چائنا کو بھی تھا۔ شاید اسی لئے وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے خود کو تنہا محسوس کرتا جیسے اس ہڈی نے اسے ایک خاص ہستی میں بدل دیا ہو جو کسی دوسرے سیارے سے وارد ہوا ہو۔ زیادہ تر وہ کوئی پرانی عمارت ڈھونڈ نکالتا اور اس کے متروک زینے پر بیٹھ کر فرش کی دراڑوں سے نکلی ہوئی مردہ گھاس کے تنکوں کو دانتوں سے نوچتے ہوئے سوچا کرتا، آسمان، اگر وہ کچھ نہیں ہے تو ہمیں کس بات کا ڈر ہے اور میری غلط ہڈی سے کسی کو خوفزدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے جب کہ یہ ہڈی ان کی پیٹھ پر نہیں لگی ہے؟

اس کی اس ہڈی کا پتہ اس کے گھر والوں کو اس وقت چلا جب اسکول میں ایک پرانے خیال کے کٹر استاد نے جو شیروانی اور پھدنے دار ترکی ٹوپی پہننے کا عادی تھا اور قوم وملت کا درد جس کے اندر بھرا پڑا تھا اور آزادی کے فوراً بعد جنھوں نے پاکستان ہجرت کرنے میں اپنی عافیت سمجھی تھی، اس کی پیٹھ پر بے دردی سے نیم کی ٹہنی کا استعمال کیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ بعد میں ڈاکٹر نے ایکسرے پلیٹ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ''یہ اس چابک کا اثر نہیں ہے۔ اس کے لئے آپ اس بیچارے استاد کو مجرم نہیں قرار دے سکتے۔ دراصل قدرت نے شروع سے ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی پر ایک غلط ہڈی لگا دی ہے جس کے سبب اس کی پوری ریڑھ کی ہڈی دھیرے دھیرے ایک ٹہنی کی طرح سوکھ جائے گی۔ ہوسکتا ہے یہ ایک سال کے اندر ہو، ہوسکتا ہے برسوں لگ جائے۔ ہوسکتا ہے یہ کبھی نہ ہو اور وہ اسی طرح اسے اپنی قبر تک لے جائے۔''

''اس کا کوئی علاج؟''

''سچ پوچھو تو اس کا علاج صرف مریض کے پاس ہے۔'' باضمیر ڈاکٹر نے اس کے معاملے سے دستبردار ہوتے ہوئے کہا۔ ''باقی سب کچھ دل بہلاوا ہے۔ یوں سمجھ لو یہ ایکسرے پلیٹ علم طب کی آخری حد ہے جس کے اس پار مریض کو اس غلط ہڈی کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔ اور یہ اتنا مشکل بھی نہیں۔ قدرت کا کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اس کا اپنا ایک خاص نظام ہے جسے ہم انسان سمجھنے سے معذور ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ غلط ہڈی کچھ بھی نہ ثابت ہو۔ یا ہوسکتا ہے دوسری ہڈیوں کی صحبت میں یہ ہڈی بھی غلط نہ رہے، یا اچانک اس کی غلطی درست ہو جائے۔ یا پھر، جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، اس ایک ہڈی کی بدولت اس کی پوری ریڑھ کی ہڈی ہی سوکھ جائے جس طرح ایک گندی مچھلی پورے تالاب کو گندا کر دیتی ہے۔''

ایسا نہیں کہ اس کے بعد سلیم چائنا کے والدین نے دوسرے ڈاکٹروں سے رجوع نہ کیا ہو۔ بچپن سے لے کر لڑکپن تک سلیم چائنا کو ڈاکٹروں کی ایک لمبی قطار سے گذرنا پڑا، اسے ہر طرح کی مشینوں کے نیچے، کبھی ننگا کبھی کپڑوں کے ساتھ لیٹنا پڑا، کھڑا ہونا پڑا۔ اس پر کئی مشینی اور کئی بغیر مشین کی ورزشیں نیز انواع واقسام کی مالشیں انجیکشن اور دوائیاں آزمائی گئیں، مگر آخر میں ساری انسانی تدبیریں بیکار ثابت ہوئیں، یا پھر یوں کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ ساری مشینیں اور انسانی تدبیریں تو اپنی جگہ درست تھیں، مگر سلیم چائنا کی ہڈی غلط کی غلط رہی۔

بعد میں جب سلیم چائنا کے وقت بے وقت بے ہوش ہونے کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کا الزام بھی اس ہڈی کے سر ڈال دیا گیا۔

خود سلیم چائنا کو یہ ہڈی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ جب وہ نہانے کے لئے کپڑے اتارتا، یا جب بنیان بدلتا تو اپنا داہنا یا بایاں ہاتھ پیچھے لے جا کر اس غلط ہڈی کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا جو کبھی اس کے ہاتھ نہ آیا۔ اسے علم نہ تھا کہ یہ غلط ہڈی کس جگہ لگی ہوئی تھی، کہ کیا اسے ٹٹول کر دیکھنا ممکن بھی تھا؟ اسے کیا، کسی کو بھی علم نہ تھا کہ وہ ہڈی کہاں پر تھی۔

تھک کر وہ کپڑے پہن لیتا اور اپنا سر ایک طرف لٹکا کر سوچتا: ہوسکتا ہے یہ ہڈی بالکل صحیح ہو، صرف ہم انسان غلط ہوں۔

سلیم چائنا ذہین طالب علم نہ تھا۔ نچلے درجوں میں اسے استادوں کی ہر طرح کی سزاؤں سے گذرنا پڑا جب کہ اوپر کے درجوں میں اسے کسی نے اچھے نمبر نہیں دیے۔ شاید اس کے استاد سالوں سال اسے دیکھتے دیکھتے تنگ آچکے تھے اور اس طرح اس سے انتقام لے رہے ہوں۔ یوں وہ کبھی فیل نہ ہوا مگر زیادہ تر امتحان سے پہلے یا اس کے دوران وہ بیمار پڑ جاتا اور اسے اگلے سال تک کے لئے کلاس میں روک دیا جاتا اور کبھی کبھی یہ اگلا سال کئی سالوں تک چلتا رہتا۔ تو وہ جیسے جیسے پڑھائی مکمل کرتا گیا لوگوں کو، خاص طور پر اس کے استادوں کو یہ یقین ہوتا گیا کہ وہ پڑھ لکھ کر آخر کار صرف پڑھا لکھا رہ جائے گا، یہ پڑھائی اس کے کسی کام نہیں آئے گی۔

سلیم چائنا کو بہت افسوس ہوتا جب وہ جی لگا کر محنت کرتا، مگر غلط ہڈی کے زیر اثر باتیں اس کے دماغ کے اندر جتنی تیزی سے داخل ہوتیں اس سے زیادہ تیزی سے باہر نکل جاتیں۔

تو اس کے گھر والوں نے اسے گھر میں بہت کنارے کا ایک کمرا دیا جہاں کرایہ داروں

کے لئے کھپریل کے چھپر والے کمرے بنے تھے اور ان لمحوں کو چھوڑ کر جب بھوک اسے باورچی خانے کی طرف لے آتی، ایک طرح سے وہ لوگ اسے بھول گئے۔ اس کے ماں باپ کی اور بھی اولادیں تھیں۔ اس کے علاوہ دادا، دادی، چچا چچی، پھوپھا پھوپھی اور بھی بہت سارے قریب و دور کے رشتے دار تھے۔ یہ کنبہ چینیوں کے کنبوں کی طرح کافی پھیلا ہوا تھا، انھیں (اور سلیم چائنا کو یہ کبھی سمجھ میں نہیں آتا کہ جب گھر کے لوگ 'انھیں' کہتے تو اس سے ان کا مطلب کن کی طرف تھا) ان سب کے بارے میں سوچنا پڑتا تھا۔ اسی لئے کئی کوششوں کے بعد آخر کار اس نے جب کالج کا امتحان پاس کرلیا تو اور پینتیس سالہ سلیم چائنا نے یہ بات ماں کو بتائی، جو واحد ہستی تھی جو اس کی باتیں خاموشی سے سنا کرتی، تو وہ دیر تک اس کی طرف حسرت کے ساتھ دیکھا کی۔

''کیا یہ ضروری تھا؟'' اس نے صرف اتنا کہا۔

سلیم چائنا کو پہلے تو اپنی ماں کا ردِ عمل سمجھ میں نہیں آیا، پھر اس نے اپنے کمرے میں بستر پر بیٹھ کر اپنی دونوں کہنیاں گھٹنوں پر ٹکادیں اور ہتھیلیوں کی پیالی پر اپنے گال رکھ کر کھلے دروازے سے باہر برامدے کی طرف تاکنے لگا جس پر نظر آنے والے درختوں کے سائے سرسرا رہے تھے۔

جانے کب یہ سائے غائب ہوگئے اور برامدہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔

//////

آسمان پر چاند نکل آیا اور برامدہ روشن ہو اٹھا۔

چاند نے دیکھا سلیم چائنا اسی طرح ہتھیلیوں پر چہرا رکھے ہوئے بیٹھا تھا۔ مگر وہ انسان کی بجائے ایک سایہ نظر آرہا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ ایک دوسرا انسانی سایہ کمرے کے اندر داخل ہو رہا تھا۔

سائے نے رک کر سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کمرا روشنی میں نہا اٹھا۔

یہ ایک اجنبی تھا، لانبا، ہٹا کٹا، جڑی ہوئی بھوؤں والا جس کی آنکھوں کے گڑھے سائے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس کی انگلیاں انگوٹھیوں سے جگمگا رہی تھیں اور وہ مسکرائے جا رہا تھا جیسے یہ سلسلہ تا قیامت ختم ہونے والا نہیں۔ رہ رہ کر یہ مسکراہٹ اس کے دونوں کانوں تک کھنچ جاتی۔ مگر یہ مسکراہٹ سلیم چائنا کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی، شاید اس لئے کہ اس مسکراہٹ کا اس آدمی کی آنکھوں سے کوئی تعلق نظر نہیں آرہا تھا۔

''مبارک ہو!'' اس نے سلیم چائنا سے کہا۔

سلیم چائنا اس طرح مخاطب کئے جانے پر حیران تو ہوا، مگر اس کا مبارکباد دینا اسے اچھا لگا۔

''شکریہ، اور میری پیٹھ پر ایک غلط ہڈی لگی ہے۔''

''میں اسی لئے تو آیا ہوں۔'' اجنبی ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''مجھے وہ جگہ دکھاؤ۔''

''مجھے اس جگہ کا علم نہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' اجنبی کرسی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

''کون ہو تم؟''

''کون ہوں میں؟'' اجنبی نے مڑ کر چونکتے ہوئے کہا۔ ''ارے ہاں کون ہوں میں۔ کبھی کبھار میں خود سے بھی یہی سوال کیا کرتا ہوں۔ مگر کیا یہ جاننا ضروری ہے؟ جب تم ایک غلط ہڈی کے ساتھ اتنی لمبی عمر گذار سکتے ہو تو ایک غلط آدمی کے ساتھ کچھ دیر رہنا تمہارے لئے ناممکن تو نہیں! پھر 'کون ہوں میں' کی کیا ضرورت ہے؟''

''مجھ سے زیادہ تر لوگ کتراتے ہیں۔'' سلیم چائنا نے کہا۔ ''ان کا خیال ہے اس غلط ہڈی کے سبب میں اب کسی کام کے لائق نہیں رہا۔''

''اور تمہارا کیا خیال ہے؟'' اجنبی نے پوچھا۔

''میرا بھی کچھ ایسا ہی خیال ہے۔ اب دیکھئے، میں نے آج ہی بی اے کا امتحان پاس کیا ہے، مگر ابھی سے ایک ڈر میرے دل میں بس گیا ہے کہ کہیں لوگ میرا مذاق نہ اڑانے لگیں، کیونکہ یہ میری تیسری کوشش تھی تب جا کر میں کامیاب ہوا۔''

''ارے نہیں۔'' اجنبی دوبارا کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ ''یہ غلط ہڈی تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔ اس نے تو کسی بھی طرح سے تمہارے راستے میں رکاوٹیں نہیں ڈالی ہیں۔''

''پھر لوگ جو اس طرح سے پیش آتے ہیں؟''

''اس دنیا میں تو یہی مشکل ہے۔'' اجنبی نے کہا۔ ''ہم ساری زندگی دوسروں کی سوچ تلے دبے رہتے ہیں۔ ہماری زندگی کے سارے معاملات دوسروں کی آنکھیں طے کرتی ہیں۔ ہم سے ایک چھوٹی سی غلطی ہو جاتی ہے اور اس کا ڈھنڈورا ہم خود ہی پیٹنے لگتے ہیں۔ لوگوں کو تو بعد میں

پتہ چلتا ہے اور جب انھیں پتہ چلتا ہے تو قصے کہانیوں کا دور چل نکلتا ہے۔''

''قصے کہانیوں کا دور؟''

''ہاں۔'' اجنبی نے جواب دیا۔ ''اچانک تمہارے سلسلے میں بہت سی باتیں لوگوں کو نظر آنے لگتی ہیں، وہ تو وہ ساری باتیں تک سوچ لیتے ہیں جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہوتا۔ ہوا سرگوشی کرتی ہے، سائے سرسراتے ہیں، کیڑوں کی مہک دور تک پھیل جاتی ہے اور ہر غلط چیز میں انسان کا یقین پختہ ہوتا چلا جاتا ہے اور تم... تم خود بھی اپنے خلاف اس سوچ میں شامل ہو جاتے ہو۔''

''پھر اس غلط ہڈی کا مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''تمہیں یہ شہر چھوڑ کر ایسی جگہ چلا جانا چاہیے جہاں لوگوں کو تمہاری اس غلط ہڈی کا علم نہ ہو۔ خود تمہیں اسے بھولنا ہوگی۔''

''میرا اسے بھولنا ناممکن ہے۔'' سلیم چائنا نے بے بسی کے ساتھ کہا۔ ''کبھی کبھی جب یہ ہڈی مجھے یاد نہیں رہتی تو میں خود کو بالکل خالی محسوس کرتا ہوں، جیسے میں اپنے اندر کہیں پر موجود ہی نہیں ہوں، یا پھر جیسے میری سب سے اہم چیز مجھ سے کھو گئی ہو۔''

''تمہارا مطلب خدا سے تو نہیں، کہیں تم نے اسے کھو تو نہیں دیا ہے، ویسے وہ جو چیز بھی ہو، تمہیں اسے بھولنا ہوگا۔'' اجنبی نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اسے دباتے ہوئے کہا۔ ''اور تمہیں یہ شہر چھوڑنا ہوگا اور یاد رکھو تمہیں اس شہر کو چھوڑ جانے پر کسی طرح کی ندامت کا احساس نہیں ہونا چاہیے۔ اس شہر کے لوگوں نے تمہیں بہت پہلے چھوڑ دیا ہے۔''

اپنی پیشانی پر اجنبی کی ٹھنڈی انگلیوں کے دباؤ سے سلیم چائنا کے پپوٹے بوجھل ہونے لگے اور وہ اپنے گھٹنوں کو سینے سے ٹکائے گہری نیند سو گیا۔ اس وقت اسے دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بچہ اپنی ماں کی بچہ دانی میں سو رہا ہو۔

//////

جانے وہ کتنی دیر بستر پر اس حالت میں گہری نیند سوتا رہا۔

آنکھیں کھلیں تو آدھی رات ہو چکی تھی۔

چاند باہر پیڑ میں اتر چکا تھا اور اس کے پتوں ٹہنیوں کے سبب کٹا چھٹا نظر آ رہا تھا۔

اس نے اپنے سوٹ کیس میں کپڑے سجائے، قلم کا پیاں رکھیں، اور بھی دوسرے

ضروری اور غیر ضروری سامان ڈالے اور اپنے کمرے سے دبے پاؤں باہر نکل آیا۔

اس کے باپ نے کھڑکی سے چاند کی روشنی میں اسے سوٹ کیس کے ساتھ گھر سے باہر جاتے دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اپنی بیوی سے کہا۔ ''سلیم چائنا گھر سے جا رہا ہے۔''

''اللہ اس کی حفاظت کرے۔'' اس کی ماں بولی اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ کر گہری نیند سو گئے۔

خدا کا بھیجا ہوا پرندا

یہ پرانا اسٹیشن جس کی محرابوں سے آج بھی چمگادڑیں لٹکتی ہیں، میں نے ہمیشہ اس کے باہر سن رسیدہ بدھ رام کو اپنا انتظار کرتے پایا ہے۔ مگر اس سے پہلے میں آپ کو اس شہر میں آنے کا مقصد بتا دوں۔

پچیس برس پہلے میرے دادا جان اس اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر فسادیوں کے ذریعے مار ڈالے گئے۔ یہ میری پیدائش سے قبل کا واقعہ تھا، مگر ہوش سنبھالتے ہی ایک دن میرے ہاتھ میں دادا جان کی جیبی گھڑی آگئی اور ساتھ ہی ان کی ذاتی نوٹ بک بھی جو الماری میں مذہبی کتابوں کی بھیڑ میں دفن تھی۔ یہ نوٹ بک انھیں خاصی عزیز رہی ہوگی کیونکہ انھوں نے گھڑیال کے جس چمڑے سے اس کی جلد کروائی تھی وہ چمڑا اپنے سفر کے دوران انھیں کن حالات میں حاصل ہوا تھا اس کا ذکر اس نوٹ بک میں خاص طور پر درج تھا۔ دوسری طرف یہ گھڑی ان کی جیب سے برآمد ہوئی تھی جب ان کا جلا ہوا جسم پلیٹ فارم سے اٹھایا گیا۔ دراصل ان کے جھلسے ہوئے جسم کے سبب ان کی پہچان ممکن نہ ہوتی اگر ان کی شناخت اسی گھڑی کے ذریعے نہ کی گئی ہوتی جو ان دنوں ٹرین کے کنڈکٹر اپنے بٹن کے سوراخ سے لٹکائے رکھتے، یہ اور بات تھی کہ میرے دادا ٹرین میں ڈرائیور تھے۔ اس جیبی گھڑی کی زنجیر سلامت تھی جس کے ایک سرے سے اس کی پیتل کی ننھی چابی لگی ہوئی تھی۔ اس کا شیشہ پگھل کر ڈائل کے ساتھ چپک گیا تھا جس میں اب رومن کا صرف سات کا ہندسہ بچا تھا جس سے جانے کیوں میں نے یہ نتیجہ نکال لیا تھا کہ یہ واقعہ دن یا رات کے سات بجے پیش آیا ہوگا، جب کہ یہ صحیح مفروضہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ گھڑی کا ڈھکن کھولنے پر جواب صرف ایک کیل کے ذریعے گھڑی کے کیس کے ساتھ منسلک تھا مجھے

ادھڑے ہوئے ڈائل کے پیچھے پہیوں اور اسپرنگ کی ایک دنیا نظر آئی۔ اندر کی زیادہ تر پلیٹیں سلامت تھیں جن میں سب سے بڑی پلیٹ پر ''سوئزرلینڈ میں بنا'' لکھا ہوا تھا۔ اس وقت جب کہ میں کافی کمسن تھا اور ایک دوسرے شہر میں اپنے والدین کے ساتھ رہ رہا تھا جو میرا پیدائشی شہر بھی تھا، اسے اپنی مٹھی میں دبا کر مجھے ایسا لگا تھا جیسے یہ اب بھی گرم ہو گرچہ مجھے معلوم تھا یہ احساس سراسر نفسیاتی تھا۔ آج میں آنکھیں کھول کر دیکھتا ہوں تو میرے دادا جان، جن کی کوئی تصویر ہمارے گھر میں موجود نہیں، ان کے خط و خال میرے سامنے بالکل واضح اور صاف ہوتے جاتے ہیں جیسے یہ حال کا واقعہ ہو اور میں ان کی گود میں بیٹھا ہوا یہ شہر دیکھ رہا ہوں۔

//////

دادا جان جنھیں کتوں اور کمسن لڑکیوں سے پیار تھا، نماز کے لئے ان کا احترام لوگوں کی سمجھ سے باہر تھا گرچہ یہ انھیں آئے دن شراب نوشی کے اڈے کی طرف جانے سے نہیں روکتی تھی۔ انھوں نے اپنی پہلی شادی میں اس بات کو یقین بنانا چاہا کہ ان کی شریک حیات ان کے لئے کنواری ثابت ہو۔ اس رات انھوں نے اپنی دقیانوسی نوٹ بک میں لکھا، اگر میرے ساتھ دھوکہ نہیں کیا گیا ہے تو میرے ہونے والے بچے کا باپ اس کرۂ ارض پر کہیں بھٹک رہا ہوگا۔

سڑک پر کیروسین لیمپ کے رنگین شیشوں سے چھن چھن کر روشنی آ رہی تھی جس میں چلتے ہوئے وہ یہی سوچ رہے تھے کہ انھوں نے محسوس کیا کہ اب رات اور زیادہ گہری ہونے والی نہیں اور آخری دکانیں بس اپنے جھانپے گرانے ہی والی ہیں۔ تو انھوں نے ایک مٹھائی کی دکان کے سامنے رک کر اپنی کمسن بیوی کے لئے پیڑے خریدے، کیونکہ وہ حمل سے تھی اور ہمیشہ بھوکی نظر آتی تھی۔

'اسے دو آدمی کا کھانا چاہئے۔' اس نے بنگالی دکاندار کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ دکاندار ادھیڑ عمر کا تھا اور اپنی کافی بڑی توند پر ایک چرکٹ بنیان چڑھائے مٹھائی کے شوکیس کے پیچھے کھڑا کسی گاہک کی امید میں ایک بوڑھے انسان کے لئے بالکل بھی تیار نہ تھا۔ یوں بھی یہ اس کی رکھیل کا وقت تھا اور ڈھال میں اتر کر اسے کھیت کے کنارے دیسی شراب کے ٹھیکے پر ایک پاؤ لینا لازمی تھا۔

'آپ ان لوگوں کا پیٹ کبھی نہیں بھر سکتے۔' دکاندار ٹینڈر کے کھردرے کاغذ کے

ٹھونگے کے اندر پیڑے رکھتے ہوئے دادا کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ چھپر کے کنڈے سے لٹکتی لالٹین کی مدھم لو میں اس کا سیاہ جسم کافی کیم شحیم نظر آ رہا تھا۔ 'اگر انھیں بچہ دینا ہو تو آپ کبھی روک نہیں پائینگے۔'

'عورتوں کے سلسلے میں تمہارا رویہ صحتمند نہیں۔' دادا نے شوکیس کے شیشے پر پیسہ گنتے ہوئے کہا۔ شوکیس کے اندر جلتی موم بتی کی حرارت کے سبب سیشہ پر سبز پتنگے پڑے پڑے تپ رہے تھے۔ انھیں حلوائی کی بات سے تکلیف پہنچی تھی۔ 'تم شادی شدہ نہیں ہو سکتے'، وہ بڑبڑائے۔

'جب کہ میرے چھ بچے ہیں۔'

جس سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا، دادا ریلوے کی پٹریوں کو احتیاط سے پھلانگتے ہوئے سوچ رہے تھے کیونکہ ٹیوب لائٹس اونچے کھمبوں پر نصب ہونے کے سبب پٹریاں دھندلی لکیروں میں بدل گئی تھیں۔ ریلوے کے گدام کی چہار دیواری کے ساتھ بگلوں کی بیٹ سے سفید فلک بوس درختوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا جو چاندنی راتوں میں کافی پراسرار اور آس پاس کی چیزوں کے مقابلے زیادہ تاریک نظر آتے۔ راستے میں کہیں کہیں اینٹ کی کوئی دیوار نمودار ہو جاتی جس کے وہاں ہونے کے جواز کا پتہ لگانا مشکل تھا سوائے اس کے کہ اس جگہ سے نجاست کی وہ خاص بو آیا کرتی جس کا تعلق صرف ریلوے یارڈ سے ہوا کرتا ہے۔ دادا کو اپنا راستہ بخوبی معلوم تھا۔ بہت جلد وہ ریلوے کے کوارٹروں سے باہر نکل آئے

جہاں کھیتوں کے بیچ رہائشی گھروں کی زیادہ تر روشنیاں بجھ چکی تھیں اور کتے تک خاموش تھے۔ دن کے وقت ایسا لگتا جیسے اس جگہ سے آدھے کوس دور دادا کے گاؤں کی دیواروں تک یہ شہر اپنی غلاظت کے ساتھ کبھی بھی پہنچ نہ پائے گا۔ مگر قریب پہنچنے پر خود ان کا گاؤں بھی غلاظت کا ایک ڈھیر ہی ثابت ہوتا۔ مگر یہ غلاظت کا ڈھیر نہ تھا جب دادا نے اپنا گھر بنوایا تھا۔ دادا اس شہر کے نہیں تھے اور جب ریلوے کی نوکری کے سلسلے میں ان کا تبادلہ اس اسٹیشن پر ہوا تو سستی زمین اور سکون کی تلاش میں وہ اتنی دور آ گئے تھے جہاں کچھ سال پہلے تک گنے کے کھیتوں اور ناریل کے درختوں کے جھنڈ کے بیچ کنول کے پتوں سے ڈھکے ہوئے کئی تالاب تھے جن کے پانی پر کبھی دبیز کائی پر بطخ کے غول لکیریں کھینچتے نظر آتے اور طرح طرح کی لانبی چونچ والی خاکستری مائل چڑیاں مچھلیوں کی تلاش میں پانی کے اوپر اوپر منڈلایا کرتیں اور جب جوہڑ کے کنارے وہ

پانی میں اترتیں تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ کس طرح اتنی لمبی پتلی ٹانگوں کو جن کا گلابی رنگ حیران کن ہوتا، اور اڑتے وقت جنھیں وہ تیر کی طرح سیدھی رکھتیں، پانی میں اترتے ہی ان میں سے ایک ان کے پروں کے اندر غائب ہو جاتی۔ یہی وہ چیزیں تھیں جنھوں نے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ ان دنوں انھیں اس بات کی بالکل بھی خبر نہ تھی کہ اپنے شور اور غلاظت کے ساتھ اس جگہ تک پہنچنے کے لئے شہر کو صرف بیس برس لگیں گے اور زیادہ تر تالاب یا تو ڈھک دئے جائینگے یا کوڑے کے ڈھیر میں بدل جائینگے۔

'مجھے اور بھی زمینیں خرید کر رکھنی چاہئے تھیں۔' ایک دن انھوں نے اپنے دوست بدھ رام سے کہا جو سگنل مین کی ڈیوٹی سے ریٹائر تو ہو چکے تھے مگر اب بھی ہرے اور سرخ سگنل کے خواب دیکھنے سے باز نہ آتے۔ 'میں کبھی اچھا بزنس مین نہیں رہا۔ یہ تم نہیں سمجھ سکتے، ایک ایسا آدمی جو سگنل کی روشنیوں سے باہر کچھ سوچنے کی طاقت نہیں رکھتا۔'

شاید وہ ٹھیک کہہ رہے تھے کیونکہ بدھ رام کی ساری زندگی بیکار گئی تھی۔ وہ خاندانی ناستک تھے جنھوں نے حال ہی میں مسیحیت قبول کی تھی اور بڑے گرجا کے پادری کے حکم سے ان کے نام کے آخر میں ہربرٹ کا لقب چپکا دیا گیا تھا۔ مگر ان کے اس لقب سے کم لوگوں کو واقفیت تھی اور جنھیں واقفیت تھی انھوں نے اس پر یقین نہیں کیا تھا۔ خود انھیں لوگوں نے کبھی چرچ جاتے نہیں دیکھا تھا۔ آفس کے رجسٹروں میں وہ اب بھی بدھ رام ہی تھے۔ بدھ رام نے زندگی بھر اپنے رشتے داروں سے دور ریلوے کوارٹر میں مجرد کی زندگی گزاری اور ریٹائر ہونے کے بعد اب ایک کرایے کے گھر میں رہتے تھے جو دراصل ایک ریلوے کوارٹر ہی تھا مگر جس کے نام سے وہ الاٹ تھا اس شخص نے اسے کرایے پر دے رکھا تھا۔ انھیں اس کی پرواہ نہیں تھی کہ اس کے رشتے داروں نے کبھی ان کی کوئی خبر نہیں لی سوائے ان دنوں کے جب انھیں پیسے کی ضرورت ہو۔ شاید اس میں قصور ان ہی کا تھا۔ ان کے پاس ہر ضرورت مند کے لئے کچھ نہ کچھ رقم تیار رہتی تھی۔

'میں زندگی بھر ایک اچھا انسان رہا۔' بدھ رام نے اپنی کھینی کی ڈبیا نکالتے ہوئے کہا۔ 'اور میں نے دیکھا ہے، اس دنیا میں پانے کے لائق کچھ بھی نہیں ہے۔ اور وہ جنھوں نے بڑی بڑی حویلیاں کھڑی کیں اور کھیت اور باغات کے ڈھیر لگا دیے، مرنے کے بعد انھیں دو گز زمین پر قناعت کرنی پڑی۔ انھیں تین پشت سے زیادہ یاد بھی نہیں رکھا گیا۔'

'یہ ایک ہارے ہوئے انسان کی سوچ ہے۔' دادا سامنے ڈھلان کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں بچے ڈوبتے سورج کے نیچے المونیم کے پہیوں کے ساتھ بھاگتے ہوئے دس کا ہندسہ بنا رہے تھے۔ 'اگر تمہارے خیال سے میں ایک ایسا گھر چھوڑ کر جاؤنگا جس کی کسی کو ضرورت نہ ہوگی تو یہ تشفی میرے لئے کم نہیں کہ میرے لگائے ہوئے آم اور امرود کے پیڑ برسوں تک پھل دیتے رہینگے۔ اور اگر وہ پھل دینا بند بھی کر دیں تو بھی کٹھ بڑھئی اور گلہریاں اس میں پناہ تو لے ہی سکتی ہیں۔'

شاید دادا کو آنے والے دنوں کی آہٹ مل چکی تھی۔ انگریز ملک چھوڑ کر جا چکے تھے۔ مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی مشرقی پاکستان کا رخ کر چکی تھی۔ اب اس بستی میں چند ہی مسلمان رہ گئے تھے جو اب تک ان کی دو منزلہ عمارت سے آس لگائے بیٹھے تھے اور جب بھی شہر کے اندر فساد کا بازار گرم ہوتا پناہ لینے کے لئے اس کے اندر آ جاتے۔ انھیں اس بات کا دکھ تھا کہ صرف اس وجہ سے ان کے مکان کو پولس والے شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور آئے دن انھیں پاکستانی جاسوس ہونے کے الزام کا سامنا کرنے کے لئے تھانہ جانا پڑتا۔ انھیں پتہ تھا دیر سویر اس گھر کو بک جانا ہے۔ خود ان کے مکان کے چاروں طرف نچلی ذات کے ہندوؤں نے گھر بنا لیا تھا اور ایک ایسا شخص بھی تھا، جو کبھی اس کا نوکر رہ چکا تھا مگر اب سرکاری نوکری میں نچلی ذات والوں کو رزرویشن مل جانے کے سبب اس کے چاروں لڑکوں کو سرکاری نوکریاں مل گئی تھیں اور اب اس کے پاس اتنا پیسہ آ چکا تھا کہ وہ دادا کے گھر کو خریدنے کے بارے میں سوچ سکے۔

'مجھے تمہارا یہ نمک خوار پسند نہیں۔' بدھ رام نے ایک دن اپنی اکتاہٹ کا اظہار کیا۔ 'وہ کیسے کھلے عام تمہارے گھر کے بارے میں بات کر سکتا ہے۔'

'کیونکہ اسے پتہ ہے میرے مر جانے کے بعد یہ گھر اس کا ہونے والا ہے۔ یہ میرے نالائق لڑکے، تم ان سے کیا امید رکھتے ہو۔ انھیں سوائے پہلوانی کے آتا بھی کیا ہے۔ اور اس کے لئے تم ان نچلی ذات کے لوگوں کو ذمہ دار ٹھہرا نہیں سکتے۔ کبھی وہ دوسروں کے ذریعے بے زمین کر دیے گئے تھے۔ آج انھوں نے اپنی زمینیں واپس لینا شروع کر دی ہیں۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔'

بدھ رام نے شادی نہیں کی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ خوش تھے۔ دادا کو اس کا پتہ تھا کہ ان کے رشتے داروں کی ایک فوج تھی جس نے اس کی زندگی تنگ کر رکھی تھی اور آئے دن

اپنی عجیب وغریب مانگوں کے ساتھ نمودار ہوتے رہتے تھے۔ مگر اس کے لئے وہ بدھ رام کو ہی ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔ وہ جب بھی شراب کے نشے میں ہوتے ان کا دل بدھ رام کے لئے خیر سگالی کے جذبے سے بھر آتا۔ بدھ رام جو کبھی کسی عورت کے ساتھ ہم بستر نہ ہوا، انھیں ان سے زیادہ قابلِ رحم انسان اور کوئی دکھائی نہ دیتا۔ 'ویشالی میں تمہارا اتنا بڑا کنبہ ہے...' وہ اکثر بدھ رام کو تلقین کیا کرتے۔ 'تم اپنے رشتے داروں میں لوٹ کیوں نہیں جاتے۔ بڑھاپے میں ایک انسان کو سب سے زیادہ اپنے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔'

'ایک دن تمہیں اپنے لوگوں کا مطلب سمجھ میں آئیگا جب میں تمہیں اپنے لوگوں کے بیچ لے جاؤنگا،' بدھ رام نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ 'اس دن تم صحیح رائے دینے کے قابل ہو جاؤ گے۔'

بڑھاپے میں ایک اور شادی کرنے کی پاداش میں (اور یہ ان کی تیسری شادی تھی) دادا کو اپنے سفید بال اور داڑھی کو مہندی سے سرخ کرنی پڑی تھی، گرچہ میری کمسن دادی کو اس سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ وہ تو ایک بڑا سا پیٹ اٹھائے آج بھی ایک الھڑ لڑکی نظر آتی تھی۔

'وہ کیسے اتنا بڑا پیٹ لے کر دیوار پھاند جایا کرتی ہے؟' بدھ رام نے ایک دن اپنی حیرت کا اظہار کیا۔ 'مجھے پتہ نہ تھا کہ تم نے ایک گلہری سے شادی کی ہے۔' میرے دادا کو بدھ رام کی بات پسند آ گئی۔ 'وہ سچ مچ ایک گلہری ہے۔' انھوں نے بدھ رام کی دی ہوئی کھینی پھانکتے ہوئے آنکھ ماری۔ 'ایک جنگلی گلہری جسے اوّل تو پکڑنا آسان نہیں اور اگر پکڑ میں آ جائے تو زیادہ دیر تک تھامے رکھنا مشکل ہے۔'

'بوڑھے آدمی، تمہیں اپنے آس پاس کے نوجوانوں پر نظر رکھنی چاہئے۔ یہ دنیا ایک بہت ہی بری جگہ ہے۔ تم یقیناً نہیں چاہو گے کہ اس بڑھاپے میں کوئی تم پر ہنسے۔'

'لوگوں کو ہنسنے سے کون روک سکتا ہے۔' میرے دادا جان نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔ 'ویسے اسے ایک بار ماں بن لینے دو، سب ٹھیک ہو جائیگا۔ اور تم چاروں کھونٹ گھوم آؤ، جہاں تک عورت کا تعلق ہے، بستر میں میرے جیسا دوسرا آدمی تمہیں دکھائی نہ دیگا۔''

بدھ رام نے ترحم کے ساتھ میرے دادا کی طرف دیکھا۔ انھیں ایسا لگا جیسے وہ اب زیادہ دنوں تک زندہ رہنے والے نہیں۔ اس دن ایک سرخ سگنل کی طرف تاکتے ہوئے انھوں نے سوچا، ہم کسی چیز کو پانے کی دھن میں اسے اپنے آپ سے کتنی دور کر دیتے ہیں۔

//////

بدھ رام بستر پر لیٹے لیٹے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب روشنی نظر آرہی تھی۔ آپ میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟ میں نے پوچھا۔ مجھے ان کی آنکھوں سے بے چینی ہورہی تھی جیسے وہ مجھے میری جڑوں تک کھنگال لینا چاہتی ہوں۔ وہ تھوڑی دیر چپ رہے، پھر انھوں نے اپنی خاموشی توڑی۔ کبھی کبھی تمہاری شکل تمہارے دادا سے ملنے لگتی ہے۔ لیکن یہ مشابہت زیادہ دیر قائم نہیں رہتی۔ میں نے انھیں کبھی نہیں دیکھا، میں نے کہا۔ شاید میرا چہرا ان سے ملتا ہو۔ نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ کوئی بھی چہرا تمہارے دادا کی برابری نہیں کرسکتا۔ وہ مجھ سے عمر میں کچھ برس چھوٹا تھا مگر اس نے اسے کبھی قبول نہیں کیا۔ اس کے اندر دو بیل کی طاقت تھی۔ پولس بھی اسے حوالات میں ڈالنے سے ڈرتی تھی۔

بدھ رام اپنی زندگی کے آخری دن گن رہے تھے اور ان دنوں ہمارے دادا کے مکان میں کرایہ داروں کے لئے بنائی گئی کوٹھریوں میں سے ایک میں بغیر کرایہ کے رہ رہے تھے۔ ان کے کمرے کا آدھا حصہ دائمی طور پر اندھیرے میں ڈوبا رہتا جس کی انھیں پرواہ نہ تھی۔ ان کی ساری زندگی کا اثاثہ ایک ٹرنک کے اندر بند تھا جس پر بیٹھے بیٹھے وہ کھڑکی سے باہر آسمان پر نظریں ٹکائے رہنے کے عادی تھے۔ ان وقتوں کے علاوہ جب میں قانونی دستاویزات پر ان کی رائے لینے آتا جن کے سہارے میں اپنے دادا کی جائداد کو ان گنت مقدموں سے بچانے کی جدوجہد میں مصروف تھا، باقی وقت وہ میرے ساتھ اپنی یادداشت کے گلیاروں میں گھومنے کے عادی تھے۔ اور یہ مجھے پسند بھی تھا کیونکہ مجھ سے زیادہ میرے دادا کے واقعات کا علم بدھ رام کو تھا۔ بدھ رام جنھیں کہانی بُننے کا فن بخوبی آتا ہے۔

//////////

وہ ایک بڑا ہی خاموش دن تھا، بدھ رام نے کہنا شروع کیا۔ میرے کوارٹر کی کھڑکی کے کواڑ برسات کا پانی پی پی کر پھول گئے تھے اور ٹھیک سے بند نہیں ہورہے تھے جب اس پر ایک دستک ہوئی۔ یہ دستک میرے لئے حیران کن تھی۔ اب میری ضرورت کیسے ہوسکتی ہے؟ میں نے نہ بند ہونے والا پٹ کھولا تو ایک ادھیڑ عمر کی عورت ایک سبز طوطا ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔

اس طوطے پر اللہ کا نام لکھا ہوا ہے، اس نے کہا۔

آہ، میں نے سوچا، اب یہاں برا وقت آنے والا ہے۔

میں نے اس کے لئے دروازہ کھولا جو مجھے نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اور وہ ایک بہت ہی چرب زبان عورت ثابت ہوئی کیونکہ دس منٹ کے اندر اندر اس نے وہ طوطا اور بیچ گونی تار کا پنجڑا جس کے اندر طوطا بند تھا، مجھے بیچ ڈالا۔

اس کا احترام کرنا، یہ خدا کا بھیجا ہوا خاص پرندا ہے، اس نے روپئے ساڑی کے پلو میں باندھتے ہوئے کہا۔

دراصل اس ادھیڑ عمر کی عورت نے مجھے ایک ہی نظر میں اپنا غلام بنا لیا تھا۔ مجھے پہلی بار حیرت ہوئی کہ اتنی لمبی عمر کسی عورت کے بغیر میں نے کیسے گذار دیا تھا۔ تم کس گاؤں کی ہو؟ میں نے اس سے دریافت کیا۔ میں اسی شہر کی ہوں، عورت نے جواب دیا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی، عورت کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ میں بری طرح اس کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہوں۔ اس نے اپنے جسم کے بھرپور احساس کے ساتھ میری طرف دیکھا اور اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرتے ہوئے مزید کہا، اس طوطے کو پانی سے بچا کر رکھنا ورنہ اللہ کا نام غائب ہو جائیگا۔

شاید اب اسے میرے ساتھ جھوٹ بولنے کی ضرورت نہ تھی۔

اس کے جانے کے بعد مجھے افسوس ہوا کہ میں نے اس کے گھر کا پتہ کیوں نہ دریافت کیا۔ گرچہ پچھلے بیس برس میں یہ شہر کافی بڑا ہو چکا تھا مگر جانے کیوں مجھے اس بات کا یقین تھا کہ میں اس طوطا فروش کو ضرور ڈھونڈ نکالوں گا۔ بعد میں جب میں نے تمہارے دادا سے اس واقعے کا ذکر کیا تو اس نے انتہائی شبہے کے ساتھ اس پورے معاملے کو دیکھا۔ تم نے دیر کر دی، تمہارے دادا نے کہا۔ اب وہ اس لائق نہیں رہ گئی ہے کہ تمہارے لئے بچہ دے سکے۔ کیا وہ کنواری تھی؟ وہ مسلمان تھی، میں نے اس سوال سے بچنے کے لئے یہ بے تکا سا جواب دیا۔ پھر تو معاملہ اور بھی پیچیدہ ہے، تمہارے دادا بڑبڑائے۔ اس میں پیچیدہ کیا ہے؟ میں نے ضد کی۔ آخر ہم عیسائی اور مسلمان ایک ہی پیغمبر کے ماننے والے ہیں۔ نہیں، تم اسے نہیں سمجھ سکتے، اس سے پیچیدگی اور بھی بڑھ جاتی ہے، اور تمہارے دادا خاموش ہو گئے۔ لیکن مجھے علم تھا، وہ اتنی آسانی سے کسی بھی چیز کو بھولنے والا آدمی نہ تھا۔ دوسری صبح جب وہ اپنا شنٹنگ انجن لے کر پٹری سے گذر رہا تھا، اس نے اشارے سے مجھے بتایا کہ مجھے شام خالی رکھنی چاہئے جب ہم سنڈر پٹی سے گذر کر اسٹیم گیٹ کے

پیچھے واقع بڑے کھلیان کی طرف جائیں گے جہاں کی دیسی شراب ہمیں خاص طور پر پسند تھی۔ خالی، میں نے سوچا، اب میرے پاس ایسا ہے ہی کیا کہ اپنے آپ کو مصروف رکھوں! مگر میرا یہ سوچنا غلط تھا۔ قدرت نے کچھ اور ہی چیز میرے لئے تجویز کر رکھی تھی۔ اچانک اس عورت کی مجھے شدید یاد آنے لگی اور دوپہر تک میری حالت اتنی غیر ہوگئی کہ میں تمہارے دادا کو بھول کر اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

سند کے طور پر میں نے اپنے ساتھ وہ طوطا رکھ لیا تھا جس پر اللہ کا نام لکھا تھا۔ شہر، کیا تم اسے شہر کہو گے، صرف اس لئے کہ اس کی تارکول کی سڑکوں پر بجلی کے کھمبے آ گئے ہیں اور اس کی نئی پرانی عمارتوں میں ہر طرح کے لوگ رہنے لگے ہیں اور تم نے ذرا بھی دیر کی تو وہاں رات اتر جاتی ہے اور عین ممکن ہے کہ تم راستہ بھول جاؤ یا کوئی تمہیں لوٹ لے یا ایک باغی کے نرغے میں آ جاؤ یا کسی فحش فعل میں مصروف جوڑا تمہیں دیکھتے ہی بھاگ نکلے۔ مگر یہ دن اس طوطے کا تھا۔ وہ پنجرے کے بیچ گونی خانوں سے پنجوں کے مڑے ہوئے ناخن باہر نکالے خاموش کھڑا تھا اور بار بار سر نیوڑھا کر دھندلے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا جس میں اب ہفتے میں دو ایک ٹوسیٹر جہاز نمودار ہونے لگے تھے جو سامانوں کے اشتہار پھینک جایا کرتے۔ یہ کاغذی اشتہار پلندوں کی شکل میں جہاز سے باہر آتے مگر دیکھتے دیکھتے شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل جاتے۔

میں بہت تھک چکا تھا۔ میں پناہ لینے کے لئے ایک عمارت کے اندر داخل ہوا۔ عمارت ویران پڑی تھی پھر بھی میں کسی نیک دل انسان کی تلاش میں اس کی سیڑھیاں طئے کرنے لگا۔ عمارت کے تمام دروازے دریچے بند تھے یا شاید میری دستک اس کے مکینوں تک نہیں پہنچ پا رہی تھی یا شاید انہیں میری نیت کا پتہ چل چکا تھا۔ آخر کار میں اس کی چھت پر پہنچ گیا جس کے اوپر آسمان میں پتنگ اڑ رہے تھے اور سورج دور افق میں غلیظ بادلوں کے اندر بجھ چکا تھا۔ میں نے پانی کے کائی خوردہ ٹینک کے سامنے جس سے پانی رستا ہوا چھت کے کونے میں جم رہا تھا، ایک دیوار کا انتخاب کیا جس کی تعمیر بیچ میں ہی روک دی گئی تھی، اور پنجڑا اس پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے پتہ بھی نہ چلا دیوار پر بیٹھے بیٹھے کب میری آنکھ لگ گئی۔

//////

آنکھیں کھلیں تو میں نے اپنے آپ کو ایک عجیب وغریب شہر کے اندر پایا جو میرے لئے

اجنبی تھا۔ یہ کون سا شہر ہے؟ میں یہاں کس طرح سے پہنچا؟ دور تک کنکریٹ کی عمارتیں جنھیں ہم سوچ بھی نہ سکتے تھے جن کے درمیانی راستوں میں بجلی کے اونچے اونچے عمودی کھمبے کھڑے تھے جنھیں میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ بہت دیر تک غور سے دیکھتے رہنے کے بعد ایک آدھ پرانی عمارتوں کے مینار اور گنبد ابھرنے لگے جن کے اندر مجھے پرانے شہر کے نشان دکھائی دے رہے تھے مگر کنکریٹ کے ان اونچے ڈبوں کے سامنے وہ ہیچ نظر آرہے تھے۔ وہ کھلا ہوا شہر جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ہر طرف تنگ راستوں اور گلیوں کا جال بچھ چکا تھا۔ سورج شاید نکل رہا تھا یا ڈوب رہا تھا اور میں اپنی اونچی مگر تنگ چھت کی منڈیر پر بیٹھا اینٹ اور پلستر کے ان ڈھیروں کی طرف تاک رہا تھا جن پر برسات در برسات کائی جم کر کئی بدنما پیڑ اگ آئے تھے۔ چیل کوٹھی کی چھت پر پانی کا ٹینک اپنی جگہ کھڑا تھا اور آج بھی اس سے پانی رستا ہوا کونے میں جم رہا تھا۔ اس پانی میں ایک کبوتر مرا پڑا تھا۔ چھت کے فرش سے لے کر اس کی نیم تاریک سیڑھیاں اور ان کے بیچ کے چبوترے تک گندے ہو رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا اس عمارت کے مکین اپنی تمام گندگیاں ان جگہوں پر ڈالنے کے عادی ہو گئے ہوں۔ لیکن میرے یہاں ہونے کا جواز کیا تھا؟ اور یہ خالی پنجرا! میں اسے اٹھائے کیوں کھڑا ہوں؟ اور مجھے اس کا افسوس ہونے لگا کہ میں اکیلا اس مہم کے لئے نکل آیا تھا۔ مجھے تمہارے دادا کو ساتھ لینا چاہئے تھا۔ آخر کار عورتوں کے معاملے میں وہ ایک جہاں دیدہ انسان تھا۔ تو میں نے چھتوں کے ناہموار سلسلے پر دور تک نظر دوڑائی جہاں دلچسپی کے لائق کچھ نہ پا کر میری نظر واپس خالی پنجرے پر ٹک گئی۔ کیا میری نیند کی حالت میں طوطا اڑ چکا تھا یا کوئی اسے چرا لے گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ کوئی جادوی طوطا ہو جو مجھے اس شہر میں لانے کا سبب بنا ہو، اور اپنا کام کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو چکا ہو۔ تو یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس عورت کا ضرور کوئی نہ کوئی وجود رہا ہوگا جس نے وہ مقدس طوطا چند سکوں کے عوض میرے حوالے کیا تھا۔

میں جب سیڑھیاں اتر رہا تھا تو میں نے دیکھا، نیچے کی چاروں منزلیں بظاہر ویران پڑی تھیں جن کے اندر گھپ اندھیرا تھا مگر ہر دو سیڑھیوں کے درمیانی چبوترے پر کھڑے ہو کر عجیب و غریب بھنبھناہٹوں اور سرگوشیوں کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا، عمارت آباد تو تھی مگر آج بھی لوگ میرا سامنا کرنے سے کترا رہے تھے۔ نیچے کنکریٹ کی سڑک پر میں نے کچھ راہگیر اور فیکٹری سے لوٹتے سائکل سواروں کو دیکھا۔ وہ شاید میرے ہی منتظر تھے

اور اپنے آس پاس کی دنیا کو بھول کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔

کسی نے میرا طوطا دیکھا ہے؟ میں نے اپنے خالی پنجڑے کو اوپر اٹھا کر دریافت کیا۔ اس پر اللہ کا نام لکھا ہوا تھا۔

انھوں نے جواب دینے کے لئے منہ کھولنے کی کوشش کی۔ میں دیکھ رہا تھا، انھیں اس میں ناکامی ہو رہی تھی۔ اچانک مجھے ان کے چہروں میں ایسا کچھ نظر آیا جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ طوطے کے بارے میں سارے شہر کو واقفیت تھی۔ یہ کون سا شہر ہے؟ میں نے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا، یہ میرا شہر تو نہیں ہو سکتا۔ میں نے دیکھا راہگیر مجھ سے دور ہٹتے جا رہے تھے۔ سائکل سواروں نے اپنی سائکلوں کا رخ موڑ لیا اور تیزی سے پیڈل مارتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں ان کا تعاقب کرتے ہوئے، (گرچہ یہ تعاقب بے معنی تھا) ایک دوسری ویران سڑک پر نکل آیا جو ایک لوہے کے پل سے گذرتی تھی جس کے نیچے کیچڑوں سے ڈھکے ہوئے پانی کا کھال تھا۔ کھال کے اندر لوگ ٹوکریوں سے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ شاید میں کسی گودی کے علاقے میں بھٹک رہا تھا۔ سڑک پر تا حدِ نظر ایک ہی طرح کے آہنی لیمپ پوسٹ کھڑے تھے جن میں سے ایک کے نیچے ایک بھکاری اپنی گدڑیوں کے بیچ افسردہ سا بیٹھا تھا۔ اس کا کتا اس سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر ایک چھوٹی دیوار پر جو شاید کبھی سنگ میل رہی ہوگی، اپنے سامنے کے پنجے جمائے کھڑا نیچے کھال کی طرف تاک رہا تھا۔ اس کی بھینگی آنکھوں میں سارے شہر کی دہشت لکھی ہوئی تھی۔ خود بھکاری کے وجود سے ایک عجیب طرح کی بساند آ رہی تھی جیسے اس کا جسم سڑ چکا ہو۔

آپ اس شہر کے لئے نئے نہیں ہو، بھکاری نے کہا۔ اور میں آپ سے بھیک قبول نہیں کر سکتا، کہیں مجھے آپ کے کسی سوال کا جواب نہ دینا پڑے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف تم پڑھے لکھے ہو بلکہ تمہیں میرے طوطے کا بھی علم ہے، میں نے کہا۔ ہاں، بھکاری نے جواب دیا، وہ اسی طرح کے ہتھکنڈے لوگوں پر آزمایا کرتی تھی، مگر ایک ہی شہر میں آپ برسوں تک لوگوں کو ایک ہی طرح کے فریب نہیں دے سکتے، ایک نہ ایک دن آپ کا پول کھل جاتا ہے۔ اسے چاہئے تھا کہ کسی دوسرے شہر میں قسمت آزمائے۔ مگر کوئی خاص وجہ اسے اس شہر کو چھوڑنے سے روکے ہوئے تھی۔ تو اس نے اپنا پیشہ بدل لیا۔ اس نے کھال کے کنارے اپنے جسم کا دھندا کرنا شروع کر دیا۔ وہ ہر شام اسی لوہے کے پل پر ملاحوں کی امید میں آتی مگر اسے زیادہ تر خالی ہاتھ لوٹنا پڑتا کیونکہ

اس کی عمر کے سبب کسی گاہک کو اس کے اندر کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ خاص طور پر جب کمسن لڑکیوں کی کھیپ کی کھیپ چکلوں کے اندر بھر چکی ہو۔ رہا آپ کا طوطا، تو وہ کب کا مر چکا ہے۔ تمہیں علم نہیں تم جس طوطے کی بات کر رہے ہو وہ کوئی ایسا ویسا طوطا نہیں تھا، میں نے کہا۔ تم اتنے سرسرے انداز میں اس کی موت کا ذکر نہیں کر سکتے۔ وہ خدا کا بھیجا ہوا خاص پرندا تھا۔ ممکن ہے وہ ویسا ہی رہا ہو، بھکاری نے تائید میں سر ہلایا، مگر آپ واپس کیوں نہیں لوٹ جاتے؟ شاید آپ کو علم نہیں، آپ اپنے وقت سے باہر نکل آئے ہیں۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ تمہیں اتنا سب کچھ کیسے معلوم؟

بھکاری اپنے عجیب وغریب دانتوں سے مسکرایا۔

میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ پھر بھی ایک بات تو بتا ہی سکتا ہوں۔ بیس برس قبل ایک بوڑھا آپ کی تلاش میں یہاں آنکلا۔ ہوا کی ایک ٹھنڈی لہر سے بچنے کے لئے بھکاری نے چیتھڑوں کو اپنے گرد لپیٹنا شروع کر دیا جس سے بساند اور بھی تیز ہوگئی۔ وہ آپ کو تقریباً تلاش کر چکا تھا کہ شہر میں فساد پھیل گیا اور لوگوں نے اسے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر زندہ جلا ڈالا۔ اس کے بعد بھی وہ سرکاری اسپتال میں کئی دنوں تک زندہ رہا۔ پھر اس پر دل کا دورا پڑا اور اس کے لوگ اسے واپس اٹھا کر لے گئے۔ اور آپ کا طوطا بیس سال تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس نے ضرور پنجڑے کے اندر جان دے دی ہوگی اور وہ دھیرے دھیرے مٹی میں بدل گیا ہوگا۔ شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میں پنجڑے کے اندر دیکھ رہا تھا، کچھ ایسا ہی ہوا ہوگا اور اس کی مٹی کو برسات کا پانی بہا کر یا ہوا اڑا کر لے گئی ہوگی۔ مگر تمہیں اس عورت کا پتہ تو معلوم ہوگا؟ میں نے پوچھا۔ ایسی عورتوں کا کوئی پتہ ٹھکانہ نہیں ہوتا، بھکاری نے جواب دیا۔ میں نے اسے عرصے سے دیکھا بھی نہیں ہے۔ یوں بھی، وہ اب آپ کے کسی کام کی نہیں، وہ ہر طرح کے ٹیومر سے گھر چکی ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو کسی ہسپتال کے احاطے میں اپنی موت کو انتظار کر رہی ہوگی۔ یہ اس کے ان گنت گناہوں کا نتیجہ ہے۔

//////

تمہارے دادا کی موت کی اطلاع مجھ پر بجلی بن کر گری تھی مگر اس کے جھٹکے کو سمجھنے کے لئے مجھے کچھ وقت لگ گیا۔ اور جب مجھے اس کا احساس ہوا تو میں پاگل کی طرح سڑکوں پر دوڑتا

پھرا۔ کچھ راستے اور گلیاں میری پہچان میں بھی آ گئیں اور پھر دھیرے دھیرے میں ان کی پہچان بن گیا۔ میں نے وہ پیچ گوٹی تاروں والا پنجرا کب کھودیا، مجھے اس کا احساس نہ تھا۔ خود میں اچھا خاصا بوڑھا ہو چکا تھا۔ میں نے ایک لمبے عرصے تک شہر میں آوارہ گردی کی۔ اپنی آوارہ گردی کے دنوں میں بھوک مٹانے کے لئے مجھے کئی معصوم چوریاں بھی کرنی پڑیں۔ ایک بار پکڑا بھی گیا مگر میری عمر کو دیکھتے ہوئے لوگوں کو مجھ پر ترس آ گیا اور انھوں نے مجھے عیسائیوں کے ذریعہ بنائے گئے بوڑھوں کے ایک آشرم میں ڈال دیا جہاں سے بھاگنا آسان نہ تھا کیونکہ اس کا پاگل دربان ایک گھنٹے کے لئے بھی نہیں سوتا تھا۔ مگر میں بھاگ نکلا۔ اور آخر کار وہ دن آ ہی گیا جب میں نے تمہارے دادا کی قبر دریافت کر لی۔ خدا بھلا کرے ان لوگوں کا جنھوں نے قبروں پر کتبہ نصب کرنے کی روایت قائم کی۔ شہر میں آج کے برعکس ان دنوں تم مسلمانوں کا ایک ہی قبرستان تھا، مگر تمہارے دادا کو تمہارے لوگوں نے تمہارے خاندانی قبرستان میں دفن کیا تھا جس کے دو ہاتھ کے فاصلے پر اس کا کتا بھی دفن تھا جسے تمہارے دادا نے رمضان میں روزہ رکھنے کی عادت ڈلوائی تھی۔
مگر تمہارے بڑے چچا نے، جس نے گھر کے تمام ساز و سامان کے ساتھ اس اتنی بڑی عمارت کی چھت سے لگے شہتیروں سے لے کر کھڑکیوں دروازوں کے چوکھٹ تک گروی رکھ دی تھی، مجھے ایک الگ ہی واقعہ سنایا۔ اس کے مطابق وہ ریلوے کے حادثے میں مارا گیا تھا۔ وہ مالگاڑی لے کر کسی سنسان اسٹیشن سے گذر رہا تھا جب اس کا انجن بفر لائن پر غلطی سے جا نکلا جس کے خاتمے پر ٹرین کو روکنے کے لئے بنائے گئے مٹی کے اونچے ڈھیر سے ٹکرا جانے کے سبب اس کا ابلتا ہوا بوئلر چھٹ کر تمہارے دادا پر آ گرا جس سے وہ جھلس کر مارا گیا۔ یہ اسٹیم انجن کا زمانہ تھا جب پٹریاں دستی بیرم کے ذریعے بدلی جاتی تھیں اور کسی نے شرارت سے پٹری کا رخ بفر لائن کی طرف موڑ دیا تھا۔

بدھ رام سے میں نے اس طوطے کے بارے میں دریافت کیا۔ کیا واقعی اس کا کوئی وجود تھا؟ کیا واقعی وہ خدا کا بھیجا ہوا پرندا تھا جس کے اندر اتنی طاقت تھی کہ وہ گھڑی کے کانٹوں کو طوفانی رفتار سے چلنے مجبور کر دے، اتنی تیزی سے کہ دہائیاں گذر جائیں اور آدمی کو پتہ نہ چلے، اور خود اس کا اپنا شہر اس کے لئے اجنبی بن جائے، جیسا کہ ان کے ساتھ ہوا تھا۔

بالکل، وہ ہنسے۔ اب تک اس بوڑھے کی ہنسی میں اس کا بچپنا جھلکتا تھا۔ اگر تمہارے دادا زندہ ہوتے تو اس بات کی تصدیق کرتے۔

کچھ دنوں کے بعد ہمارے دادا کا مکان ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ ہم لوگ بدھ رام کو اس کے ٹرنک کے ساتھ اسٹیشن چھوڑنے آئے جس کی محرابوں سے ہمیشہ کی طرح چمگادڑیں لٹک رہی تھیں۔ ہمالیہ کی ترائی میں اسے ایک کہرے سے ڈھکے ہوئے شہر کی یاد تھی جہاں اب بھی اس کے کچھ رشتے دار زندہ تھے جو انھیں پہچان سکتے تھے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا میں وہاں کیوں جا رہا ہوں؟ بدھ رام نے کہا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی جس کے سبب پلیٹ فارم پر ایک طرح کی دھند چھا گئی تھی۔ ہم لوگ لوہے کا ٹرنک ان کی سیٹ کے نیچے رکھ کر ابھی ابھی باہر آئے تھے اور ان کی کھڑکی کے سامنے کھڑے تھے۔ تیز ہوا بارش کی پھوار کو شیڈ سے نیچے کی طرف لا رہی تھی۔ بدھ رام کی آنکھیں بجھی بجھی ہوئی تھیں۔ وہ اب زندگی میں بالکل اکیلے ہو چکے تھے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے سر اٹھا کر کہا، اگر تم لوگ کچھ اور دن انتظار کرتے تو اپنے دادا کی زمین میں عیسائی رسم و رواج کے مطابق مجھے دفن کر سکتے تھے۔ آخر کار اس میں ایک کتا بھی دفن ہے۔ میں تو خیر ایک عیسائی ہوں۔

ہم عدالت کے حکم کے سامنے مجبور ہیں، میں نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ وہ مکان اب ہمارا نہیں رہا۔

ٹرین چل چکی تھی جب بدھ رام نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر چلاتے ہوئے کہا، ایک دن میں واپس آؤں گا اس عورت اور اس طوطے کی تلاش میں۔ اس دن تمہارے دادا کے بارے میں میں اور بھی بہت ساری جانکاری دوں گا۔

ایسا نہیں تھا کہ میں نے پوری طرح ان کی بات کا بھروسہ کیا ہو، مگر وہ دن اور آج کا دن، مجھے اب بھی اس ٹرین کا انتظار ہے۔ آج جب چند ناگزیر حالات کے سبب میں اس شہر کا باشندہ بن چکا ہوں جہاں ایک عورت اور اس کے طوطے کی نامکمل کہانی کے ساتھ ساتھ میرے دادا کی زندگی کے ان گنت واقعات دفن ہیں جن کا علم صرف بدھ رام کو ہے۔

بدھ رام، میں دادا کی جیبی گھڑی کو جس میں وقت دائمی طور پر رک چکا تھا، اس کی زنجیر سے اپنے سامنے لٹکا کر اس کے سات کے ہندسے کو دیکھ رہا تھا، جب تک تم لوٹ کر نہیں آتے نہ وہ طوطا مر سکتا ہے، نہ وہ عورت اور نہ ہی تم مر سکتے ہو۔ وقت کا یہی فیصلہ ہے!

☆☆

مرتا ہوا آدمی

بوڑھا چٹان پر بیٹھا کتے کی طرف تاک رہا تھا جس کا نچلا جبڑا لٹک آیا تھا اور دونوں پچلی دانتوں سے رال ٹپک رہی تھی۔ اسے یاد نہیں یہ کتا کہاں سے وارد ہوا تھا اور کب سے اس کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ اب جیسے جیسے موت اس کے قریب آتی جا رہی تھی اس کی یادداشت میں بڑے بڑے سوراخ بننا شروع ہو گئے تھے جن کے راستے بہت ساری چیزیں غائب ہونے لگی تھیں؛ بچپن کی روشن اور تابناک تصویریں، جوانی کے رنگین پیکرات، بڑھاپے کی دھندلے مناظر، یہاں تک کہ اب وہ ان چیزوں ان لوگوں کو بھی بھولنے لگا تھا جن کی یادیں اسے کبھی رات رات بھر سونے نہیں دیتی تھیں۔ مگر ان دنوں ایک نیا واقعہ اس کے ساتھ ہو گیا تھا، اسے سورج اب غلط جگہ دکھائی دینے لگا تھا بلکہ وہ تو یہ تک بھولنے لگا تھا کہ خود اس کا سایہ اس کے صحیح سمت ہے کہ نہیں۔

''یہ مت سوچنا کہ چونکہ میں قبر کے اندر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہوں میں تمہارا محتاج ہوں۔'' بوڑھے نے کتے سے کہا اور اپنے ڈنڈے سے اس کی طرف اشارا کیا جسے کتے نے پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا کیونکہ اس نے اپنی دم نہیں ہلائی تھی۔ ''تم ایک دن پچھتاؤ گے جب میں دنیا میں نہیں رہوں گا اور تمہیں پتہ چلے گا اس دنیا میں اچھے مالکوں کی سخت کمی ہے۔''

بوڑھا شہر کے باہر ایک کچے نالے کے کنارے بیٹھا تھا جس میں ایک بہت بڑے پائپ کے ذریعے شہر کے غلیظ پانی کی نکاسی ہوتی تھی۔ بوڑھا جب بھی اس پائپ سے گدلے پانی کو گرتے دیکھتا اسے یوں لگتا جیسے وہ شہر کی مقعد کو دیکھ رہا ہو۔ جانے کیوں یہ جگہ پھر بھی اسے پسند تھی جس کے آسمان پر گدھ، چیل اور کوے منڈلایا کرتے جو اپنی تیز گرسنہ آنکھیں نیچے پایاب نالے کے گندے پانی پر ٹکائے رہتے۔ نالے کی سڑاندھ کے سبب اس کے کنارے ٹھہرنا مشکل تھا

مگر بوڑھے کو اس سے کوئی واسطہ نہ تھا کیونکہ اس کی قوتِ شامہ کب کے جا چکی تھی۔ اسے ان دنوں یہ سوچ کر حیرت ہونے لگی تھی کہ اب اس کی زندگی کا مقصد صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ اپنی موت کا انتظار کرے۔ اگر وہ ایک جانور ہوتا تو یا تو لوگ اسے گولی مار چکے ہوتے، یا زہریلے انجیکشن سے ہلاک کر چکے ہوتے یا پھر اس کے حلق پر چھری پھیر کر اس کا حصہ لگا چکے ہوتے۔ مگر وہ تو ایک انسان ہے، اور وہ عمر کے جس پڑاو پر تھا اس کے پاس طبعی موت مر کر قبر کے اندر سڑنے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہ تھا۔

کتا نالے کے کنارے کھڑا اس کے غلیظ پانی میں کسی چیز کو ہلتے دیکھ کر اس پر چھلانگ لگانے کے بارے میں سوچ رہا تھا مگر ہر بار کی طرح اس بار بھی اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ شاید وہ کیچڑ پر پر پھیلا کر رعونت کے ساتھ گھومتے گِدھوں سے خائف تھا۔

نالے کے دوسرے کنارے سبزی کے کھیت شروع ہوتے تھے جو افق تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں سے بہت ساروں کی سینچائی اس نالے کے گندے پانی کے ذریعے ہوتی تھی۔ ان کھیتوں میں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر کھپریل یا ٹن کے چھپروں والے مکانات تھے جن سے وقت بے وقت دھواں نکلا کرتا یا مختلف فاصلوں پر اینٹوں کے بھٹے تھے جن کی چمنیوں سے کتھئی دھواں کسی سانپ کی طرح رینگ کر باہر آتے اور آسمان کے نیچے بل کھایا کرتے۔ کھیتوں میں کہیں کہیں ننگے بدن کام کرنے والے مزدور دکھائی دے جاتے۔ پھر کچھ بچے پہیئے دوڑاتے ہوئے جانے کہاں سے نکل آتے اور نالے کے دوسرے کنارے ناک میں انگلی ڈال کر بوڑھے کو تاکتے رہتے۔ بوڑھا انھیں نظر انداز کر دیتا جب تک انھیں دیکھنا نہایت ضروری نہیں ہو جاتا اور تب وہ اپنی دودھیا بھوؤں کے نیچے سے اتنی بھیانک نظروں سے ان کی طرف تاکتا کہ وہ گرتے پڑتے بھاگ کھڑے ہوتے۔

'میرے لوگ انتظار کر رہے ہیں کہ کب میں مر جاؤں اور وہ مجھے قبرستان لے جا کر گاڑ دیں۔' بوڑھے نے کتے سے مخاطب ہو کر کہا۔ 'اور یہ وہی لوگ ہیں جنھیں کل تک اپنا چوتڑ کھجانے کا طریقہ تک معلوم نہ تھا، جن کا جہنم بھرنے کے لئے جانے مجھے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے۔ مگر تمہیں ان سب چیزوں سے کیا لینا۔ تم تو ایک کتے ہو، ایک آزاد دنیا ہے تمہاری، بلکہ تمہیں تو اپنا مالک چننے کے لئے بھی کسی سے اجازت نہیں لینی پڑتی۔ اور مرنا، وہ تو تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔'

واقعہ یہ تھا کہ اپنی لمبی زندگی میں ہر ہفتے اس نے کسی نہ کسی کتے کو سڑک کے حادثے میں مرتے دیکھا تھا۔ بلکہ آجکل تو اسے ایسا لگنے لگا تھا جیسے یہ کتے زندگی سے بیزار ہو کر جان بوجھ کر ایسا کرتے ہوں گے ورنہ اتنے ذہین جانور کے لئے بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ پہیوں کے نیچے آجائیں۔

بوڑھے نے کتے کو کوئی نام نہیں دیا تھا۔ صرف کبھی کبھار وہ اسے کتا بلا لیا کرتا جسے سن کر کتا اس طرح اپنی دم ہلاتا جیسے اسے اپنا یہ نام پسند ہو۔ ایک بار اس نے بوڑھے کے سامنے ہی ایک کتیا پر قبضہ جما لیا تھا جو بوڑھے کو پسند نہیں آیا۔ جب دونوں الگ ہوئے تو اس نے کتے کے نچلے جبڑے کو تھام کر کہا:

'تم واقعی ایک جانور ہو جانور۔ تمہیں اسکی بالکل پرواہ نہیں کہ تمہاری آنے والی نسل کا کیا ہوگا'

بوڑھے کو ریح خارج کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی مگر اس کے لئے وہ اپنے اندر قوتِ ارادی کی کمی پا رہا تھا۔ ہم جیسے جیسے اپنی قبر کی طرف بڑھتے جاتے ہیں ہمارے جسموں کے دروازے اور دریچے بند ہوتے جاتے ہیں، پھر ایک دن ہمارے اندر قوتِ ارادی پوری طرح ختم ہو جاتی ہے اور اس دن کا سورج ہمارے ٹھنڈے بدن پر روشن ہوتا ہے۔

کتا اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور نالے کی طرف جانے لگا۔ اس کی اٹھی ہوئی دم کے ہالے میں بوڑھے کی نظر ایک پیلے رنگ کی ٹیکسی پر پڑی جو تھوڑا اوپر عین پائپ کے سائے میں آکر رکی تھی۔ اس سے تین آدمی باہر آئے اور بوڑھے کی طرف بڑھنے لگے۔ ڈرائیور اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو بوڑھے بابا؟" ان میں سے ناٹے قد کے بغیر گردن والے آدمی نے جو شاید ان کا سرغنہ تھا اس کے داہنے کندھے پر اپنائیت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ سنسان کنارا آپ کے لئے محفوظ نہیں ہے۔"

"میں اس نالے کو پچھلے پچاس برس سے دیکھتا آ رہا ہوں۔ ان دنوں اس میں صاف پانی بہتا تھا اور وہ گندگی اگلنے والا پائپ وہاں نہ تھا۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"اور ان پچاس برسوں میں یہ دنیا بہت بدل چکی ہے۔" اس آدمی نے کہا۔ "ہمیں یہاں ایک ضروری کام کرنا ہے۔ کیوں نہ آپ اپنا گھر چلے جاؤ۔"

بوڑھے کو ان لوگوں کے درمیان گھرا دیکھ کر کتا دوڑتا ہوا آتو گیا تھا مگر وہ تھوڑے فاصلے پر رک گیا۔ شاید وہ انھیں سمجھ نہیں پا رہا تھا یا ان لوگوں سے خائف تھا۔

''اس سورج کو دیکھ رہے ہو۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''جب وہ وہاں کھیتوں کے بیچ بجلی کے تاروں کو چھو جاتا ہے تب میرے جانے کا وقت ہوتا ہے۔''

تینوں اچنبھے سے ایک دوسرے کو تاکنے لگے۔ شاید وہ بوڑھے کو سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ پھر انھوں نے بوڑھے کی دونوں بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے اس کے کمزور پیروں پر کھڑا کیا۔ ایک نے اسے اس کی لکڑی تھمائی اور وہ ریت اور پتھروں پر بنی پگڈنڈی کی لکیر پر چلنے لگے جہاں جنگلی کٹیلی جھاڑیاں ہوا کی زد میں آکر جھانجر کی طرح بج رہی تھیں۔ اس جگہ جہاں متروک سرکاری کوارٹر شروع ہو گئے تھے، بوڑھے کو اس کی لکڑی کے ساتھ زمین پر بٹھا کر وہ لوگ واپس لوٹ گئے۔

'کتے، تمہیں تو ضرور پتہ ہوگا انھیں کیا چاہئے؟' بوڑھے نے اپنی لکڑی کے سہارے پھر سے کھڑا ہوتے ہوئے کتے سے کہا جو ان لوگوں کے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا اور کچھ نہ سمجھ پا کر بلاوجہ اپنی دم ہلا رہا تھا۔ بوڑھا آنکھیں سکوڑ کر شہر کے گھروں کی طرف تاک رہا تھا جو دو فرلانگ دور ناہموار زمین پر اوپر نیچے ہوتے ہوئے افق تک چلے گئے تھے۔ ان ہی مکانوں میں ایک کے اندر اس کا بھی ٹھکانہ تھا جس کے باہر بجلی کے ایک عمودی کھمبے کے نیچے کتا ہمیشہ اس کا انتظار کیا کرتا، اور یہ وہی گھر تھا جس کے صدر دروازے سے ایک دن اس کا جنازہ باہر آنے والا تھا۔ بوڑھے نے سورج کی طرف دیکھا جسے بجلی کے تاروں تک اترنے میں اب آدھا گھنٹہ سے کچھ کم رہ گیا تھا۔

''تم کتوں کو بہت ساری باتوں کا پتہ ہوتا ہے۔ تم لوگ سونگھ کر لوگوں کو ہم سے بہتر جان لیتے ہو۔ مگر تم جانے کس مٹی کے بنے ہو؟ کبھی تو کسی کے کام آیا کرو!''

کتے نے دونوں ٹانگوں کو سامنے کی طرف بھر مقدور پھیلا کر اپنے پنجوں کے بیچ تھوتنی ڈال دی، ریڑھ کے بال کھڑے کر لیے اور بوڑھے کی طرف تاکنے لگا۔

'مجھے پتہ ہے تمہیں بھی یہ لوگ پسند نہیں۔ مگر اب دنیا بدل چکی ہے۔ اور میرا یقین کرو یہ اب برے لوگوں کے ہاتھوں میں جا چکی ہے،' اس نے کہا اور وہ دوبارا نالے کی طرف واپس لوٹنے لگا۔ وہ چٹان سے سو گز کے فاصلے پر ہوگا جب اسے ٹیکسی واپس لوٹتی نظر آئی۔ اس کے چاروں پہیئے دھول کے پھوارے چھوڑ رہے تھے۔ تینوں نے بوڑھے کو دیکھ کر ہاتھ ہلا ہلا کر اسے

بائی بائی کہا تھا۔ اس کا سرغنہ سگریٹ پھونکتے ہوئے پدرانہ شفقت کے ساتھ بوڑھے کی طرف تاک رہا تھا۔ گاڑی ناہموار زمین پر اونچی نیچی ہوتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

''انھیں معلوم تھا میں واپس آنے والا ہوں اس لئے وہ بھاگتے بنے۔'' بوڑھے نے لکڑی چٹان پر ٹکا کر اپنی ٹانگوں کو پھیلاتے ہوئے خود کو دلاسا دیا۔ ''اگر تم ایک وفادار جانور ہوتے تو ان کو مزا چکھاتے۔ مگر تمھیں اپنی دم سے فرصت کہاں۔''

ایک بار پھر بوڑھا پہلے کی طرح چٹان پر جم گیا تھا اور کتے کا نیچے کا جبڑا ہمیشہ کی طرح لٹک گیا تھا۔ مگر یہ زیادہ دیر نہیں چلا کیونکہ اچانک کتا اپنے چاروں پیروں پر کھڑا ہو گیا اور شدید بے چین نظر آنے لگا۔ اس سے پہلے کہ بوڑھا اس سے کچھ کہہ پاتا وہ دوڑتا ہوا نالے کے کنارے چلا گیا اور زور زور سے بھونکنے لگا۔

کتوں کی ایک الگ دنیا ہوتی ہے جو ان کی طرح ہی عجیب ہے، پھر بھی جانے کیوں میں اس سے اتنی امید لگائے بیٹھا ہوں، بوڑھا سوچ رہا تھا۔ مگر پھر اسے نالے کے اندر کچھ ہلنے ڈولنے کی آواز سنائی دی اور وہ خود بھی لکڑی ٹیکتا ہوا نالے کے اوپر پہنچ گیا۔ اس نے اپنی عینک کو انگلیوں سے صاف کرتے ہوئے دیکھا، نالے کے کیچڑوں بھرے کنارے پر گدھ اور چیلوں کے جمگھٹوں کے بیچ ایک شخص اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔

//////

یہ واقعہ تانبے کے آسمان کے نیچے پیش آیا تھا۔

ان کا ارادہ مغل کو جان سے مارنے کا نہ تھا۔ مگر انھوں نے اینٹ کی ایک قدیم عمارت کے احاطے میں، جہاں چارکول سے دیواروں پر فحش نشانات بنے ہوئے تھے، اسے بجلی کے ایک کھمبے سے باندھ کر نشے کی حالت میں اتنی دھلائی کی تھی کہ اس کے خون سے لت پت جسم کو دیکھ کر انھیں اس کا یقین ہو گیا تھا کہ اب کسی بھی پل وہ دوسری دنیا میں ہوگا۔ مگر وہ بڑا سخت جان ثابت ہوا۔ اسے ہوش میں آنے میں زیادہ وقت نہ لگا۔ بعد میں جب مغل کو نالے کے اندر ڈالا گیا تو اس کی بدبودار گیلی زمین پر گرنے کے بعد اس کی رہی سہی ناک بھی ٹوٹ گئی تھی اور خون اس کے نتھنوں سے بہہ نکلا تھا۔ کیچڑ میں اس کے جسم کے تمام نوکیلے حصے گتھ گئے تھے اور اس کے ہر حصے سے درد کی ٹیسیں ابھر رہی تھیں۔ مگر ٹھنڈی زمین پر بے حس و حرکت پڑے رہنے سے اسے آرام

بھی مل رہا تھا۔ وہ مردار خوروں کو اتنے قریب پا کر خوفزدہ تو تھا مگر اب بس تھوڑی ہی دیر کی بات تھی۔

''اوی اور تھوڑا انتظار کرو۔'' اس نے انھیں بتانے کی کوشش کی مگر اس کے دونوں ہونٹ کچل گئے تھے اور وہ انھیں مشکل سے ملا پا رہا تھا۔ اس نے بوڑھے کو نہیں دیکھا تھا جو احتیاط کے ساتھ اپنی لکڑی ٹیکتا ہوا ڈھال سے اتر رہا تھا۔ بوڑھا قریب آیا تو اسے اس پر رحم آ گیا۔ وہ ابھی صرف اکیس برس کا تھا جب کہ اس حال کو پہنچ گیا تھا، اس بوڑھے کے لئے اتنی لمبی عمر جینا کم کٹھن نہ رہا ہوگا۔

''تم زندہ ہو؟'' اسے بوڑھے کی آواز سنائی دی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ کر خوفزدہ نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ کتا اس کے سرہانے کھڑا اس کے مٹی سے لتھڑے ہوئے بالوں کو سونگھ رہا تھا۔

''او جھے چین سے ارنے دو۔ (مجھے چین سے مرنے دو)'' اس کی آواز بالکل ہی مدھم تھی۔ اس نے اپنا سر اٹھانے کی کوشش کی جو منوں وزنی ہو گیا تھا۔ وہ اسے اٹھا نہ پایا۔ ''ایں اہت چھوٹی عمر سے اس دن کا انتظار کر رہا تھا (میں بہت چھوٹی عمر سے اس دن کا انتظار کر رہا تھا)۔'' وہ رک رک کر بہت دھیمی آواز میں اپنی بات کہہ رہا تھا۔

''میں پولس بلاؤں۔'' بوڑھا اس کی بات سمجھ نہیں پا رہا تھا کیونکہ اس کے الفاظ بیچ بیچ میں کچھ اور بن کر باہر آ رہے تھے۔ ''میں ان لوگوں کو پہچان سکتا ہوں۔''

''وولس؟ (پولس؟)۔'' زخمی کے دونوں کچلے ہوئے ہونٹ ہلے۔ اس کے سامنے کے سارے دانت ٹوٹ گئے تھے۔ ''وہ و...وولس والے ہ...ی تھے۔''

بوڑھے نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر ایک گدھ کو نالے کے دوسرے کنارے ایک مری ہوئی بلی کو گھسیٹ کر باہر لے جاتے دیکھا۔ بلی کا بدن پھول کر کپا ہو رہا تھا اور آنکھوں کے کنچے ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ مگر زخمی کا آخری جملہ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ اسے اس آدمی سے ڈر تو لگ رہا تھا مگر کتا اس کے ساتھ تھا۔ پھر اس کے ہات میں ایک لکڑی بھی تھی۔

''تم مرنا کیوں چاہتے ہو؟'' اس نے جھک کر مغل کے کان میں کہا۔

''میرے لئے سارے دروازے ب ...ب ...بند ہو چکے ہیں'' مغل کی آواز آئی۔ اب وہ کسی حد تک ہونٹوں کو ملا پا رہا تھا گرچہ اس کی نیم مندی ہوئی آنکھوں میں ابھرتی ہوئی

کرب سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کوشش میں اسے کافی تکلیف کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ مگر وہ خوش تھا کہ اس آخری وقت میں کوئی تو اس کے پاس تھا۔

''تمہارے بھائی بہن تو ہوں گے؟''

''میرے سارے بھا...ئی بہن چھوٹے ہیں۔ صرف ایک بڑی بہن ہے۔ وہ رانا گھاٹ میں دھندا کرتی ہے۔'' اس نے مسکرانا چاہا، مگر اس کی زخمی آنکھوں نے اسے ممنون ہونے کا موقع نہ دیا۔ ''وہ ایک بہت خوبصورت عورت ہے۔''

''تم بھی خوبصورت ہو۔'' بوڑھے نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ وہ لانبے قد کا ایک وضیع نوجوان تھا اور کیچڑ اور خون نیز دن کی مرتی ہوئی روشنی کے باوجود اس کا گورا رنگ جگہ جگہ سے صاف جھلک رہا تھا۔

''ہا...ں۔ لوگوں کا کہنا ہے ہماری رگوں میں بنجاروں کا خ...خ...خون دوڑ رہا ہے۔'' وہ نیلے آسمان کی طرف تاک رہا تھا جس میں کسی بھی وقت تارے ٹمٹما سکتے تھے۔ ''میں نے بی کام تک تعلیم حاصل کی ہے۔ مگر اب تعلیم اس ملک میں کسی کام کی نہیں ہوتی۔ خاص طور پر ہم جیسے لوگوں کے لئے۔''

''اور تم نے بری صحبت اختیار کر لی؟'' بوڑھے نے کہا۔

''نہیں، میں بری صحبت کیوں اختیار کرتا۔ مجھ سے برا بھلا اور کون ہوگا؟'' اس کی آواز اب بہت دھیمی ہو چلی تھی بلکہ اب وہ اپنی بات خود بھی سن نہیں پا رہا تھا۔ ابھی آسمان میں تارے نہیں ٹمٹمائے تھے مگر وہ انھیں ابھی سے دیکھ رہا تھا جیسے دوسری دنیا اپنا اصلی چہرا دھیرے دھیرے اس کی مرتی ہوئی آنکھوں کے سامنے کھول رہی ہو۔ نالے کے دوسرے کنارے سے گدھ کے بلی کونوچنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ ''اسے مجھ سے دور بھگاؤ۔ اسے مجھ سے دور بھگاؤ۔ ابھی ان کا وقت نہیں آیا۔'' وہ ہیجان میں چیخنے لگا۔

''وہ دور ہیں۔'' بوڑھے نے اس کے غلیظ بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا گرچہ اس کوشش میں اس کی انگلیاں گیلی ہو رہی تھیں۔ ''میں کسی ڈاکٹر کو بلا کر لاتا ہوں۔''

''یہاں کون آئے گا؟'' مرنے والے کی آواز آئی۔ ''تم...تم پولس کے کام میں خوامخواہ ٹانگ اڑا رہے ہو۔''

''مجھے اپنے گھر کا پتہ دو۔''

مرتے ہوئے آدمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی ٹانگوں کا نصف حصہ نالے کے گندے پانی کے اندر ڈوبا ہوا تھا۔ کیڑے اس کی پتلون کے پائنچوں کے اندر رینگ رہے تھے بلکہ ایک آدھ مچھلیاں بھی کلبلا رہی تھیں۔

مرنے کے لئے یہ جگہ اچھی ہے۔ خاص طور پر ہم جیسے لوگوں کے لئے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ہمارے لئے مرنے سے پہلے ہی کیڑے اپنا کام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

'مرنے کے لئے کوئی بھی جگہ اچھی نہیں ہوتی۔' بوڑھے نے حیرت انگیز طور پر اس کی سوچ کو پڑھ لیا تھا۔ 'اور یہ میں جانتا ہوں کیونکہ اب میں بھی کچھ دنوں کے اندر مرنے والا ہوں۔'

نالے کے دوسری طرف ایک بچہ اپنی ناک کے اندر انگلی ڈالے نیم تاریک آسمان کے نیچے کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بوڑھے کو اپنی طرف تاکتے دیکھ کر وہ غائب ہو گیا۔ بڑے پائپ سے گدلے پانی کے گرنے کی آواز اب گہری ہو گئی تھی جیسے سناٹے کو کوئی ان دیکھی تلوار سے کاٹ رہا ہو۔ 'اور تمہارے ماں باپ؟'

زخمی شخص نے کوئی جواب نہ دیا۔ بوڑھے نے اس کی آنکھوں کے اندر جھانکا۔ وہ پتھرا چکی تھیں۔ بوڑھا اٹھ کھڑا ہوا۔ اب اسے اس آدمی سے اس جگہ سے، نالے کے کنارے منڈلاتے چیل اور گدھ سے، بلکہ خود اپنے کتے سے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ بہت مشکل سے اوپر واپس پہنچ پایا۔ اس کوشش میں کیچڑ اور مٹی اس کے ناخنوں کے اندر بھر گئی تھیں۔ وہ چٹان پر بیٹھا ناخنوں کے اندر سے مٹی نکال رہا تھا جب آسمان میں دھیرے دھیرے تارے روشن ہونے لگے جیسے سیارگانِ فلک اپنے دریچے کھولتے جا رہے ہوں۔ نالے کے اندر مردار خوروں کا شور بڑھ گیا تھا۔ ایک گدھ مقتول کے سر پر اپنی چونچ سے ٹھونگے لگا رہا تھا۔

'یہ گندا نالا ہم انسانوں کے اندر سے شروع ہوتا ہے۔' اس نے کتے سے کہا۔ 'ایک دن تم مر جاؤ گے اور خاکروب تمہیں اسی نالے میں ڈال دیں گے۔'

وہ تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر اس نے دہرایا۔ 'ایک دن میں مر جاؤں گا اور میں ایک قبر میں ڈال دیا جاؤں گا جو مجھ سے پہلے مر چکے لوگوں کی سڑی گلی ہڈیوں کے سبب اس نالے سے زیادہ بہتر نہ ہوگا۔'

اس نے اندھیرے میں ٹٹول کر اپنی لکڑی اٹھائی اور شہر کی طرف چل پڑا۔ کتا تھوڑی دیر تک چپ چاپ نالے کے کنارے کھڑا بوڑھے کو پراسرار نظروں سے دھند کے اندر اوجھل ہوتے دیکھتا رہا، پھر وہ دوڑتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے اسی دھند کے اندر غائب ہو گیا۔

☆☆

مٹی کی کہانی

وہ ایک کمہار تھا جس کے بھانڈے برتن بکنا بند ہو گئے تھے کیونکہ بازار میں پلاسٹک کے سامان جو آ گئے تھے جو مقابلتاً مہنگے تو تھے مگر آسانی سے نہیں ٹوٹتے تھے۔ ہاٹ بازار سے بیوپاری اب اس کے پاس کم آنے لگے تھے بلکہ کسی کسی دن تو وہ اپنی جھونپڑی کے باہر مٹی کے تیار سامانوں کے پاس چارپائی پر بیٹھے بیٹھے انتظار ہی کرتا رہ جاتا۔

''تمھیں دوسری طرح کی چیزیں بنانے کی عادت ڈالنی چاہئے۔'' ایک دن اس کی دانشمند بیوی نے کہا۔ اس کا تجربہ کمہار کے مقابلے زیادہ تھا کیونکہ وہ اس سے عمر میں دس سال بڑی تھی جسے کمہار شہر سے بھگا کر لایا تھا اور بیاہ کئے بغیر اس کے ساتھ رہ رہا تھا۔ آس پاس کے گاؤں والوں کو اس بات کا پتہ نہ تھا۔ وہ اسے اس کی بیاہتا ہی سمجھتے تھے۔

''جیسے؟'' کمہار نے پوچھا۔

''بچوں کے لئے مٹی کے کھلونے غریب لوگ پرب تہوار پر اب بھی خریدتے ہیں۔''

''جیسے؟'' اس نے دوبارا پوچھا۔

''جیسے پرندے، جیسے جانور، جیسے چھک چھک کرتی ریل۔''

تو کمہار نے اپنے چاک پر مٹی کے کھلونے بنانا شروع کر دیا۔ اسے پتہ نہ تھا کھلونے کس طرح بناتے ہیں۔ اس نے طوطا بنانے کی کوشش کی تو وہ کچھ اور بن گیا۔ اس نے ہاتھی بنانا چاہا تو پہلے تو اس چیز نے ایک ہانڈی کی شکل اختیار کر لی پھر کچھ بھی بننے سے انکار کر دیا۔ اور ریل گاڑی بنانے کی اس کی پوری کوشش کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ مٹی کا گلاس بن کر رہ گیا جس پر ناک اور کان لگے تھے۔

''نہیں۔ یہ میرے بس کا روگ نہیں۔ میں صرف ہانڈی بنا سکتا ہوں۔'' اس نے چاک کے بیچوں بیچ مٹی کے لوندے کو گردش کرتے دیکھ کر مایوسی کا اظہار کیا۔

''یہ تمہارا وہم ہے۔'' اس کی بیوی بولی۔ ''ایک کمہار چاک سے کیا نہیں بنا سکتا۔ تمہیں کوشش جاری رکھنی چاہئے۔''

تو وہ روز چاک پر محنت کرنے لگا۔ اس کی بیوی اس کے لئے ندی کی آڑ سے چکنی مٹی کھود کھود کر لاتی اور اپنا لہنگا گھٹنوں تک چڑھا کر ایڑیوں سے اسے مسل مسل کر نرم کرتی جاتی جسے کمہار دیکھتے دیکھتے چاک پر برباد کر دیتا۔

ایک دن جب وہ تھکی ہاری جھونپڑی کے برامدے پر دیوار سے ٹیک لگائے سو رہی تھی تو کمہار نے گھومتے چاک سے ایک عجیب وغریب چیز کو ابھرتے دیکھا جو گرچہ اس کی انگلیوں کے بیچ سے ہی ابھر رہی تھی، مگر یہ دیکھ کر اس کی حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا کہ اس نے ہاتھ بھر کا ایک انسان بنا ڈالا تھا جو اپنے دونوں ہات اٹھائے چاک کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ وہ آنکھیں بڑی بڑی کیے اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ دیکھتے دیکھتے ڈیڑھ ہات اونچا ہو گیا۔ اسے اپنی کاریگری پر یقین نہ آیا۔ وہ ابھی اپنی بیوی کو پکارنے ہی والا تھا کہ مٹی کے انسان نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

''ارے باپ رے باپ، یہ میں نے کیا بنا ڈالا؟'' کمہار اپنی گیلی انگلیوں کو حیرت اور خوف سے دیکھ رہا تھا۔ ''یہ میں نے تمہیں بنایا ہے؟''

''اور نہیں تو کیا میں نے خود اپنے پیٹ سے جنم لیا ہے؟'' مٹی کے انسان نے اپنے داہنے ہات کی حکم کی انگلی اس کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اس کے لئے تم ہی ذمہ دار ہو۔ اور اب مجھے نہیں پتہ کہ میں تمہارا شکریہ ادا کروں یا تمہیں بددعا دوں۔''

''ارے تم تو بنتے ہی کوسنے لگے۔'' کمہار نے دھاگے سے اس کے پیر کے تلووں کو کاٹ کر چاک سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

''احتیاط سے احتیاط سے۔'' مٹی کا آدمی درد سے چلایا۔ ''کیا تم چاہتے ہو کہ میرے پیر مڑ جائیں اور میں زندگی بھر کے لئے اپاہج بن کر رہ جاؤں۔''

''گھبراؤ مت، میں بڑی بڑی ہانڈیوں کو کچی حالت میں چاک سے الگ کرنے میں ماہر ہوں۔ تم تو پھر بھی برائے نام اندر سے کھوکھلے ہو۔''

''برائے نام!'' مٹی کے آدمی نے جواب دیا۔ ''ارے میرے اندر تو اتنا کچھ بھرا پڑا ہے کہ تم اس کا اندازا نہیں لگا سکتے۔ انتظار کرو، تم دھیرے دھیرے سب جان جاؤ گے۔''

//////////

وہ تھوڑی دیر پہلے آگ سے تپ کر باہر آیا تھا اور دھوپ میں کھڑا دمک رہا تھا۔ کمہار اپنی جھونپڑی کے برامدے پر لکڑی کے کھمبے سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔ چاک اپنی جگہ ساکت پڑا تھا۔ سامنے کچا راستہ دور تک ایک روشن لکیر کی مانند چمک رہا تھا۔

کمہار نے آنکھیں کھولیں، ایک زوردار انگڑائی لی اور گھر کے اندر چلا گیا۔

''یہ عجیب جگہ ہے۔'' آدھے گھنٹے تک ایک سی حالت میں کھڑے رہنے کے بعد مٹی کے آدمی نے اپنے پپوٹوں کو مسلتے ہوئے سوچا۔ ''اور اس کمہار کے بچے کو تو میرا ذرا بھی خیال نہیں۔''

بات یہ تھی کہ اسے زوروں کی بھوک لگی تھی۔ تو وہ تھوڑی دیر تک تذبذب کی حالت میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ پھر اس نے کمہار کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کمہار کی بیوی نے کھولا تھا۔

''کون ہو تم؟'' اس نے درشتی کے ساتھ پوچھا۔

''لو، اب میں 'کون' ہو گیا۔'' مٹی کے آدمی نے جواب دیا۔ ''تم اپنے خصم سے کیوں نہیں پوچھتیں کون ہوں میں؟ کہاں چھپا بیٹھا ہے وہ نا ہنجار؟''

''عزت سے اس کا نام لو۔'' عورت نے کہا۔ ''اس نے تمہیں بنایا ہے۔ وہ ابھی سو رہا ہے۔''

''اچھا، مجھے بنا کر بہت نیک کام کیا ہے اس نے اور اب سو کر اس سے بھی زیادہ نیک کام کر رہا ہے۔'' مٹی کے آدمی نے غصے سے کہا۔ ''اب میرے پیٹ کی آگ کون بجھائے گا؟''

''ہمارے خود کے لالے پڑے ہیں، تمہارا جہنم کون بھرے گا۔''

''یہ مجھے بنانے سے پہلے سوچ لینا چاہئے تھا۔'' مٹی کے آدمی نے کہا۔

''تم خود اندر آ کر دیکھ لو۔ گھر میں کھانے کے لئے ایک پھوٹا اناج تک نہیں۔''

''ایک تو مجھے بنا ڈالا، اوپر سے مجھے یہ دن دیکھنے پڑ رہے ہیں۔'' مٹی کا آدمی برامدے پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا چہرا ہتھیلیوں کے پیالے میں رکھ لیا تھا اور دور تک پھیلے ہوئے اناج کے کھیتوں کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں سوکھی بالیوں میں ہوا سرسرا رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ اسی حالت میں بیٹھا رہا، پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ کمہار کی بیوی اپنی جگہ کھڑی اس کی طرف

حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اور جب کہ وہ سوچ رہی تھی شاید وہ پھر سے مٹی کی مورتی میں بدل گیا ہو اچانک مٹی کے آدمی نے آنکھیں کھول دیں۔

''اسے نیند سے جگا دو۔ ہمیں ایک لمبے سفر پر جانا ہے۔''

''لمبا سفر!'' کمہار کی بیوی نے کمر پر ہاتھ رکھ کر کہا جس سے اس کے دونوں بھاری کولھے کدو کی طرح لٹک رہے تھے۔ ''اسے کہیں نہیں جانا ہے۔ اپنی پوری زندگی میں وہ اپنے چاک کو چھوڑ کر صرف ایک بار ہمارا شہر آیا تھا اور دیکھ لو میری جیسی بلا اس کے گلے پڑ گئی۔'' جملے کے خاتمے پر اس کی ہنسی ایک لکڑ بگھا کی ہنسی میں بدل گئی تھی۔

''دیکھو، یا تو میرا حکم مانو یا پھر میری ضرورت پوری کرو۔''

کمہار کی بیوی نے لاچارگی سے اس کی طرف دیکھا۔ کمہار سے غلطی تو ہو ہی گئی تھی۔ اب اس کا حکم ماننے کے علاوہ چارا بھی کیا تھا۔

//////

کمہار اور مٹی کا آدمی پگ ڈنڈی پر چلے جا رہے تھے۔ ان سے تھوڑے فاصلے پر سورج ٹیلوں کے اوپر لڑھک رہا تھا جیسے وہ بھی ان کا ساتھ دے رہا ہو۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''کہیں نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''تم سوال مت کرو۔ تم نے مجھے بنا کر سارا بکھیڑا کھڑا کر دیا ہے۔ میں جو کہہ رہا ہوں بس وہ کرو۔''

''ایک دوسرا آسان راستہ بھی ہے۔'' کمہار نے اس کی طرف شرارت سے دیکھا۔

''کون سا راستہ؟''

''کیوں نہ تمہیں توڑ کر واپس مٹی میں ملا دوں۔''

''کیا اس سے تمہارے مسئلوں کا حل نکل آئے گا؟''

''کم از کم تمہارے مسئلے سے تو پیچھا چھوٹے گا۔''

''اگر تمہاری اولاد ہوتی تو کیا تم اس کے ساتھ بھی یہی کرتے؟''

کمہار نے مٹی کے آدمی کو دیکھا اور اپنا سر ہلایا۔

''مجھے معاف کر دو۔ میں واقعی ایک خود غرض انسان ہوں۔''

''معافی مانگنے کی ضرورت نہیں۔ تم صرف اتنا یاد رکھو تم نے مجھے بنایا ہے اور اب میں تمہاری ذمہ داری ہوں۔ تم انسان ہو بھگوان نہیں کہ ہاتھ جھٹک کر پرلوک میں چھپ جاؤ۔''

وہ لوگ ایک چھوٹے سے قصبے میں داخل ہوئے۔ بازار میں لوگ حیرت سے اس مٹی کے آدمی کو دیکھ رہے تھے جو بمشکل کمہار کے گھٹنوں تک پہنچتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے کے لئے اسے کافی تیز قدم اٹھانے پڑ رہے تھے۔ ایک چھوٹی چہار دیواری والے باغ سے گذر کر آخر کار وہ ایک حویلی کے بند پھاٹک کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔

''اس حویلی کا مالک ایک امیر آدمی ہے۔ اس کے تیل کے کئی کل ہیں، کافی زمین جائداد ہے اس کی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسے طرح طرح کی چیزیں اکٹھا کرنے کا شوق ہے۔'' مٹی کے آدمی نے کہا۔ ''مجھے دیکھتے ہی وہ خریدنا چاہے گا۔ وہ جو بھی قیمت دے تم لے لینا۔'' اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اب وہ مٹی کی ایک بے جان مورتی میں بدل گیا تھا۔ کمہار نے حویلی کے پھاٹک کا لوہا بجایا۔

حویلی کے مالک نے اوپر کی منزل سے کمہار کو دیکھا جو ایک مٹی کی مورتی اٹھائے کھڑا تھا۔

''اسے اندر آنے دو۔'' اس نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ کمہار نے اندر آ کر جب مٹی کے آدمی کو صحن پر رکھا تو سب لوگوں کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ ایک بالکل زندہ آدمی لگ رہا تھا جسے صرف آنکھیں کھولنے کی دیر تھی۔ حویلی کے مالک نے دو سو روپے دے کر کمہار کو رخصت کیا۔

کمہار خوش خوش اپنے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا۔ اتنی بڑی رقم پا کر اس کے پیر زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ خود مٹی کے آدمی سے اسے چھٹکارا مل گیا تھا۔ مگر وہ ابھی اپنے جھونپڑے کے قریب پہنچ ہی پایا تھا کہ اس نے دیکھا، مٹی کا انسان تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے دوسری پگڈنڈی سے اس کی طرف چلا آ رہا تھا۔

کمہار کے پیر اپنی جگہ جم گئے۔

''اتنی حیرت سے میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟'' مٹی کے آدمی نے کہا۔ ''روپے نکالو۔''

''تم وہاں سے بھاگ نکلے؟''

''تو کیا میں مٹی کی ایک بے جان مورتی بن کر باقی زندگی گذار دیتا؟''

کمہار نے اسے روپے گن دیے۔ مٹی کا آدمی اس کے ساتھ ساتھ گھر کے اندر داخل ہوا اور اس نے کمہار کی بیوی کو پچاس روپے دیے۔

''یہ ایک ہفتے کا خرچہ ہے۔ اب اس گھر میں اچھا کھانا پکے گا۔''

کمہار کی بیوی کو جب پورا واقعہ معلوم ہوا تو وہ خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ اس نے گرم گرم روٹیاں تیار کیں، سالن پکایا اور پیاز گھی میں ڈال کر دال میں تیز بگھار لگایا۔ تینوں نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور جب کہ کمہار اور اس کی بیوی سونے کی تیاری کر رہے تھے مٹی کا آدمی باہر جانے لگا۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟''

''شراب خانہ۔'' مٹی کے آدمی نے کہا۔ ''جب تک اپنا سارا پیسہ ختم نہ کرلوں مجھے چین نہ ملے گا۔''

وہ آدھی رات کو لوٹا تو نشے میں دھت تھا اور اونچے گلے سے گیت گا رہا تھا۔ اس نے کمہار کی بیوی کو ایک جوڑا چاندی کا کنگن پیش کیا اور کمہار سے کہا۔ ''آج سے تمہاری بیوی کے بستر پر میں سوؤں گا اور تم باہر برامدے میں بستر لگاؤ گے۔''

''اور کیا!'' کمہار کی بیوی نے اس کی تائید کی۔ ''گھر کا مالک وہی بن سکتا ہے جو پیسہ گھر لاوے۔''

اس دن سے کمہار باہر برامدے میں زندگی گذارنے لگا۔ دن کے وقت وہ اپنے چاک کے سامنے بیٹھا آنسو بہاتا رہتا اور رات کے وقت برامدے پر بستر لگا کر سو جاتا۔ مٹی کے آدمی اور اس کی بیوی کی آپس میں ہنسی ٹھٹھول کی آوازیں اندر سے آتی رہتیں۔

اس کے بعد جب بھی پیسہ ختم ہوتا کمہار اسے لے کر کسی قصبے یا گاؤں کا رخ کرتا اور مٹی کا آدمی اپنے نئے مالک کے گھر سے بھاگ آتا۔ کمہار کے دن پھر گئے تھے۔ اس کا چاک بیکار پڑا تھا مگر اس کا پیٹ مقوی غذاؤں سے بھرنے لگا تھا۔ اس کے تن پر اچھے کپڑے بھی آ گئے تھے۔ اس کی زندگی میں صرف ایک کمی تھی، وہ کسی نہ کسی طرح اپنی بیوی کے بستر پر واپس لوٹنا چاہتا تھا جس پر مٹی کے آدمی کا قبضہ تھا۔

//////

آس پاس کے گاؤں دیہات میں اب اس بات کا چرچہ شروع ہو چکا تھا کہ کیسے ایک کمہار مٹی کی مورتی بیچ کر جاتا ہے جو بہت ہی پر اسرار طور پر خریدنے والے کے گھر سے غائب ہو جاتی ہے۔ میلوں ٹھیلوں میں اور ہفتہ وار ہاٹ میں سارے کمہار شک کی نظر سے دیکھے جانے لگے تھے۔ اب تو کمہار کو مٹی کے آدمی کو بیچنے کے لئے بہت دور دراز کا سفر طئے کرنا پڑتا جہاں کوئی انھیں پہچان نہ پائے یا جہاں تک یہ خبر نہ پہنچی ہو۔ مگر اب یہ دوری نہ صرف کمہار کو بلکہ مٹی کے آدمی کو بھی کھلنے لگی تھی کیونکہ اسے اپنے چھوٹے چھوٹے پیروں سے کافی فاصلہ طئے کرنا پڑتا۔

لگتا ہے اب یہ کام چلنے والا نہیں، ایک دن واپسی پر مٹی کے آدمی نے میدان سے گزرتے وقت خود سے کہا۔ لوگ اب اس نا ہنجار کو پہچاننے لگے ہیں۔ اس کا منہ ہی سور کی طرح ہے جسے کوئی ایک بار دیکھے تو ہمیشہ کے لئے یاد رہ جائے۔

اس رات وہ گھر لوٹا تو بہت زیادہ نشے میں تھا۔ اس نے باہر برامدے میں آکر کمہار کی خوب دھلائی کی۔

''سالے، تجھے اور کوئی چہرا نہیں ملا تھا۔ ایسا چہرا جسے دیکھ کر آدمی بھول جائے۔''

''یہ چہرا میں نے بنایا ہے کیا؟'' کمہار نے خون تھوکتے ہوئے کہا۔ اس کے دونوں ہونٹ زخمی ہو گئے تھے۔

''اب عورت کی طرح رونا دھونا بند کر۔''

''اور کیا۔'' اس کی بیوی بولی جو دروازے پر اپنے دراز کولھوں پر ہتھیلیاں رکھے کھڑی تھی۔ ''یہ مرد تھا ہی کب۔ میرا نصیب پھوٹنا تھا کہ میں اس کے ساتھ بھاگ کر آ گئی۔''

''اب تو پھٹے میں ٹانگ مت ڈال۔ ہمیں کوئی نئی ترکیب سوچنی ہوگی۔ سالہ کس کو پتہ تھا اس سنسار میں پیسہ کے بغیر سب کچھ مٹی ہے۔''

دوسرے دن مٹی کا انسان دریا کے کنارے دیر تک چہل قدمی کرتا رہا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ بار بار دریا پار گھنے جنگل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آخر کار اس نے کمہار کے پاس آکر کہا کہ وہ ایک کلہاڑی لے کر اس کے ساتھ چلے۔ دونوں دریا سے گذر کر جنگل کے اندر چلنے لگے۔

''تمہارا ارادہ کیا ہے؟ اب ہم جنگل کی لکڑیاں بیچینگے۔''

''منہ بند کر۔ جو کھاتا ہے ٹھیک سے پچا تا نہیں۔ منہ سے بد بو آتی ہے۔''

یہ جنگل دور پہاڑوں تک پھیلا ہوا تھا۔ مگر کہیں کہیں پر یہ اچانک ختم ہو جاتا اور لہلہاتے کھیتوں کے بیچوں بیچ ایک آدھ گاؤں دکھ جاتے۔ اس صورت میں وہ واپس جنگل کے اندر لوٹ آتے اور ایک نئی سمت چل پڑتے۔ سورج نصف النہار پر تھا جب جنگل میں انھیں کچھ لوگوں کے چلنے کی آواز سنائی دی۔

''جھاڑی کے اندر چھپ جاؤ۔'' مٹی کے آدمی نے کہا اور دونوں پتوں کے درمیان دبک گئے۔ انھیں لنگی کرتے میں دو آدمی دکھائی دئے جو ہاتھ میں ڈنڈا تھامے پیٹھ پر کپڑوں کی گٹھری اٹھائے چل رہے تھے۔

''جولاہے ہیں، گاؤں دیہات کے بنے انگوچھے اور لنگیاں شہر بیچنے جا رہے ہیں۔'' کمہار نے کہا۔

''یہ بری خبر ہے۔'' مٹی کے آدمی نے کہا۔ ''اگر شہر سے واپس لوٹ رہے ہوتے تو ان کی انٹی بھری ہوتی۔''

''تمہارا ارادہ کیا ہے؟''

''منہ بند رکھو۔'' دونوں جولاہے نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ یکا یک مٹی کے آدمی نے اس سے کلہاڑی مانگی۔ ''بھاگتے بھوت کی لنگوٹی سہی۔'' اور وہ دونوں کے پیچھے پیچھے پیڑوں کے درمیان غائب ہو گیا۔ کمہار سانس روکے جھاڑی میں دبکا پڑا تھا کہ جنگل کے اندر سے چیخنے چلانے اور دھینگا مستی کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہیں چلا۔ پے در پے کئی چیخیں بلند ہوئیں اور پھر سناٹا چھا گیا۔ اب صرف پتوں کے درمیان ہوا سرسرا رہی تھی یا کمہار کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی جس سے اسے خود ہول آ رہا تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اسے مٹی کا آدمی دکھائی دیا۔ وہ دونوں ہات میں دو کٹے ہوئے انسانی سر لئے کھڑا تھا جن سے خون ٹپک رہے تھے۔

''بزدل، جھاڑی میں دبک کر بیٹھا ہے۔ باہر کیوں نہیں آتا؟'' اور اس نے دونوں سر جھاڑی کی طرف اچھال دئے۔ کمہار کی گھگی بندھ گئی۔ سر جھاڑیوں کے اوپر لڑھکتے ہوئے اس

کے سامنے ہی آ کر گرے تھے۔

"لگتا ہے پہلے کبھی کٹا ہوا سر نہیں دیکھا۔" مٹی کا آدمی ہنسا۔ "دیکھو، سالے نے دھوتی میں پیشاب کر ڈالا ہے۔"

جو سچ تھا۔

اس نے کمہار کو اپنے پیچھے آنے کا اشارا کیا۔ ایک پیڑ کی جڑوں پر ایک بغیر سر کا دھڑ پڑا ہوا تھا جس سے تھوڑے فاصلے پر دوسرا بغیر سر کا دھڑ گڈھے میں اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔ دونوں گٹھریاں آس پاس ہی پڑی تھیں جن میں سے ایک کھل گئی تھی اور اندر رکھے کپڑے بکھر گئے تھے۔ مٹی کے آدمی نے جولاہوں کے کرتوں کی جیبیں ٹٹولیں اور لنگیوں کی گرہوں کو کھول کر دیکھا۔ انھیں کل ملا کر چالیس روپے ملے۔ دونوں کے ہاتھوں میں قدیم دقیانوسی گھڑیاں تھیں۔ انھیں کھول کر باری باری سے کان سے لگا کر مٹی کے آدمی نے سننے کی کوشش کی۔

"دھت سالوں کی۔ اتنی تھوڑی رقم کے لئے اتنی محنت۔" اس نے گھڑیاں جھاڑی کے اندر پھینک دیں۔

کمہار گونگے کی طرح کھڑا تھا۔ اس کی پیشاب سے گیلی ٹانگیں اب تک کانپ رہی تھیں۔ لاشوں کے آس پاس گھاس اور پتوں پر خون بکھرا ہوا دیکھ کر اسے متلی آ رہی تھی۔

"واپس چلتے ہیں۔" مٹی کے آدمی نے خون سے رنگے کلہاڑے کو اٹھا کر اسے ایک مردے کے کرتے پر صاف کیا۔ "اور اب موتنا بند کر۔ کسی نے دیکھ لیا تو جائیگا حوالات۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا۔"

"تو میں نے کیا ہے کیا؟ تو کسے بیوقوف بنا رہا ہے۔ جیل جائیگا تو، میں تو مٹی کا پتلا ہوں۔"

"ان کپڑوں کو لے چلتے ہیں۔" جولاہے کی ہمت اب تھوڑی لوٹنے لگی تھی۔ "نئے ہیں، کہیں بھی بک جائیں گے۔"

"ابے پاگل ہے کیا، پکڑا جائیگا۔ ہمیشہ روکڑ میں ایمان رکھ۔ پیسے کی اپنی کوئی پہچان نہیں ہوتی۔ وہ جس کے پاس ہوتا ہے وہی اس کی پہچان بن جاتا ہے۔"

دھیرے دھیرے اس نئے دھندے میں جولاہے کو بھی مزا آنے لگا۔ وہ سان پر گھس گھس کر کلہاڑے کی دھار چمکاتا، کٹے ہوئے سروں کے بارے میں سوچتا اور اسے ہنسی آ جاتی۔

لوگ بغیر سر کے کتنے مضحکہ خیز نظر آتے ہیں۔

دونوں آس پاس کے گھنے جنگلوں میں گھومنے لگے۔ کبھی کبھار کوئی بڑا شکار بھی ہاتھ آجاتا۔ مٹی کا انسان بڑا ہی پھرتیلا تھا۔ سارا کام وہی انجام دیتا۔ کمہار صرف دور کھڑا تماشہ دیکھتا رہتا اور آخر میں چیزیں بٹورتا۔ اب تو پہلے کے مقابلے اور بھی زیادہ پیسہ آنے لگا تھا۔ یہی نہیں، سونے کی چین، انگوٹھیاں اور گہنے بھی ملنے لگے تھے جنھیں بیچنے کے لئے مٹی کا آدمی کمہار کو شہر بھیجا کرتا۔

''کسی گاؤں کے سنار کو اس کی بھنک مل گئی تو تم پکڑے جاؤ گے۔'' اس نے جولا ہے کو ہوشیار کیا تھا۔ ''شہر میں کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ وہاں کاروبار ہی اصلی پہچان ہوتی ہے۔''

اب مٹی کا آدمی زیادہ پینے اور گانے لگا تھا۔ اب تو اس نے ایک شوہر کی طرح باقاعدہ کمہار کی جورو کو پیٹنا بھی شروع کر دیا تھا۔ اس کے چھوٹے سے قد سے شہ پا کر کمہار کی جورو بھی اس پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش کرتی مگر وہ اتنا پھرتیلا تھا کہ اس کا پکڑ میں آنا ممکن نہ تھا۔ ایک دن جب مٹی کا آدمی دریا کے کنارے ہمیشہ کی طرح ٹہل رہا تھا اور دونوں گھر کے اندر اکیلے تھے کمہار نے اپنی جورو کے مار سے سوجے ہوئے چہرے کی طرف رحم بھری نظروں سے دیکھا۔

''کیا حال بنا دیا ہے بدمعاش نے تمہارا۔ اب تو تمہیں ہم دونوں کے درمیان کا فرق پتہ چل گیا ہوگا۔''

''منہ بند کر۔'' اس کی بیوی چلائی۔ ''وہ اگر مارتا ہے تو پیار بھی تو کرتا ہے۔ کتنی طرح کے گہنے لا کر دیے ہیں اس نے مجھے۔ اور تو، تو نہ چاک پر اچھا تھا نہ بستر پر۔''

ایک دن مٹی کے آدمی کو اچھے موڈ میں دیکھ کر جولا ہے نے اس سے کہا۔ ''تم میری عورت پر ہات کیوں اٹھاتے ہو؟ وہ میری بیاہتا نہیں ہے۔ کہیں بھاگ گئی تو؟''

''کبھی تم نے اپنی عورت کو مارا ہے؟''

''نہیں۔''

''پھر تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔'' مٹی کا آدمی ہنسا۔ ''عورت کو مارنے کا الگ ہی مزا ہے اور عورتیں مار سے نہیں ڈرتیں بلکہ مجھ سے لو تو اندر سے وہ اسے پسند کرتی ہیں۔ انھیں لگتا ہے ان کا مرد واقعی مرد ہے۔ تم نے کبھی سنا ہے کہ کسی عورت نے مار کے ڈر سے اپنے خصم کو چھوڑا ہو؟''

''نہیں۔''

"تو اپنا منہ بند رکھ اور یاد رکھ بستر ہی وہ میدان جنگ ہے جہاں تم عورت کو جیتتے ہو یا ہارتے ہو۔ باقی ساری باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

دھیرے دھیرے دونوں کی دلیری اتنی بڑھ گئی کہ اب وہ جنگل سے باہر نکل کر گاؤں دیہات کے اکّے دکّے گھروں میں بھی گھسنے لگے۔ ہر طرف ہاہا کار مچ گئی تھی۔ ایک عجیب بلا تھی جو ہر طرف پھیل گئی تھی۔ لوگ جنگلوں سے گذرتے ڈرنے لگے تھے۔ ایک چھوٹے موٹے جانور کا ذکر ہونے لگا تھا جو دو ٹانگوں والا تھا، چھلاوے کی طرح نمودار ہوتا اور آدمی کا سر کاٹ کر لے جاتا۔ گاؤں دیہات کے لوگ اپنے گھروں کے دروازوں اور کھڑکیوں کو بند کر کے سونے لگے۔ شام کے بعد کوئی بھی باہر نکلنے کی ہمت نہ کرتا۔ ڈھور ڈھنگر چرانے والے سورج ڈوبنے سے بہت پہلے ہی گھر لوٹ آتے۔ زیادہ تر گاؤں میں رات رات بھر جاگ کر پہرا دینے کا روج شروع ہو گیا تھا۔ مگر لوگوں کو کام کے لئے گھر سے نکلنا ہی پڑتا، کھیت جانا ہی پڑتا، شہر کا رخ کرنا ہی پڑتا۔ کسی کو اس کمہار پر شک نہ تھا جو ایک کلہاڑا اپنی تھیلی کے اندر چھپائے مٹی کے آدمی کے ساتھ گھوما کرتا کیونکہ مٹی کا آدمی اس سے کافی فاصلے پر پودوں جھاڑیوں میں چھپ چھپ کر چلا کرتا۔ مٹی کا آدمی جیسے جیسے قتل کرتا جا رہا تھا اس کے اندر کا درندہ اور بھی وحشی ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بے انتہا شراب پینے لگا تھا۔ ایک دن نشے کی حالت میں اس نے کمہار کی رکھیل کو اتنا مارا اتنا مارا کہ وہ ٹھنڈی ہو گئی۔ صبح اس کی نیند ٹوٹی تو اس نے کمہار سے جا کر کہا کہ وہ اسے ندی کے تٹ پر لے جا کر جلا دے۔

"تم نے اس ابلا ناری کو مار ڈالا۔" کمہار نے سر پر مٹی ڈال کر اپنی آہ وزاری شروع کی۔

"وہ نہ مرتی تو تمہارے ساتھ اسے بہت دنوں تک زندہ رہنا پڑتا جو اس کے لئے اور بھی برا ہوتا۔" مٹی کے آدمی نے کہا۔ "میں سوکھی لکڑیاں ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔ تم اپنی جورو کو آخری سفر کے لئے تیار کرو۔"

//////

آسمان پر چاند نکل آیا تھا۔ عورت کی راکھ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ دریا کے پانی میں چاند ناؤ بن کر تیر رہا تھا۔

"اب آہیں مت بھرو۔ دنیا میں عورت کی کمی نہیں ہے۔ تم کسی دوسری عورت سے شادی کر سکتے ہو۔" مٹی کے آدمی نے کہا۔ دونوں جھونپڑی کے برامدے میں بیٹھے ہوئے

تھے۔ میدان سے ابلنے والی تیز ہوا کے سبب لالٹین کی روشنی میں دونوں کی پرچھائیاں دیوار پر ناچ رہی تھیں۔

"تاکہ تم اس کے ساتھ سوسکو۔"

"یہ اتنا برا بھی نہیں۔" مٹی کا آدمی سامنے دریا کی طرف تاک رہا تھا۔ "یہ عورت کبھی تمہاری نہیں تھی۔ یہ تمہیں بہت پہلے جان لینا چاہئے تھا۔ اسے میرے جیسے آدمی کی ضرورت تھی۔"

"اگلی عورت میری ہوگی اسے کیسے جان سکونگا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" مٹی کے آدمی نے ایک آہ بھری۔ "عورت کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ سچ پوچھو تو تمہاری جورو نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ ایسی عورتوں کے ہوتے ہمیں جہنم کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"وہ میری جورو نہیں تھی۔"

"وہ جو بھی تھی، تمہاری تھی۔ اب سو جاؤ۔ کل ہمیں جنگل کی طرف جانا ہے۔"

مگر کمہار رات بھر سو نہ سکا۔ اب وہ کچھ کچھ سوچنے لگا تھا۔ صبح مٹی کے آدمی نے اسے نیند سے جگایا۔ "تھوڑی سی شراب بچی ہے ڈکار لو۔"

"رہنے دو۔"

"اب پی بھی لو۔ اس سے ہمت بڑھ جاتی ہے۔"

اس دن ایک اچھا آسامی ہاتھ آ گیا۔ وہ کوئی بڑا سوداگر تھا جو موٹر سائکل پر اپنے دو سنگی کے ساتھ واپس لوٹ رہا تھا۔ تینوں کا سر قلم کرنے کے بعد اس دن کمہار نے پہلی بار مٹی کے آدمی کے ساتھ شراب پی اور ایک طوائف کی کوٹھری میں دونوں نے رات گزاری۔ طوائف کمسن تھی اور مٹی کے آدمی پر جب بھی اس کی نظر پڑتی وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگتی۔

"تم ہنس کیوں رہی ہو؟ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔" کمہار نے کہا۔ "تمہیں اس سے ڈرنا چاہئے۔ وہ کتنوں کے سر کاٹ چکا ہے۔"

"اب رہنے بھی دو۔" مٹی کا آدمی ہنسا۔ "عورتیں کٹے ہوئے سر سے نہیں ڈرتیں۔ میں نے دیکھا ہے وہ تمہیں پسند کرنے لگی ہے۔"

"یہ شراب کا اثر ہے۔ اور پھر میں کئی مہینوں سے کسی عورت کے ساتھ سویا نہیں تھا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ شراب آدمی کے اندر کے مرد کو جگا دیتی ہے۔"

وہ گھر لوٹے تو مٹی کا آدمی بستر پر گرتے ہی خراٹے لینے لگا۔ کمہار اس رات سو نہ پایا اور جب کہ چاند ابھی آسمان پر تھا وہ مٹی کے آدمی کے کمرے میں گیا۔ اس نے دیکھا وہ خراٹے لینا بند کر چکا تھا اور نیند کے عالم میں مسکرا رہا تھا۔ برامدے میں واپس لوٹ کر کمہار نے بوتل کی بچی کھچی شراب ختم کی، کلہاڑا اٹھایا اور مٹی کے آدمی کا سر ایک ہی وار میں دھڑ سے الگ کر دیا۔

"یہ اچھا کیا تم نے۔" مٹی کے آدمی نے آنکھیں کھول کر کہا۔ "اب جلد سے جلد میرا کام تمام کر دو۔"

"ضرور، جیسا حکم آقا۔" اور اس نے کلہاڑے سے دو شدید وار کیے اور مٹی کے آدمی کے دونوں ہاتھ کندھوں سے کٹ کر چارپائی سے نیچے جا گرے۔

"لگتا ہے اب تمھیں مار کاٹ میں مزا آنے لگا ہے۔" مٹی کا آدمی مسکرا رہا تھا۔ "لیکن اس سے کام نہیں چلنے والا۔ اب تمھیں مجھے پھر سے مٹی میں بدلنا ہوگا اور چاک سے دور رہنا ہوگا۔ ورنہ میں لوٹ آؤں گا اور اس وقت تک آتا رہوں گا جب تک تمھارا سر دھڑ سے الگ نہ کر ڈالوں۔"

"میں نے تمھیں بنایا ہے حرامزادے۔" کمہار نے کلہاڑے سے اس کی ٹانگوں کو دھڑ سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمھارے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہوں۔"

"جو تمھیں بہت پہلے کرنا چاہئے تھا۔" مٹی کے آدمی نے دونوں آنکھیں بند کر لیں۔ اب وہ مٹی کے بے جان پتلے میں بدل گیا تھا جس کا سر ہاتھ اور پیر الگ ہو گئے تھے۔ کمہار نے اس کے دھڑ کے کئی ٹکڑے کیے اور ان ٹکڑوں کو ایک ٹوکری میں ڈال کر گھاٹ پر لے آیا۔ آسمان صاف ہو چکا تھا۔ گھاٹ کے پتھر پر رکھ کر اس نے مٹی کے آدمی کے دھڑ کے ٹکڑوں کو اور بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بدلا۔ یہی حال اس نے اس کے ہاتھ اور پیر اور سر کے ساتھ بھی کیا۔ کمہار گھر کے اندر سے ایک بھاری ہتھوڑا اٹھا لایا اور ٹکڑوں کو چور کرنے لگا۔ اس میں اسے کافی وقت لگ گیا۔

مٹی کا آدمی ایک ڈھیر میں بدل چکا تھا جس پر اس کی ایک آنکھ اور ہونٹ رکھے ہوئے تھے۔

"مجھے پانی میں بہا دو۔" مٹی کے آدمی کے ہونٹ ہلے۔ اس کی واحد آنکھ کمہار پر عجیب

انداز سے نکلی ہوئی تھی۔

''میں کمہار ہوں۔ مجھے مت سمجھاؤ۔'' کمہار نے ہتھوڑے کی ایک زبردست وار سے آنکھ اور ہونٹوں کو چور کرتے ہوئے کہا۔

کمہار نے مٹی کے ڈھیر پر پانی ڈال کر اسے اچھی طرح سے نرم کیا۔ پھر بھی اس میں سخت ٹکڑوں کی بھرمار تھی جنھیں وہ ندی کے پانی میں بہاتا گیا۔ جب ساری مٹی بہہ کر جا چکی تو اس نے گھر کے اندر آ کر اپنے ضروری سامان ایک لوہے کے بکس میں ڈالے، گھر کو آگ لگا دی اور لکڑی کے چاک کو جس پر وہ اپنی ہانڈیاں ابھارا کرتا تھا، اس آگ میں پھینک دیا۔

سر پر لوہے کا بکس اٹھائے وہ پگ ڈنڈی پر تیز تیز قدموں سے چلا جا رہا تھا جب آسمان پر سورج نکل آیا۔

کمہار نے باقی زندگی پھر کبھی کسی چاک کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اور راوی کو اس کہانی کے لکھنے میں بڑا مزا آیا۔

☆☆

ڈولفن

سمندر میں طوفان آیا ہوا ہے۔ اسکی موجیں پشتے پر بنی دیوار سے ابل کر سڑک پر آ رہی ہیں مگر ہر بار پلٹتے وقت اس کا تھوڑا سا پانی سڑک پر رہ جاتا ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی پر سرکاری اعلان لوگوں کو سمندر سے دور رہنے کی تلقین کر چکا ہے۔ مگر میں اپنا رک سیک پیٹھ پر تھامے ان موجوں کے سامنے کھڑا ہوں۔ بارش رک گئی ہے۔ کہیں کہیں بادلوں کے رخنوں میں دھوپ کی دھاریاں چمک اٹھتی ہیں اور پھر ماند پڑ جاتی ہیں۔

اس سمندر میں اب کچھ رہ نہیں گیا ہے۔ مجھے کسی ہوٹل کا رخ کرنا چاہئے۔ مگر سمندر کسی مقناطیس کی طرح مجھے روکے ہوئے ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی ان دیکھی طاقت مجھے اس کی طرف ڈھکیل رہی ہو۔ سمندر ایک مخصوص وقفے سے ابلتا ہے، کنارے کی دیوار سے ٹکرا کر دس پندرہ فیٹ تک اچھل جاتا ہے اور میرے عین سامنے تارکول کی سڑک پر آ گرتا ہے۔ سمندر ہر بار مجھے سامنے سے بھگو کر ابلتا ہوا واپس چلا جاتا ہے۔ صرف سڑک پر جھاگ آلود پانی میں بھیگے ہوئے کتے حیرت زدہ سے بھاگتے نظر آتے ہیں یا وہ کیڑے مکوڑے کلبلاتے دکھائی دیتے ہیں جنھیں سمندر وہاں چھوڑ گیا ہے۔ میں اپنے چہرے پر ہتھیلی پھیر کر سمندر کے پانی کو صاف کرتا ہوں، گیلے بالوں میں انگلیاں دوڑاتا ہوں، اپنے ہونٹوں پر آئے ہوئے نمک کے ذائقے کو تھوکتا ہوں اور سوچتا ہوں، دوسرے وقتوں میں اس دیوار پر بیٹھ کر سمندر کی طرف تاکتے رہنا کتنا اچھا تجربہ ہوتا ہوگا۔

واقعہ یہ ہے کہ میں سمندر پہلی بار آیا ہوں اور میرے ساتھ یہ ہو گیا ہے۔

میں سمندر سے واپس لوٹتا ہوں۔ مجھے کسی ہوٹل کی تلاش ہے۔

تقریباً تمام ہوٹل ویران پڑے ہیں۔ مجھے ایک مہنگے ہوٹل میں بہت ہی سستے کرایے پر

کمرا مل جاتا ہے۔ میں نہا دھو کر انٹر کام کی مدد سے ایک بیئر منگواتا ہوں اور تولیہ کمر پر لپیٹ کر بالکنی میں بید کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ میرا کمرا تیسری منزل پر واقع ہے مگر اتنی بلندی پر ہوتے ہوئے بھی یا شاید اسی کے سبب سمندر بالکل قریب دکھائی دے رہا ہے، جسے میں چاہوں تو ریلنگ سے جھک کر چھو سکتا ہوں، جیسے وہ کسی بھی پل ابل کر میرے پاس آ سکتا ہے، مجھے بھگو سکتا ہے، مجھے اس تنگ بالکنی سے اٹھا کر اپنی پراسرار دنیا میں لے جا سکتا ہے۔

''کھانے پر کوئی آف سیزن ڈسکاؤنٹ نہیں؟'' مینو کارڈ پر نظر دوڑاتے ہوئے میں ہوٹل کے ملازم سے پوچھتا ہوں جو کھانے کا آرڈر لینے آیا ہے۔ پیشگی آرڈر نہ دینے پر کھانا نہیں بھی مل سکتا ہے۔

''وہ تو نہیں ہے صاحب۔'' ملازم کہتا ہے۔ وہ غور سے میرے چہرے کا جائزہ لے رہا ہے۔ شاید بہت دنوں بعد اس نے کسی نوجوان کو تنہا سمندر کا رخ کرتے دیکھا ہوگا۔

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ سستہ کرایہ دیکھ کر میں نے ایک مہنگے ہوٹل میں کمرا لے تو لیا تھا مگر دوسرے اخراجات اور کھانے پینے کی چیزوں کی قیمت اپنی جگہ برقرار تھیں۔ میں نے پرچی پر دستخط کرنے سے پہلے بیئر کی قیمت پڑھی: بلیک لیبل اسٹرانگ، نوے روپے، ٹیکس اور روم سروس چارج الگ۔ اگر مجھے کچھ دنوں تک اس ساحل پر رکنا ہے تو مجھے کسی دوسرے ہوٹل کا رخ کرنا ہوگا۔ میں طوعاً کرہاً حتی المقدور کم کھانے کا آرڈر دیتا ہوں۔ میری کنجوسی پر ملازم کے چہرے سے بیزاری ٹپکنے لگتی ہے جسے وہ چھپانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ شاید اسے پتہ چل گیا ہے کہ میں کل صبح کسی دوسرے ہوٹل کا رخ کرنے والا ہوں۔

سمندر رات بھر گرجتا رہا، کھڑکیوں کے شیشے تھپتھپاتا رہا، میرے خواب کے اندر طوفان مچاتا رہا (اس سمندر کی آنکھیں بھی تھیں جیسے وہ کوئی اکٹوپس ہو جس کے لہراتے بازوؤں کے بیچ میں اپنا رک سیک پیٹھ پر تھامے کھڑا ہوں)۔ خالی پیٹ بیئر پینے کے سبب مجھے تیز نشہ چڑھ گیا تھا۔ آدھی رات کو پیاس کی شدت سے میں جاگ اٹھتا ہوں اور اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے پانی کا جگ اٹھا کر بالکنی پر نکل آتا ہوں۔

چاندنی میں نہائے ہوئے بادلوں کے نیچے سمندر مہیب اور کالا نظر آ رہا ہے جیسے وہ کسی بھی پل ابل کر ان ہوٹلوں سمیت پوری دھرتی کو نگل جائے گا۔ مگر نہیں، وہ ایسا کچھ بھی نہیں

کرتا۔ ڈھیر سارا پانی پی کر میں دیر تک ریلنگ کے سامنے کھڑا رہتا ہوں اور سمندر ایک ہی انداز میں ابلتا اور گرجتا رہتا ہے۔ اس کی موجیں کہیں کہیں بالکل سیاہ ہو رہی ہیں جیسے خالق کائنات نے تخلیق کی کہانی لکھتے لکھتے اکتا کر اپنی دوات الٹ دی ہو۔ پانی کے اوپر جمی ہوئی دھند میں دور تک کسی مچھیرے کی لالٹین نہیں چمکتی نہ ہی کسی دخانی جہاز کی روشنی اوپر نیچے ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ مجھے پتہ بھی نہیں چلتا اور بارش پھر سے شروع ہو جاتی ہے۔ کمرے میں واپس آ کر میں روشنی جلاتا ہوں، تولیہ سے چہرا اور بازوؤں کو خشک کرتا ہوں، روشنی بجھاتا ہوں اور سر تکیہ پر ٹکا کر سمندر کا شور سننے لگتا ہوں جس میں کھڑکیوں کے شیشوں سے بارش کے ٹکرانے کا شور بھی شامل ہے۔ بارش میں شدت آ جاتی ہے۔

//////

بارش رات بھر ہوتی رہی تھی۔ صبح سمندر کے کنارے شہر اداس، بے رنگ اور ویران نظر آ رہا تھا۔ آسمان پر تمام بادل اپنی جگہ موجود تھے۔ صرف اتنا ہوا تھا کہ بارش رک گئی تھی اور اس کی جگہ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔

چیک آؤٹ ٹائم دس بجے کا تھا۔ میں نے غسل کیا، چائے پی اور ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ اور اب ایک بار پھر میں رک سیک پیٹھ پر تھامے سمندر کے سامنے کھڑا ہوں جو یکساں شدت و جولانی کے ساتھ پشتے کی دیوار سے گذر کر سڑک پر اپنی ہیبت ناک موجوں کے تازیانے پھینک رہا ہے۔ میں ان موجوں سے بچنے کے لئے سڑک کے دوسرے کنارے بجلی کے کھمبوں کے نیچے چل رہا ہوں۔ راستے سے الگ ہٹ کر لکڑی کی دکانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ تمام دکانیں بند پڑی ہیں۔ ایک جگہ مجھے لوگوں کی ایک غیر متوقع بھیڑ دکھائی دیتی ہے جو ایک مری ہوئی ڈولفن کو نرغے میں لئے کھڑی ہے۔ اس ڈولفن کو رات سمندر کی کوئی بپھری ہوئی موج یہاں پر ڈال گئی تھی۔ اخبار کا ایک فوٹو گرافر مختلف اینگل سے اس کی تصویریں اتار رہا ہے۔ جانے یہ لوگ کس طرح ہر ناممکن جگہ دکھائی دے جاتے ہیں۔ میں ڈولفن کا قریب سے جائزہ لیتا ہوں۔ اس کا بالائی حصہ بالکل سیاہ ہے جب کہ نیچے کا حصہ کم سفید ہے۔ جسامت میں بہت بڑی ہوتے ہوئے بھی اپنے بالکل ہی چھوٹے سے سر اور نصف چاند سے مشابہ دم کے سبب ڈولفن بالکل نقلی نظر آ رہی ہے جیسے پلاسٹک کی بنی ہو جس میں ہوا بھر دی گئی ہو۔ گرچہ اب یہ ایک طرف سے پچکنے لگی ہے۔ یہ

سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک روشن آسمان کے نیچے ایک پر سکون سمندر میں یہ کس شوخی کے ساتھ جہازوں کا پیچھا کیا کرتی ہوگی۔ کیمرا نکال کر میں بھی ایک تصویر لیتا ہوں۔ مگر اس کے لئے مجھے ڈولفن کے بہت قریب جانا پڑتا ہے۔ کیمرے کے اندر سے تاکتے ہوئے مجھے ایسا لگتا ہے جیسے مری ہوئی ڈولفن کی آنکھیں فلیشگن کے آن ہونے کے سبب اچانک جاگ اٹھی ہوں اور مجھے تاک رہی ہوں۔ کچھ کتے تھوڑے فاصلے پر بے چین سے کھڑے ہیں۔ ان کی زبانیں دونوں نچلی دانتوں کے بیچ سے لٹک رہی ہیں۔ مگر وہ ڈولفن سے خوفزدہ بھی ہیں۔ اپنی زندگی میں ایسا جاندار شاید وہ پہلی بار دیکھ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد دوسروں کی طرح اکتا کر میں واپس چل دیتا ہوں۔ مجھے زور کی بھوک لگی ہے۔ مجھے ایک سستے ہوٹل کی تلاش ہے جو سمندر سے زیادہ دور نہ ہو۔ میں ایک مدراسی رستوران ڈھونڈ نکالتا ہوں۔ رستوران کے اندر دو گاہک ایک میز کے آر پار بیٹھے کافی پی رہے ہیں۔ مجھے یاد آتا ہے، رات ملازم نے مجھے کھانا سرو نہیں کیا تھا گرچہ صبح بل چکاتے وقت ہوٹل کے منیجر نے اس کا پیسہ بھی نہیں لیا تھا۔

''اتنی صبح کو ادھر آئلی اِڈلی ملتا سر!'' ملازم اسٹیل کے گلاس میں پانی بھر کر میز پر رکھتے ہوئے کہتا ہے۔ ظاہر ہے اس کا تعلق دکھن بھارت سے ہے۔ اڈلی بالکل ٹھنڈی ہے جسے بے انتہا گرم سانبھر میں ڈبو کر کھاتے ہوئے میں اپنے دوستوں کے بارے میں سوچ رہا ہوں جنھیں میں اپنے پیچھے کلکتہ چھوڑ آیا ہوں۔ انھیں اس پر یقین نہیں آیا تھا۔ اتنی بھری برسات میں بھلا کون سمندر کا رخ کرتا ہے۔ میں رک سیک کی ایک بیرونی چین کھول کر اپنی ڈائری نکالتا ہوں اور اس مخصوص دن کے صفحے پر ڈولفن کا واقعہ لکھتا ہوں۔ 'میں نے آج زندگی میں پہلی بار ڈولفن دیکھی ہے۔ مگر وہ مری ہوئی تھی۔'

کچھ دیر تک میں تذبذب میں مبتلا رہتا ہوں۔ پھر آخری جملے کو کاٹ کر ڈائری واپس چین کے اندر ڈال دیتا ہوں۔ اسی درمیان ملازم میرے سامنے اسٹیل کے گلاس میں کافی رکھ کر چلا گیا ہے جو خود بھی ایک اسٹیل کے کٹورے میں رکھا ہے۔ گلاس بے انتہا گرم ہے۔ پھر بھی اسے اٹھا کر میں ایک گھونٹ بھرتا ہوں۔ مجھے اس کا ذائقہ اچھا لگتا ہے۔

''آپ نے ڈولفن مچھلی دیکھی؟'' دونوں گاہکوں میں سے ایک نے مجھے بنگالی میں

مخاطب کیا ہے۔

''ہاں۔'' مجھے بے چینی کا احساس ہو رہا ہے۔ اگر یہ میمل ہے تو کیا ہم اسے مچھلی پکار سکتے ہیں؟

''یہ اس برسات میں دوسری ڈولفن مچھلی ہے،'' وہ کہتا ہے۔ اس کا ساتھی تائید میں سر ہلاتا ہے۔

''کیا واقعی!'' مگر میں مزید دلچسپی کا اظہار نہیں کرتا۔ اس کے بعد ان کے اندر گفتگو کی ہمت نہیں ہوتی۔ دونوں دھیمی آواز میں آپس میں سرگوشی کرنے لگتے ہیں۔ میں ایک بار پھر اپنے دوستوں کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ میں کلکتہ میں پچھلے پانچ برس سے ہوں۔ اس بڑے شہر میں مجھے اپنی نوکری کے سلسلے میں آنا پڑا ہے۔ مگر میرے دوست، جن میں سے زیادہ تر میرے آفس کے ساتھی ہیں، وہ اسی شہر میں پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں اُن لوگوں کو سمجھنے میں دقت ہوتی ہے جو یہاں پیدا نہیں ہوتے۔

برسات میں کوئی احمق ہی سمندر کا رخ کر سکتا ہے۔ یقیناً! اور دیکھا جائے تو مجھ سے بڑا احمق اور کون ہو سکتا ہے؟ مگر یہ بھی ہے کہ میں نے زندگی میں ہر کام اسی ڈھنگ سے کیا ہے۔ خود میرے آبائی شہر کے لوگ مجھے سمجھ نہیں پاتے۔

''آس پاس کوئی اچھا ہوٹل تو ہوگا؟'' کاؤنٹر پر بل چکاتے وقت مالک یا منیجر، یا وہ جو کوئی بھی تھا، میں اس سے پوچھتا ہوں۔ ''مگر وہ زیادہ مہنگا نہ ہو۔''

''کیوں نہیں۔ اس برے موسم میں یہاں آنے کا یہی تو فائدہ ہے۔ آپ باہر نکل کر دائیں طرف کی گلی میں تھوڑی دور چلیں تو ہوٹل سی گل دکھائی دے گا۔'' نہیں، اس کے لہجے سے لگ رہا ہے اس کا تعلق دکھن بھارت سے نہیں ہے۔ یا پھر کون جانے، وہ بہت عرصے سے ادھر رہ رہا ہو اور یہاں کی زبان سیکھ گیا ہو۔ کچھ لوگوں کے اندر زبان سیکھنے کی فطری صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ ہات کے اشارے سے میری رہنمائی کرتا ہے۔ ''اس میں آپ جیسے تنہا لوگ زیادہ آتے ہیں۔''

یہ ہوٹل سڑک کے بجائے گلی کے اندر واقع ہے۔ مگر سمندر سے دور ہوتے ہوئے بھی گلی سے اس کے بالائی کمروں کی کھڑکیاں دکھائی دے رہی ہیں جو سمندر کی طرف کھلی ہوئی ہیں۔ وہاں سے سمندر صاف دکھائی دیتا ہوگا کیونکہ ہوٹل اور سمندر کے بیچ سمندری سامان بیچنے والوں کی

نیچی گمٹیاں ہیں یا

لکڑی کی مندر نما دکانیں۔ رک سک پیٹھ پر اٹھائے چوبی زینہ طئے کرتے ہوئے جب میں سی گل کے آفس کے اندر داخل ہوتا ہوں جو کہ اس کی درمیانی منزل پر واقع ہے تو مجھے منیجر کاؤنٹر پر دکھائی نہیں دیتا۔ دو افراد ملاقاتیوں کے لئے بنے ہوئے صوفے پر بیٹھے گفتگو میں مصروف ہیں۔ میری طرح وہ بھی شاید منیجر کے منتظر ہوں۔ دونوں ادھیڑ عمر کے ہیں مگر ان کے جسموں کو دیکھ کر لگتا ہے دونوں نے اپنی صحت کا خاص خیال رکھا ہوا ہے۔

میں رک سیک فرش پر رکھ کر کاؤنٹر سے پیٹھ ٹکا دیتا ہوں اور ان کی گفتگو سنتا ہوں۔

''کارگل سے ہندوستان کو سبق لینا چاہئے'' کوتاہ گردن والا آدمی کہہ رہا ہے۔ اس نے برمودا نیکر اور کافی شوخ رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی ہے۔ اپنی صحتمند انگلیوں کو گردن کے پیچھے باندھ کر اس نے اپنی دونوں ٹانگوں کو سامنے کی طرف پھیلا رکھا ہے۔ ''بلکہ میں تو کہتا ہوں ہم باہر سے ہی نہیں اندر سے بھی گھرے ہوئے ہیں۔ ہم خود اپنے ملک میں دشمنوں کو دودھ پلا رہے ہیں۔ ہمیں اس ہرے سانپ کا سر کچل دینا چاہئے۔'' اس کا لمبا ساتھی تائید میں سر ہلاتا ہے۔

''ہرا سانپ؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکل جاتا ہے اور مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ مگر اس وقت تک دیر ہو چکی ہے۔ دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ رہی ہے۔

''آپ کو کمرا چاہئے؟'' لمبا شخص کہتا ہے۔ اس کے سر پر کم گھنے بال ہیں اور حلقوم باہر کی طرف نکلا ہوا ہے۔ ''منیجر صاحب کسی کام سے اندر گئے ہیں، فوراً آ جائیں گے۔ ہم لوگ تو بھئی یہاں آ کر برے پھنسے۔''

''کتنے دنوں سے ہیں یہاں آپ لوگ؟''

''یہ تیسرا دن ہے۔ لگتا ہے اس بار سمندر میں نہائے بغیر واپس جانا پڑے گا۔''

''سمندر پرسکون ہو بھی جائے تو بھی آپ اس میں کیسے نہا سکتے ہیں؟'' میں کہتا ہوں۔ ''یہ سارا سمندر ہی زہریلا ہو چکا ہے۔ WHO نے تو اس میں نہانے سے ممانعت بھی کر رکھی ہے۔''

''کیا واقعی؟ مگر ہم نے تو نہیں سنا۔''

''سارے ملک کی غلاظت دریاؤں کے ساتھ بہتی ہوئی بنگال کی کھاڑی کے اندر داخل

ہوتی ہے۔'' میں کہتا ہوں۔ ''مگر ابھی ابھی آپ لوگ کسی ہرے سانپ کا ذکر کر رہے تھے؟''
''ارے آپ تو بس، آخر اس ملک میں گفتار کی آزادی تو ہے!'' کوتاہ گردن والا کہتا ہے۔
''ویسے آپ اس سے اتفاق تو ضرور رکھیں گے کہ یہ ہرا سانپ اس ملک کے لئے ایک مسئلہ ہے؟''
''اور آپ کا خیال ہے اس کا سر کچل دینے کے بعد ہمارے ملک کی ساری مشکلات ختم ہو جائیں گی؛'' میں کہتا ہوں۔ ''ہاں، کچھ لوگوں نے یہ تجربہ شروع کر تو دیا ہے۔''
''یہ ہوئی نہ بات؛'' وہ اپنی جگہ تقریباً اچھل پڑتا ہے اور ہات کو اپنی گردن سے ہٹا کر میری طرف بڑھا دیتا ہے۔ ابھی میں اس سے ہات ملا رہا ہوں کہ منیجر آ جاتا ہے۔ وہ کم گو لیکن خوش گفتار ہے۔ کسی ملازم کی غیر موجودگی میں وہ خود مجھے کمرا دکھانے لے جاتا ہے۔

ہوٹل کے سارے کمرے خالی پڑے ہیں۔ میں سب سے اوپر کی منزل پر ایک کمرا پسند کرتا ہوں۔ اس کمرے کی اپنی کوئی بالکنی نہیں ہے مگر کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر آپ سمندر کو دیکھ سکتے ہیں جو یہاں سے کچھ زیادہ ہی وسیع اور آسمان پر سورج کی افقی کرنوں کے پھیل جانے کے سبب سفید دکھائی دے رہا ہے۔ میں منیجر کے ساتھ نیچے جا کر رجسٹر کی خانہ پری کرتا ہوں۔ اسی دوران ایک ملازم وارد ہوا ہے جو میرا رک سیک میرے منتخب شدہ کمرے میں لے جاتا ہے۔
''ویسے اس ہرے سانپ کا واقعہ دلچسپ تھا؛'' میں مڑ کر دونوں سے ہات ملاتا ہوں۔
''میرا خیال ہے آئندہ بھی ہم لوگ اس پر گفتگو کر سکتے ہیں۔''
''ہرا سانپ مسٹر عرفان؟'' منیجر رسید کاٹتے ہوئے سر اٹھا کر تجسس سے میری طرف دیکھتا ہے۔ ''میں سمجھا نہیں۔''
''یہ لوگ میرا ہی تذکرہ کر رہے تھے؛'' میں جواب دیتا ہوں اور رسید لے کر اپنے کمرے کی طرف لوٹنے کے بجائے واپس سمندر کی طرف چل دیتا ہوں اور چلتے چلتے ایک بار پھر ڈولفن کے پاس پہنچ گیا ہوں۔

اب ایک کانسٹبل اس پر پہرا دے رہا ہے۔ ڈولفن کو اس کی جگہ سے ہٹا کر ایک دکان کے عقب میں کر دیا گیا ہے اور اب اس کی آنکھیں پشتے کی دیوار سے ابھرتی موجوں کی طرف تاک رہی ہیں۔ شاید وہ بھی میری طرح اس سمندر کی نفرت کو پہچانتی ہے، مگر اس کے ساتھ جینے پر مجبور ہے۔ یہ سمندر جس کے بغیر نہ وہ جی سکتی ہے نہ میں۔

میں ڈولفن کو بھول کر سمندری دیوار کے ساتھ چلنے لگتا ہوں۔ موجیں یکساں شدت کے ساتھ ابل رہی ہیں مگر وہ دیوار تک پہنچنے سے پہلے لوٹ جاتی ہیں۔ پشتہ جہاں پر گھوم گیا ہے وہاں پر موجیں کافی اوپر اٹھ رہی ہیں اور پشتے کی دیوار سے گذر کر پوری نفرت کے ساتھ میری طرف آنا چاہتی ہیں۔ اس کا جھاگ سے بھرا ہوا پانی میرے وجود کو ڈھک لینا چاہتا ہے، میری آنکھوں میں اپنا سارا نمک بھر دینا چاہتا ہے۔ مگر میں ہر بار پیچھے ہٹ جاتا ہوں کیونکہ مجھے پیچھے ہٹنے کا فن معلوم ہے۔ میں جانتا ہوں اپنی حفاظت کے لئے میرے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں اور میں آسمان میں چمکتے بادلوں کی طرف تاکتے ہوئے سوچ رہا ہوں، کسی اچھے موسم میں، پشتے کی دیوار پر بیٹھ کر پرسکون سمندر کی طرف تاکتے رہنا یا پھر اس میں اتر کر ڈولفن کی طرح پانی میں غوطے لگانا کتنا اچھا تجربہ ہوتا ہوگا!

☆☆
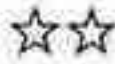
دو سارس کی اوڈیسی

دنیا پر جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے جب چلکا جھیل کے پانی پر کھڑے دو سارس نے وقت سے
قبل سائبیریا لوٹنے کا فیصلہ کیا۔

''جنگ کے اسلحے بہت زیادہ بیچے جا چکے ہیں،'' نر سارس نے کہا۔''اب ایک بڑی جنگ کا ہونا لازمی ہے تاکہ یہ اسلحے ختم ہو جائیں ورنہ سمندر پار ہتھیار بنانے کے سارے کارخانے بند ہو جائیں گے۔''

''تم نے ایسا کوئی کارخانہ دیکھا ہے؟'' مادہ سارس نے دریافت کیا۔''ورنہ زیادہ تر لوگ سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں۔''

''میں نے ایک ریگستان پر پرواز کے دوران ایٹمی دھماکہ دیکھا تھا۔ ہمارے بہت سارے ساتھی اس دھماکے کے بہت قریب اڑ رہے تھے۔ وہ پھر کبھی نظر نہ آئے۔ رہا کارخانہ تو سارے کارخانے مجھے ایک سے لگتے ہیں، آگ اور دھواں اگلنے والے، کسی ڈریگن کی طرح۔''

دونوں سارس اپنی لانبی پتلی ٹانگوں پر کھڑے غور سے پانی کے اندر تاک رہے تھے جو بدنصیب مچھلیوں کا مسکن تھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، یہ سفر ضروری ہے؟'' مادہ سارس نے دریافت کیا۔

''بالکل،'' نر سارس نے کہا۔''پہلے بھی کئی بار دونوں ملکوں نے سرحد پر اپنی فوجیں اکٹھی کی تھیں مگر اس وقت اس کرتب کا ایک سیاسی مقصد تھا۔ اس بار معاملہ سنجیدہ ہے۔ ہمیں پرواز کر لینی چاہئے۔''

"کیوں نہ ہم دوسروں کو بھی یہ مشورہ دیں۔ ان لوگوں کے لئے ہمارا کچھ تو فرض بنتا ہے۔" مادہ سارس نے پانی میں ہزاروں کی تعداد میں کھڑے اپنے ساتھیوں کی طرف تاکتے ہوئے کہا جو ایک ٹک پانی کے اندر کلبلاتی مچھلیوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

"نہیں، ہم نے ایسا کیا تو بہت دیر ہو جائے گی۔ یوں بھی تم انھیں یقین نہ دلا پاؤ گی، بلکہ یہ ایک نئے مسئلے کی شروعات ہوگی۔"

"ہمیں کب پرواز کرنی ہے؟"

"بس ذرا سورج ڈوب جائے۔ رات کے اندھیرے میں ہمیں کوئی واپس جاتے نہیں دیکھ پائے گا۔ ورنہ ہمیں ہر ایک کو کیفیت دینی ہوگی۔"

//////

رات ساحل پر ایک پاگل نے پہلا الاؤ روشن کیا اور دور تک لوگوں کے سائے پھیل گئے۔ اس الاؤ میں کاغذ کم اور پولیتھین کے ٹکڑے زیادہ تھے جو بدبودار دھواں چھوڑ رہے تھے۔ آگ بار بار بجھنا چاہ رہی تھی مگر پاگل کے پاس ایک کھوکھلا بانس تھا جس کے سہارے وہ کوڑا کرکٹ کے اس مشکل سے جلتے ہوئے ڈھیر کو سلگائے جا رہا تھا۔

"آہ، یہ دھواں کتنا تلخ ہے۔ میرا تو سر چکرا رہا ہے۔ میں اب مزید پرواز نہیں کر سکتی۔" مادہ سارس نے اڑتے اڑتے نر سارس سے کہا۔ دونوں سمندر کے کنارے سے گذر رہے تھے۔

"اپنے آپ کو سنبھالو۔"

"نہیں،" وہ بولی۔ "مجھے مر جانے دو۔"

"سمندر کا یہ کنارا ہمارے لئے محفوظ نہیں ہے،" نر سارس نے کہا۔ "تم نہیں دیکھتی اس جگہ کس طرح کے لوگوں کا ہجوم ہے؟ ان میں زیادہ تر نشے کی حالت میں ہوں گے۔ اس کا اندازہ تم اس بات سے لگا سکتی ہو کہ اب عورتیں اور بچے ساحل پر نظر نہیں آتے۔"

"یوں بھی مجھے مر جانا ہے، مجھے اس سے کیا۔" اور مادہ سارس پاگل کے الاؤ کی روشنی کو اپنی منزل بنا کر تیر کی طرح نیچے اتری اور ایک چٹان پر آ کر اپنی عادت کے مطابق ایک ٹانگ پر کھڑی ہوگئی۔ دوسرا سارس اس کے پیچھے پیچھے ہی اس کے پاس اترا تھا اور بڑے غصے میں نظر آ رہا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا ایک وردی پوش کانسٹبل ڈنڈا تھامے پاگل کے الاؤ کے پاس

دکھائی دیا۔

''اے پاگل، ساحل کو گندا کیوں کر رہا ہے بے؟'' کانسٹبل کہہ رہا تھا۔ وہ کوتاہ گردن والا ایک بدنیت انسان تھا جو ہر رات نشے کی حالت میں گھر لوٹنے کا عادی تھا۔ ''یہ سالے پاگل، اب انھیں کون سمجھائے۔''

پاگل مسکرا رہا تھا مگر یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ کیوں مسکرا رہا تھا۔ کانسٹبل الاؤ میں تھوکتا ہے اور بیٹھ کر پولیتھین کے ٹکڑوں کو جلتے دیکھ رہا ہے۔ پھر وہ مٹھی میں ریت بھر بھر کر چنگاریوں اور شعلوں پر پھینکنے لگتا ہے۔ ''کتنی بدبو چھوڑ رہا ہے یہ۔ اے پاگل...'' اور وہ واپس لوٹتا نظر آتا ہے۔

''وہ پاگل نہیں ہے۔'' نر سارس نے کہا۔

''تمہیں کیسے پتہ؟''

''میں نے انسانوں کو بہت سوچا ہے۔ یاد کرو جب سائبیریا کے کیمپوں میں پہلی بار ریزر کے تار لگائے گئے، کیا ہم لوگوں نے نہیں کہا تھا، یہ کیمپ ملک کو پاگلوں سے پاک کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ مگر جو لوگ ان کیمپوں میں ڈالے گئے کیا وہ پاگل تھے؟''

''ہاں، ہاں، وہ پاگل ہی تھے۔ اور میں نے ایسا بھی ایک پاگل دیکھا تھا جو خود کو شاعر کہتا تھا اور برف پر اپنے اشعار لکھا کرتا کیونکہ اس کے پاس لکھنے کے لئے قلم کاغذ تھے ہی نہیں۔ اب تم یہ نہ کہنا کہ وہ پاگل نہ تھا۔''

''مجھے نہیں معلوم۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ شروع شروع میں مجھے یہ سب کچھ بہت سیدھا سادا لگا تھا۔ مگر پھر میں نے انسانوں کو سوچنا شروع کیا اور میں نے دیکھا، اس انسانوں کی دنیا میں صرف پاگل صحیح الدماغ لوگ ہیں، وہی اس قابل ہیں کہ اپنے ایلدورادو کو پا سکیں۔''

''یہ بار بار تم انسانوں کے کسی ایلدورادو کا ذکر کرتے رہتے ہو۔ کیا ہم سارسوں کے لئے ایسے کسی ایلدورادو کا وجود نہیں؟''

''نہیں۔ یوں بھی ہم سارسوں کا کوئی ایلدورادو ہوتا تو وہاں بھی ہم شکار ہی کئے جاتے۔''

''مگر یہ پاگل، مجھے یقین نہیں آتا، اور تم کہتے ہو وہ پاگل نہیں ہے۔''

''میں نے تم سے یقین کرنے کے لئے یہ سب کچھ نہیں کہا ہے۔''

''آہ، اس الاؤ کے بجھتے ہی اب میں بہت راحت محسوس کر رہی ہوں،'' مادہ سارس

نے تاریک چٹان پر اپنی ٹانگ بدلتے ہوئے کہا جس پر وہ اتنی دیر سے کھڑی تھی۔ ''کیوں نہ ہم اپنی پرواز جاری رکھیں؟''

''نہیں، ہمیں آرام کی ضرورت ہے۔ ہم پو پھٹنے سے پہلے یہاں سے نکل جائیں گے۔''

''تم اتنے عقلمند کیوں ہو؟''

''کیونکہ میں ایک سارس ہوں جس نے دنیا دیکھی ہے۔''

اندھیرے میں پاگل کو دونوں سارس نظر نہیں آئے تھے۔ وہ ریت پر گھٹنوں کے بل بیٹھا بجھے ہوئے الاؤ کی گرمی کو محسوس کرتے ہوئے آسمان پر تاروں کو پلکیں جھپکتے دیکھ رہا تھا اور ان کی نقل اتار رہا تھا۔

''پچھلی بار جب یہ ہوا تو میں ایک پرانا کوٹ پہنے ہوئے تھا جسے میں نے ایک مرے ہوئے فوجی کے جسم سے اتارا تھا،'' اس نے اپنی خود کلامی شروع کی جس کے لئے وہ مشہور تھا۔ ''میں نے اس کا ایک بٹن چبایا اور اس کا ذائقہ مجھے اچھا لگا، اور میں نے کہا جب جب اس دھرتی پر ظلم ڈھایا جائے گا میں اپنا بٹن چباؤں گا۔''

''مگر کوٹ میں تو صرف چند ہی بٹن ہوتے ہیں اور دنیا میں ظلم کتنا زیادہ ہے؟'' مادہ سارس نے سرگوشی کی۔

''چپ رہو، تم اپنی تمام بیوقوفیوں کے باوجود سارس ہی رہوگی۔''

''پھر میں نے ایک سرکاری بنگلے کی چہار دیواری پر پیشاب کرنے کا منصوبہ بنایا،'' اس نے آگے کہنا شروع کیا۔ ''اس کے اندر دو بھاری بھرکم کتے اپنی عیش کی زندگی گذار رہے تھے گرچہ ان میں سے ایک کو بیٹھے بیٹھے اسپونڈ لائٹس کی بیماری ہوگئی تھی اور دوسرا چپ رہتے رہتے اپنی آواز کھو چکا تھا۔ تو میں نے اپنے کنستر سے کہا، 'آؤ، چونکہ تم اور ہم دونوں پانی سے بھرے ہیں اس لئے تم میرا مسئلہ سمجھ سکتے ہو۔ اور میں نے غور سے دیکھا تو اس کنستر میں اور انسانوں میں مجھے ایک بہت بڑا فرق نظر آیا وہ یہ کہ کنستر میں پانی پینے اور نکاسی کا راستہ ایک ہی ہوتا ہے جب کہ ہم انسانوں کو قدرت نے دو الگ الگ راستے ودیعت کئے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔''

''میں نہ کہتی تھی...'' مادہ سارس بولی۔ ''...وہ پاگل ہے۔''

''اور جب میرے اوپر سے آئل ٹینکر گذر گئی تو میری انتڑیوں پر اس کے پہیوں کے نشان ہمیشہ کے لئے رہ گئے۔ مگر میں نے عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا بلکہ ایک گدھ کی تلاش میں نکل پڑا جو ایک متروک سنگِ میل پر بیٹھا میرے مرنے کا انتظار کرتے کرتے بوڑھا ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا میرے پاس جسم کے نام پر جو کچھ بچا تھا یا تو اسے پیش کر دوں گا یا پھر اس سے کہوں گا کہ اے گدھ، اے کہ آئے دن تو نیست و نابود ہوتا جا رہا ہے اور انسان تیری جگہ لیتے جا رہے ہیں، اگلی بار کے لئے مجھے نہ سوچ کیونکہ میرا ایک لمبی زندگی جینے کا ارادہ ہے۔ اور جب میں اس کی تلاش میں بھٹک رہا تھا تو میں نے ایک دوسرے شخص کو دیکھا جس کا چہرا بالکل مجھ سے ملتا جلتا تھا بلکہ اس نے بھی میری طرح کا ایک کوٹ پہن رکھا تھا جس کے بٹن چبائے ہوئے تھے۔ وہ دریا کے کنارے دیوار پر بیٹھا گذرتی کشتیوں کو ہری جھنڈی دکھا رہا تھا۔

'شٹ اپ!' میں نے اس سے کہا۔ 'یہ کوئی سڑک نہیں اور نہ ہی تم کوئی ٹریفک کانسٹبل ہو۔ اور یاد رکھو، میں اس طرح کی بکواس چیزوں کو دیکھنے کا عادی نہیں ہوں۔'

'عالی جناب، مجھے پتہ ہے۔' وہ میری طرف دیکھے بغیر جھنڈی ہلاتا رہا۔ 'مگر آپ کو بھی پتہ ہونا چاہئے کہ یہ وہ دریا ہے جس سے حملہ آور اپنی کشتیوں میں توپ اور طمنچوں کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں اور گولوں سے ہمارے گھروں میں سوراخ بنا دیتے ہیں۔ اور دیکھو...' اس نے ایک سرخ جھنڈی دکھائی۔ 'میں یہ جھنڈی دکھا کر انہیں روک دوں گا۔ میں ان سے کہوں گا واپس لوٹ جاؤ، اب اس ملک کے اندر ہماری اپنی خود کی جنگیں شروع ہو چکی ہیں، اب ہمیں کسی باہری حملہ آور کی ضرورت نہیں۔ تم کیوں اس کا حصہ دار بننا چاہتے ہو؟'''

''حیرت ہے،'' مادہ سارس نے کہا۔ ''ان پاگلوں کا حافظہ کتنا تیز ہوتا ہے۔ مجھے تو لوگوں کی زیادہ تر باتیں یاد ہی نہیں رہتیں۔ ایک آدھ جملے جو یاد رہتے ہیں دہراتے وقت انہیں بھی میں لاشعوری طور پر بدل دیا کرتی ہوں۔''

''ایک پاگل اور سیانے آدمی میں کچھ تو فرق ہوتا ہے،'' دوسرے سارس نے کہا۔ ''آہ، دیکھو، تم نے پھر بیوقوفی کی بات کی۔ دیکھو ہم نے اس کے کچھ جملے کھو دئے۔''

''گھبراؤ مت، تم نے کچھ بھی نہیں کھویا ہے۔ وہ پاگل چپ ہو چکا ہے۔ اور اب دیکھو، پو پھٹ رہا ہے۔''

دونوں سارس نے اپنے پر پھیلائے، ٹانگیں سمیٹیں اور آسمان کی طرف پرواز کر گئے۔
کچھ دیر پرواز کرنے کے بعد مادہ سارس نے نیچے دیکھا۔
''نیچے لگ رہا ہے آتش بازیاں چھوٹ رہی ہیں۔'' اس نے اپنی پرواز جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''شاید لوگ بادشاہ کے استقبال کے لئے اپنے گھروں سے نکل آئے ہیں۔''
''احمق، یہ آتش بازیاں نہیں ہیں۔ یہ انسانوں کے گھر جل رہے ہیں،'' سارس بولا۔
''لگتا ہے تمہاری آنکھیں اور نتھنے دونوں کمزور ہو گئے ہیں۔''
''کاش، اب جو میں دیکھتی ہوں تو لگتا ہے ان کا کمزور ہو جانا ہی اچھا ہے۔''
دونوں ایک بڑے شہر کے بیچوں بیچ پرواز کر رہے تھے۔ نیچے روشنیوں کا جال بچھا ہوا تھا اور رہ رہ کر سائرن اور گولیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔
''میں اس شہر میں اترنا چاہتی ہوں،'' مادہ سارس بولی۔ ''میں نے اس طرح کے شہروں کے بارے میں بہت سنا ہے۔ ایک سارس اس سے ہو کر آئی ہے۔ اس نے اس کے چوراہوں پر ابلنے والے فواروں کا ذکر کیا تھا۔ کاش میں وہ سارس ہوتی۔'' اور اس سے پہلے کہ دوسرا سارس کچھ کہتا وہ غوطہ لگا کر نیچے کی طرف جانے لگی۔ روشنیوں کے نقطے جو ایک دوسرے کو چھو رہے تھے اب ان کے درمیان فرق بڑھتا گیا، عمارتیں بڑی اور مینار اونچے ہوتے گئے اور دونوں آگے پیچھے اڑتے ہوئے ایک قلعے کی فصیل پر آ کھڑے ہوئے جس کے نیچے پتھریلے راستے سے بکتر بند گاڑیاں گذر رہی تھیں۔ ''یہاں کتنا سکون ہے،'' مادہ سارس بولی۔ ''تم نے گھروں کے جلنے کا جھوٹ کیوں گڑھا؟''
''احمق،'' نر سارس نے جواب دیا۔ ''احمق، یہ قلعے والا علاقہ ہے۔ یہاں صرف فوج رہتی ہے۔ مگر بہتر ہے کہ ہم آبادی کی طرف نہ جائیں۔''
''تمہارا مطلب کیا ہے؟'' مادہ سارس بولی۔ ''میں اتنا قریب آ کر بیوقوف کی طرح لوٹ جاؤں۔ مجھے ایک جلتا ہوا گھر دکھاؤ، ورنہ میں اگلی بار... اگلی بار... تم سمجھ رہے ہو نا میری بات؟''
''عورت...'' نر سارس نے غصے میں کہا۔ '' کچھ ہتھیار ہر وقت استعمال نہیں کئے جاتے۔ مگر ٹھیک ہے۔ آؤ ہم پھر سے اس شہر کے اوپر پرواز کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے لئے یہ آخری شہر ہوگا۔ اس کے بعد ہم کسی شہر کو اپنے راستے پر آنے نہ دیں گے۔ وعدہ کرو، اب تم صرف

میرے کہنے پر چلوگی۔''

''اڑوگی کھوڈارلنگ، تم بہت جلد غصے میں آجاتے ہو۔ تمہیں اپنا بلڈ پریسر چیک کرانا چاہیے۔ کیوں نہ ہم تھوڑا پیار کرلیں؟''

''کیوں نہیں۔'' اور دونوں پیار کرنے لگے۔ دیوار کے طاقچے پر بیٹھے ہوئے ایک الّو نے آنکھیں بند کر کے یہ بدتہذیبی برداشت کی، کچھ کبوتروں نے اپنے پر پھڑ پھڑا کر احتجاج کیا، ایک گرگٹ نے اسے ایک غیر ضروری عمل قرار دے کر اسے نظر انداز کیا اور ایک گلہری کو یہ فعل اتنا مضحکہ خیز نظر آیا کہ وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ کھانے لگی۔

پھر دور کسی گرجے کی گھنٹی بجی اور دونوں الگ ہوگئے۔

''شکریہ!'' مادہ سارس بولی۔

''Any Time'' نر سارس نے کہا۔ دونوں نے اپنے پر پھیلائے اور شہر کے اوپر اڑنے لگے اور اب جب کہ وہ نیچے نیچے اڑ رہے تھے انھیں جلتے گھروں کی گرمی اپنے پروں کے اندر تک محسوس ہو رہی تھی، بلکہ اٹھتے دھووں سے گوشت کے جلنے کی بو بھی آ رہی تھی۔

''لگ رہا ہے جنگ شروع ہو چکی ہے۔ ہمیں یہاں سے نکل لینا چاہیے۔''

''نہیں، یہ جنگ نہیں ہے، مگر تم نے پہلی بار عقلمندی کی بات کی ہے۔'' مگر ابھی انھوں نے آسمان کی طرف رخ کیا ہی تھا کہ انھیں تابڑ توڑ گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ دونوں نے گھبرا کر نیچے دیکھا اور سوچا کہ شاید ان کی زندگی کا آخری لمحہ آن پہنچا ہے۔ مگر نیچے ایک کشادہ چوراہے پر انھیں پولس کے دستے نظر آئے جو اپنے بیونٹ تانے چاروں طرف سے آگے بڑھ رہے تھے اور ان نہتے عورتوں بچوں اور بوڑھوں پر گولیاں برسا رہے تھے جنھیں انھوں نے اپنے نرغے میں لے رکھا تھا۔

''شکر ہے اوپر والے کا،'' مادہ سارس بولی۔ ''میں سمجھی تھی کسی شکاری نے ہمیں اپنا نشانہ بنایا ہے۔ مگر یہ پولس ان لوگوں پر گولیاں کیوں چلا رہی ہے؟''

''بیوقوف عورت، اتنے برسوں سے تم ملکوں ملک سفر کرتی آ رہی ہو، تم نے کچھ بھی نہ سیکھا،'' نر سارس بولا۔ ''مگر میرا خیال ہے ہمیں زیادہ نیچے نہیں جانا چاہیے، ہم بھی کسی گولی کا نشانہ بن سکتے ہیں۔''

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟''

''یہ سماج کے کمزور لوگ ہیں جن پر گولیاں برسائی جا رہی ہیں۔''

''کیا کمزور ہونا کوئی بری بات ہے؟''

''انسانوں کے سماج میں یہ ایک بری بات تو ضرور ہے۔''

''پھر تو اس سلسلے میں ہم سارس زیادہ عقلمند ہیں کیونکہ ہمارا کوئی سماج نہیں، نہ ہمارے پاس کوئی پولس ہے، بلکہ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں ہمارا کبھی کوئی بادشاہ رہا ہو۔''

''اب بس کرو، اپنی تعریف کے پل مت باندھو۔ وہ ویران حویلی دیکھ رہی ہو، وہ جگہ محفوظ لگ رہی ہے۔ چلو وہاں اترتے ہیں۔ چاروں طرف افراتفری کا عالم ہے۔ ابھی سفر کرنا ٹھیک نہیں۔ رات ہم وہاں گذار لیں گے اور کل صبح صبح نکل پڑیں گے۔'' اور دونوں ایک غیر آباد حویلی کی چھت پر اتر گئے جہاں اندھیرے میں منڈیر پر بہت ساری بدروحیں جمع تھیں اور شہر کو جلتے دیکھ رہی تھیں۔

''کتنا دلکش نظارا ہے یہ'' ایک لحیم شحیم بھوت نے کہا جو روحوں سے تھوڑا الگ تھلگ کھڑا تھا اور گرچہ اس کی آواز سنائی دے رہی تھی اس کے ہونٹ ہل نہیں رہے تھے۔ ''اتنے سارے لوگوں کو مرتے دیکھ کر دل میں کتنی ٹھنڈک پہنچ رہی ہے۔''

''اسی لئے تو میں نے اس شہر کو اپنا دائمی ٹھکانہ بنایا ہے'' ایک خبیث نے جس کی گردن نہیں تھی اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو دیکھو، اس خون خرابے کا مزا لینے کے لئے دنیا بھر کے بھوت پریت اس شہر میں جمع ہو گئے ہیں'' ایک چڑیل نے جس کے بال سانپوں کی طرح اس کے ننگے پستانوں پر بل کھا رہے تھے اپنی لانبی پتلی انگلی سے اشارا کیا اور سب نے دیکھا، دور جہاں تک نظریں کام کر رہی تھیں، عمارتوں کی منڈیروں پر ان ہی کی طرح روحیں جمع تھیں اور نیچے تاک رہی تھیں۔ ان میں سے کچھ روحیں آسمان پر اڑ رہی تھیں اور کچھ بھوت پریت تو اتنے دلیر تھے کہ قاتلوں کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے، ان کی تلواروں، بندوقوں اور گنڈاسوں کو چھو رہے تھے بلکہ مقتولوں کے پاس کھڑے ہو کر ان کے مرنے کی بھونڈی نقالی کر رہے تھے۔ دوسری طرف ان سب سے الگ تھلگ ایک بھوت نے پٹرول کا ایک کنستر اپنے اوپر الٹ کر آگ لگا لی تھی اور اب بھاگا بھاگا پھر

رہا تھا جسے دیکھ کر چڑیلوں کو اپنی ہنسی روکتے نہیں بن رہی تھی۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے،'' مادہ سارس بولی۔ ''یہ مجھے تم کہاں لے آئے؟ ہمیں یہاں سے نکل پڑنا چاہیے۔''

''تم نے پھر بیوقوفی کی بات کی۔ بھلا ہمیں ان بھوت پریت سے کیا لینا۔ کیا ہم کوئی انسان ہیں۔ بس آنکھیں بند کرلو اور چپ چاپ کھڑی رہو، رات اپنے آپ گذر جائے گی۔''

دونوں نے چھت کے کونے سے لگ کر آنکھیں بند کرلیں۔ کچھ چڑیلوں کی نظریں ان پر پڑیں اور وہ ان کے گرد جمع ہوگئیں۔ انھوں نے انھیں خوفزدہ کرنے کی بہت کوشش کی، مگر دونوں سارس آنکھیں بند کئے ایک دوسرے سے چپکے کھڑے رہے۔ تھک ہار کر چڑیلیں منڈیر کی طرف واپس لوٹ گئیں۔ انھوں نے دیکھا، شہر کے ایک دوسرے گوشے سے نئے سرے سے آگ کی لپٹیں بلند ہو رہی تھیں۔

ابھی سورج نہیں نکلا تھا مگر آسمان صبح کی دھلی دھلائی روشنی میں کسی شاداب کنول کی طرح کھل اٹھا تھا جب دونوں سارسوں نے اڑتے اڑتے مڑ کر ایک آخری نظر بدنصیب شہر پر ڈالی جو بہت پیچھے چھوٹ گیا تھا مگر جس سے کالے دھووں کے مرغولے اب بھی بلند ہو رہے تھے۔

''یہ انسان آپس میں اتنا خون خرابہ کیوں کرتے ہیں؟''

''بیوقوف،'' نر سارس نے کہا۔ ''اگر وہ مل جل کر امن سے رہیں تو سارس نہ بن جائیں۔''

''کیا ہم سارس برے لوگ ہیں؟''

''یہ تو میں نے نہیں کہا۔''

''تو کیا میں نے کہا ہے؟''

''عورت تم سے بحث کرنا بیکار ہے،'' نر سارس نے تنگ آکر کہا۔

''نہیں، تمہیں بتانا ہوگا، کیا میں بری عورت ہوں؟''

''ارے دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا؟ میں نے ایک بات کہی اور تم نے اس کا بتنگڑ بنا دیا۔''

''نہیں، مجھے بتاؤ، کیا میں بری ہوں؟ اگر تم نے نہیں بتایا تو میں واپس اس شہر میں لوٹ کر ان کمزور نہتے لوگوں میں شامل ہو جاؤں گی اور تمہیں میری لاش ملے گی۔''

''ٹھیک ہے بابا، پوچھو، تم کیا جاننا چاہتی ہو؟''

''یہ انسان آپس میں اتنا خون خرابہ کیوں کرتے ہیں؟''

''یہ تو یہ انسان ہی بتا سکتے ہیں۔ میں تو ایک سارس ہوں۔''

''تمہیں نہیں معلوم؟''

''نہیں۔''

''واقعی؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''نہیں، تم مجھے بیوقوف بنا رہے ہو۔''

''میرا یقین کرو۔''

''پھر تو تم نے خوامخواہ میرا وقت برباد کیا۔'' مادہ سارس نے ہوا میں اپنے پروں کو اور بھی زور زور سے گردش دیتے ہوئے کہا۔ ''اور مجھے دیکھو، میں اب تک تمہیں کافی عقلمند سمجھتی آ رہی تھی۔''

وہ ایک پہاڑ کے اوپر سے گذر رہے تے جس کے ڈھلانوں پر برف جمی ہوئی تھی جب ایک شکاری نے ایک پیڑ کی آڑ سے اپنی بندوق کی لبلبی دبائی اور مادہ سارس نیچے گرنے لگی۔ نر سارس نے سر موڑ کر ایک پل کے لئے اسے دیکھا اور پروں کو تیزی سے گردش دیتے ہوئے آسمان کی طرف اڑتا چلا گیا۔ اس کے بعد بھی اس پر کئی گولیاں داغی گئیں، مگر وہ ان کے رینج سے دور ہو چکا تھا۔

''یہ ایک بالکل جوان سارس ہے۔ مجھے افسوس ہے اس کا جوڑا میرے ہات سے نکل گیا۔'' شکاری نے جھک کر مادہ سارس کے زخمی جسم کو زمین سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ مرنے کے بعد سارس کی گردن اور بھی لمبی ہو گئی تھی اور اس کا سر زمین کو چھو رہا تھا۔ اس کی دونوں آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جن کے بیچ سے خون کی ایک پتلی لکیر بہتی ہوئی اس کی چونچ کی طرف چلی گئی تھی۔

''تمہارا نشانہ اچھا ہے۔'' اس کے ساتھی نے کہا۔ اس کے ہات میں ایک بائنا کولر تھا جس سے آنکھیں لگا کر وہ دور دراز کی چوٹیوں کا جائزہ رہا تھا۔

''ہم خاندانی شکاری ہیں۔'' شکاری نے فخر سے موچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

''یعنی پشتوں سے تم لوگ یہ خون خرابہ کرتے آ رہے ہو۔''

''پشتوں سے۔''

''اس کا ساتھی، جانے بیچارا کیا محسوس کر رہا ہوگا۔''

''پرندوں کے اندر اس طرح کے احساسات نہیں ہوتے۔''

''ہاں...''شکاری کے ساتھی نے بائنا کولر کی مدد سے ایک بار پھر سے پہاڑ کی چوٹی کی طرف دیکھا جس کی برف پر سورج کی کرنیں بیدار ہو رہی تھیں۔''ہر قاتل اپنے مقتول کے بارے میں یہی سوچتا ہے۔''

☆☆

---

*Eldorado

**Spondylitis

گنی پگ

رات کے چار بجے ہیں۔ نصر الدین مئے خانے سے باہر آ کر شہر میں بے مقصد گھوم رہا ہے جب ایک سپاہی اسے روکتا ہے۔

'اتنی رات کو تم کس لئے بھٹک رہے ہو؟'

'جناب' نصر الدین نے جواب دیا۔' اگر مجھے اس بات کا پتہ ہوتا تو گھر نہ چلا گیا ہوتا۔'

مئے خانہ

''مجھے یہاں لانے والا ہی مجھے گھر واپس پہنچائے گا۔''

رومی

پہلی رات

یہ ایک بہت بڑا برتھ ڈے کیک تھا جو اڑن طشتری کی طرح اڑ کر آیا تھا اور میرے سامنے سڑک کی سطح سے ٹکرا کر کسی ملک کے نقشے کی طرح بکھر گیا تھا۔

اور اب مرطوب ہوا میں نیم جلی نیم بجھی موم بتیاں دھیرے دھیرے ڈولتے ہوئے نیچے اتر رہی تھیں۔

میں نے سر اوپر اٹھا کر تیسری منزل کی اس بے انتہا روشن بالکنی کی طرف دیکھا جس سے انسانی سروں کا ہجوم اپنی مخلوط آنکھوں سے نیچے تاک رہا تھا۔

آہ... میں نے سوچا، یہ شہر کی چیخ ہے جو ابھرے بغیر معدوم ہو گئی ہے!

آدھی رات ہو چکی ہے۔ میرے قدم کہہ رہے ہیں مجھے گھر جانے کی جلدی نہیں۔

گھر! کون پرندہ اپنے پنجرے میں واپس لوٹنا چاہتا ہے؟

ایک پولس وین گذر گئی ہے۔ ڈرائیور کے پہلو میں بیٹھا باوردی انسپکٹر میری طرف مشتبہ نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ گاڑی کے عقب میں جلتی سرخ بتیاں میرا منہ چڑاتے ہوئے گذر جاتی ہیں۔ کیا میں اس شہر کی آدھی رات کا متروک چہرا ہوں؟

ہر دوسرے موڑ پر کٹتے میری پرچھائیں سے خوفزدہ میرے پیچھے پیچھے آتے ہیں اور ہمیشہ کی طرح پیچھے رہ جاتے ہیں۔ میری موبائل دو بار بج کر خاموش ہو چکی ہے۔

آرہا ہوں میری آقا! میں سر ہلا کر کہتا ہوں اور موبائل بند کر دیتا ہوں۔

ایک بڑے شہر کے ٹریفک کا کثیف دھواں اب تقریباً زائل ہو چکا ہے۔ انسان اور مشینوں کے شور عنقا ہیں، سڑکیں ویران۔ چاند کا گلوب ایک اونچی عمارت کے برج پر رکھا ہے۔ یہ ایک بازار کا علاقہ ہے جس کے فٹ پاتھ پر سوتے لوگ اسی کا حصّہ نظر آرہے ہیں۔ ایک جگہ ایک دیوقد انسان لکڑی کے اسٹول پر بیٹھا اپنے ہانڈی جیسے پیٹ کو ایک ہات سے تھامے ہانپ رہا ہے اور دوسرے ہات سے تاڑ کا پنکھا اپنے بدن پر جھل رہا ہے۔ شاید اسے دمّے کی بیماری ہے۔ اس کی چرکٹ لنگی اور نیکر سڑک پر جلتے سوڈیم لیمپ کی روشنی میں اسی رنگ کے نظر آرہے ہیں۔ وہ اپنا پنکھا والا ہاتھ اوپر اٹھاتا ہے اور میں رک جاتا ہوں۔

''تم پولس کے آدمی ہو؟'' اس نے اپنی بھرائی ہوئی آواز سے پوچھا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے اس کی آواز اس کے پیٹ کی ہانڈی سے آرہی ہو۔

''نہیں۔'' میں جواب دیتا ہوں۔

''پھر اس طرح اتنی رات گئے کھلے عام گھوم رہے ہو؟ پولس اپنی گاڑی میں اٹھا کر لے گئی تو۔''

''پولس مجھے کبھی نہیں اٹھاتی۔''

''کیوں؟''

''یہ مجھے نہیں معلوم۔'' میں آگے جانا چاہتا ہوں مگر اس کا ہات پھر سے مجھے روک دیتا ہے۔

''مجھ سے کچھ کام ہے؟'' میں پوچھتا ہوں۔

''میں اس فٹ پاتھ پر نہیں رہتا۔''

''کہیں تو رہتے ہو گے۔ مجھے اس سے کیا؟''

''اندر گلی میں میرا گھر ہے۔ مگر یہاں ہوا اچھی چلتی ہے۔ یہاں مجھے سانس لینے میں آسانی ہوتی ہے۔''

گرم ہوا کا ایک جھونکا اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور اس پر سوکھی کھانسی کا دورا پڑ جاتا ہے۔ وہ سینہ مسل مسل کر ہانپ رہا ہے۔ اس کے حلق میں کوئی چیز اٹکی ہوئی ہے۔ وہ عجیب وہ غریب آوازیں نکال رہا ہے جیسے کوئی راکشش اپنے نوکیلے پنجوں سے اس کے پھیپھڑوں کو چیر رہا ہو۔

''تمہیں کسی اسپتال میں ہونا چاہیے۔'' مجھے اس پر ترس آ جاتا ہے۔ ''آکسیجن کے بغیر تم مر جاؤ گے۔''

''میری اس بیماری کا کوئی علاج نہیں۔ یوں بھی مجھے اب اس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں اس کے ساتھ جینا سیکھ گیا ہوں۔''

''پھر تو مرنا ہی تمہاری تقدیر میں لکھا ہے۔'' میں کہتا ہوں۔

سڑک پر دو آنکھیں چمک کر غائب ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک سفید بلی تھی جو فٹ پاتھ کے ریلنگ کی پرچھائیں میں بیٹھی مخدوش نظروں سے میری طرف تاک رہی تھی۔

''وہ اسی جگہ رہتی ہے اور بازار کے چوہوں پر زندہ ہے۔'' بوڑھا میری نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''جب وہ زندہ ہے تو اس سیارے پر کہیں تو اس کا ٹھکانہ ہو گا۔'' میں جماہی لیتے ہوئے لاپرواہی سے کہتا ہوں۔ بوڑھے کا ہات تیسری بار اٹھ کر مجھے جانے سے روک لیتا ہے۔

''تمہیں مجھ سے کوئی کام ہے بڑے میاں؟'' میں اکتا کر پوچھتا ہوں۔

''تمہیں جلدی ہے؟''

''نہیں'' میں کہتا ہوں۔ ''مگر یہاں ٹھہرنے کی بھی کوئی تک نہیں ہے۔''

''میں تمہیں اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔''

''مجھے دلچسپی نہیں ہے۔''

''میں ایک جادوگر ہوں۔''

''یقیناً ہوگے۔ یہ سارا ملک ہی جادوگروں سے بھرا پڑا ہے۔''

''میں وہ جادوگر نہیں جو تم سمجھ رہے ہو، میں تماشہ نہیں دکھاتا۔'' اس نے میری آنکھوں میں تاکتے ہوئے کہا۔ ''میں واقعی ایک جادوگر ہوں۔''

''جادو ایک تماشہ ہی تو ہے۔'' میں کہتا ہوں۔ ''ویسے تم ایک جادوگر ہو تو تم میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہی ہوگے۔''

''بالکل، سچ پوچھو تو میں تم لوگوں کو اچھی طرح پہچانتا ہوں جو گھر لوٹنے سے ڈرتے ہیں۔'' اس کا ہانپنا کم ہو گیا ہے اور میں پہلی بار اس کے ٹھہرے ہوئے چہرے کا جائزہ لیتا ہوں۔ گنجا سر، موٹے موٹے گال، موٹی ناک، عورتوں کی طرح بھاری سینہ، اوپر کی طرف اٹھے ہوئے نتھنے، دوہری ٹھوڑی، گھنے ابرو، داہنا ابرو سانپ کے پھن کی طرح تھوڑا اوپر اٹھا ہوا۔ اس پر زخم کا ایک پرانا نشان تمتما رہا ہے۔ ''تم آسانی سے پہچانے جاتے ہو۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''کسی دیوار پر بیٹھے ہوئے، کسی پارک میں ٹہلتے ہوئے، کسی مارکیٹ میں لایعنی چکر لگاتے ہوئے، کبھی شراب خانے کے اندر، کبھی طوائف کے کمرے میں، کبھی سگریٹ پیتے ہوئے، کبھی ٹرگر دباتے ہوئے، اور اب شہروں میں تمہاری تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔''

''اس کا کوئی علاج؟'' میں پہلی بار اس کی باتوں میں دلچسپی لیتا ہوں۔

''علاج ہے نا۔'' وہ اپنی جگہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ ''میں نے تم سے کہا تھا میں ایک جادوگر ہوں۔''

''ٹھیک ہے مجھے یقین ہے۔'' میں اپنی شیو کھجاتا ہوں۔ ''لیکن تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔''

''تمہارا صرف ایک علاج ہے۔'' وہ میری آنکھوں کے اندر جیسے کسی دوسرے انسان سے مخاطب ہے ''تم غائب ہو جاؤ۔''

''تمہارا مطلب ہے شہر چھوڑ دوں؟'' میرے اندر کا آدمی کہتا ہے۔

''نہیں، غائب ہو جاؤ۔''

''مر جاؤں؟'' اندر کا آدمی پریشان ہو کر پوچھتا ہے۔

"میں ایک بار پھر دہرا رہا ہوں غائب ہو جاؤ۔ اور جب میں کہوں غائب ہو جاؤ تو اس کا دوسرا کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ شہر چھوڑ کر چلے جانا یا دنیا چھوڑ کر چلے جانا یہ انسان کے مسئلوں کا حل نہیں، بلکہ اکثر اس سے مسئلوں میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ اور پھر یہ تمہارے اختیار میں بھی نہیں ہیں۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں ایک آہ بھر کر کہتا ہوں۔ "مگر غائب ہونا بھی کب میرے اختیار میں ہے۔"

"میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ میں نے کہا نا میں ایک جادوگر ہوں۔ تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا چاہئے۔"

اس نے اسٹول اٹھا لیا ہے اور اب کسی دیو کی طرح میرے سامنے کھڑا ہے۔ سوڈیم لیمپ کی مٹیالی روشنی میں گھنی مسخ بھوؤں کے نیچے اس کی آنکھیں گویا میرے اندر کسی برما کی طرح سوراخ کر رہی ہیں۔

"ویسے تمہیں میری ضرورت ہو تو میں اس گلی کے اندر رہتا ہوں۔" اس نے آخری بار کہا ہے۔ "صرف چالیس قدم اور تمہیں ایک لانڈری نظر آئے گی جس کا چولھا چوبیسوں گھنٹے گرم رہتا ہے۔ اس کے آدمی سے میرے بارے میں پوچھ لینا۔ میرا نام سارنگ ہے اور میں تمہارے بہت کام کا آدمی ہوں۔"

اس کے بعد بھی میں دیر تک سڑک پر آوارہ گردی کرتا رہتا ہوں۔ رہ رہ کر اس آدمی کے سوالیہ انداز میں اٹھے ہوئے ابرو کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ اتنے برسوں سے میں اس شہر میں بھٹک رہا ہوں، کچھ چہرے آنکھوں کے سامنے سے ہٹتے ہی حافظے سے غائب ہو جاتے ہیں۔ کچھ دہائیوں تک جنات کی طرح پیچھا کرتے ہیں۔

دوسری رات

میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔ فلائی اوور کے نیچے میں نے ایک ستون کی آڑ میں قئے کیا ہے۔ دریا کی طرف سے تیز ہوا آ رہی ہے۔ اپنے دھندے پر دیر سے نکلی ہوئی ایک طوائف چلتے چلتے لیمپ پوسٹ کے نیچے تھم گئی ہے اور میری طرف دلچسپی سے تاک رہی ہے۔ وہ بھڑ کیلے رنگ کے لباس پہنے ہوئے ہے اور اس نے اپنے بائیں ہات میں ایک موبائل بھی تھام رکھی ہے۔ میں اس

سے کترا کر ستونوں کی آڑ لے کر چلنے لگتا ہوں۔

تھوڑی دور جا کر میں موبائل آن کرتا ہوں۔ اس میں تین مس کال ہیں۔ میں نے موبائل سائلنٹ موڈ میں رکھا ہوا ہے۔ یہ سارے کال میری آقا کے ہیں۔ کہیں بارش ہوئی ہے۔ ہوا میں اچانک خنکی آگئی ہے۔ مجھے شراب کی طلب ہو رہی ہے۔ اب بھی کچھ بار ایسے ہوں گے جن کے دروازے بند نہ ہوئے ہوں گے گرچہ پولس کے قانون کے مطابق آخری پیگ سرو کرنے کا وقت جا چکا۔

''تمہیں ایک پیگ کی سخت ضرورت ہے۔'' مجھے اپنے پیچھے سے نسوانی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ وہی طوائف ہے۔ وہ کتابی چہرے والی ایک ادھیڑ عمر کی عورت ہے جس نے اپنی گردن کو ایک اسکارف سے ڈھک رکھا ہے۔ ''مجھے ایک شراب خانے کا پتہ ہے جو رات ایک بجے تک کھلا رہتا ہے۔ اس میں پولس والوں کے لئے کچھ کمرے مخصوص ہیں تا کہ گھر لوٹنے سے پہلے وہ اپنی پیاس بجھا سکیں۔''

''مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' میں اس کی طرف سے چہرا پھیر لیتا ہوں۔

''پھر آج کی رات پولس لاک اپ میں رہنا پڑے گا؟''

''تمہارا تعلق پولس سے ہے؟''

''میں پچھلے دس برس سے یہاں دھندا کرتی آرہی ہوں۔ پارک اسٹریٹ تھانے کا ہر آدمی مجھے پہچانتا ہے۔''

''میں پچھلے بیس برس سے اس شہر میں آوارہ گردی کرتا آرہا ہوں، میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

''شاید اس سے پہلے ہمارے ستارے ٹکرائے نہ ہوں گے۔ یوں بھی یہ ایک بہت بڑا شہر ہے۔ یہاں لاکھوں لوگ ایک دوسرے سے ملے بغیر ہی فنا ہو جاتے ہیں۔''

''مجھے پولس کے حوالے کر کے تمہیں کوئی انعام مل جائے گا؟''

''ہر رات مجھے ایک دو شریف آدمی پولس کو دینے پڑتے ہیں۔'' وہ کہتی ہے۔ ''وہ ان سے اچھا خاصہ پیسہ وصولتے ہیں۔ یہ میرا تھانے کے ساتھ ایک خاموش معاہدہ ہے۔''

''میں آدمی نہیں، ایک بوجھ ڈھونے والا جانور رہوں۔ مجھے معاف کر دو۔'' میں پھر سے

ستونوں کی آڑ لے کر چلنے لگتا ہوں۔ کچھ دور چل کر میں مڑ کر اس کی طرف دزدیدہ نظروں سے تاکتا ہوں۔ وہ اپنی جگہ کھڑی ایک ٹک میری طرف تاک رہی ہے۔ پہلی بار اس کے پیشے کے پیچھے چھپی بے بس عورت کا مجھے احساس ہوتا ہے۔ وہ حالات کتنے سنگین ہوں گے جو ایک ادھیڑ عمر کی عورت کو آدھی رات اٹھ کر اپنا جسم بیچنے پر مجبور کرتے ہوں گے! کچھ دور جا کر میں مڑ کر دیکھتا ہوں۔ وہ اپنی جگہ اسی طرح بے حس و حرکت کھڑی ہے جیسے کسی مورتی میں ڈھل گئی ہو۔

سارنگ اپنے اسٹول پر بیٹھا بیڑی پی رہا ہے۔ اسے اس واقعے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

''تم بلا ناغہ یہاں بیٹھا کرتے ہو؟'' میں پوچھتا ہوں۔

''صرف گرمی کے موسم میں۔'' وہ کہتا ہے۔ آج وہ گفتگو کے موڈ میں نہیں ہے۔ مجھے بار بار اسے کریدنا پڑ رہا ہے۔

''تمہارے ڈیل ڈول کے سبب علاقے کے سارے لوگ تمہیں پہچانتے ہوں گے یہاں تک کہ کتے بلیاں بھی۔''

''میرا مذاق اڑا رہے ہو؟'' وہ میرے سامنے اپنے بڑے سے چہرے کو اتنا آگے بڑھا دیتا ہے کہ مجھے اس کی سانسیں صاف سنائی دینے لگتی ہیں جیسے اس کے اندر کوئی دھونکنی چل رہی ہو۔

''یہ تم اس لئے کہہ رہے ہو کیونکہ تم مجھے نہیں جانتے۔''

''میں اتنا ہی جانوں گا جتنا تم بتاؤ گے۔''

''اور جو میں بتاؤں گا تم اس پر یقین نہیں کرو گے۔''

''یہ پہلے سے تم نے سوچ لیا ہے۔''

''میں نے کافی دنیا دیکھی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لوگ اپنا صحیح چہرا کبھی نہیں دیتے۔''

''چلو تسلیم کر لیا میں ایسا ہی ہوں جیسا تم کہہ رہے ہو۔'' میں کہتا ہوں۔ ''اگر تمہیں لگتا ہے میں تمہارے لئے صحیح آدمی نہیں تو ہم بیکار اپنا وقت کیوں برباد کر رہے ہیں؟''

''تم اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔ یہاں بیٹھنا تو میرے روز کا معمول ہے۔''

میں آگے بڑھ جاتا ہوں۔ مجھے پیچھے سے اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

''یاد رکھنا، ایک دن، تمہیں میرے سامنے گھٹنے ٹیکنے ہوں گے۔''

''میرے گھٹنے پہلے سے ہی ٹکے ہوئے ہیں'' میں فٹ پاتھ سے اتر کر فٹ برج کی

طرف بڑھ جاتا ہوں جہاں پُل کے اوپر دیسی شراب کی غیر قانونی فروخت شروع ہو چکی ہے۔ سیڑھی سے نیچے اترتے ہوئے دو شرابی لڑکھڑا کر میرے سامنے زمین پر جا گرتے ہیں۔ یہ جگہ قدرے تاریک ہو رہی ہے۔

''دھت تیرے کی، سالہ یہاں تو جمین ہے۔'' ایک جو پہلے گرا تھا اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاید وہ آخری سیڑھی پر چوک گیا تھا۔ دوسرا جو اسی پر گرا تھا اسے چوٹ آئی تھی۔ وہ اپنا کرتا اور بنیان اٹھا کر جسم کو ہات سے ٹٹول رہا ہے۔

''کھون نکلا کا؟'' پہلے شرابی نے پوچھا۔

''کھون رہیو تب نا'' دوسرا شرابی ہنسا۔ ''بہن کا ٹو... یہاں تو سارا کھون پانی ہو چکا ہے۔''

تیسری رات

سارنگ کی کہانی جب شروع ہو چکی ہے تو میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ اسے ختم کئے بغیر چین پاؤں۔ یقیناً بہت بڑا شہر ہے یہ، بہت سارے لوگ یہاں رہتے ہیں۔ ایک سارنگ کو اس کے اندر کھو دینا بالکل آسان ہے، اپنا راستہ بدل لینا اس سے بھی سہل۔ مگر بند ہوتے ہوٹلوں کے بعد جانے کیوں سارا کچھ سمٹ سمٹا کر اس ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتا ہے، سارنگ! سارنگ جس کا پیٹ ہانڈی کی طرح پھولا ہوا ہے اور آسمان پر بادل کا ہلکا سا شبہ ہونے پر بھی جس پر دمے کا دورا پڑ جاتا ہے۔

''میں برسوں سے تمہاری راہ دیکھ رہا تھا۔'' وہ مجھے بتاتا ہے ''اور اب تمہارا میرے ہاتھ سے نکل جانا ممکن نہیں۔''

کہیں پر، شاید ٹرام ڈپو کے اندر کسی پیڑ میں بیٹھی ایک کوئل رہ رہ کر کافی مضبوط آواز سے کوک رہی ہے۔ خلیج بنگال سے آتی ہوا کسی وجہ سے گرم ہے۔ اس گرم ہوا میں رات کے پھولوں کو کھلنے میں سہولت ہوتی ہوگی۔

فٹ پاتھ پر ایک آدمی جاگ گیا ہے اور لنگی اٹھا کر سڑک کے رخ کھڑے ہو کر پیشاب کر رہا ہے۔

اسے اونچی عمارتوں سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی جہاں ایک آدھ کھڑکیاں اب بھی روشن

ہیں۔اس کے کراہنے، قسم کھانے اور ریح خارج کرنے کی آواز ہم دونوں تک آتی ہے۔ میں فٹ پاتھ کے ریلنگ سے کمر ٹکائے اس کی طرف رخ کئے خاموش کھڑا ہوں۔ وہ اپنے ابرو کا پھن اٹھائے اپنے اسٹول پر بیٹھا میری طرف تاک رہا ہے۔

''اب ختم بھی کرو۔'' میں کہتا ہوں۔ ''میں تم سے تھک چکا ہوں۔ مجھے آگے بھی جانا ہے۔''

''تمہیں کہیں نہیں جانا ہے۔'' سارنگ ہنستا ہے۔ یہ اس کے بیمار پھیپھڑوں کی آواز ہے۔ ''تم ایک کتے کی طرح اپنی دم کے پیچھے چکر لگا رہے ہو جس پر کسی نے پٹرول ڈال دیا ہے۔''

''شکریہ۔'' میں کہتا ہوں۔ ''اور کچھ؟ ممکن ہے میں ایک گدھے کی طرح بیٹھا انتظار کر رہا ہوں کہ کب میرا سایہ اٹھ کر اپنا گھر جائے تو میں اپنا گھر جاؤں۔''

''تم اس اسٹول پر بیٹھ جاؤ، بہت دیر سے کھڑے کھڑے تمہارا مزاج گرم ہو گیا ہے۔'' اس نے اپنے نیچے سے اسٹول نکالتے ہوئے کہا۔

''نہیں تم بیٹھو۔'' میں کہتا ہوں۔ ''مجھ سے دوگنی عمر ہے تمہاری۔ ہمیں بڑوں کی عزت کرنی چاہئے۔ مکتب میں ہمیں یہی سکھایا گیا ہے۔''

''لگ رہا ہے تمہیں نشہ چڑھ رہا ہے۔''

''شاید اسی لئے اب میں پوری طرح تمہاری تحویل میں ہوں۔''

''میری کہانی سنوگے، اپنے بارے میں نہیں بتاؤگے؟''

''میں ایک کتا ہوں جو اپنی گردن پر پٹہ ڈالے گھوم رہا ہے اور خود سے پریشان ہے۔ اور تم کہتے ہو میرا صرف ایک علاج ہے، میں غائب ہو جاؤں۔''

''کیونکہ کبھی میں بھی اپنی زندگی سے اوب گیا تھا۔'' سارنگ نے واپس اپنے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں برسوں تک بیمار رہا۔ ایک ایسی بیماری جسے کوئی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ میں گھر میں پڑا رہتا، دیوار گھڑی کے کانٹے ٹک ٹک کرتے رہتے اور قطرہ قطرہ خون میرے اندر ٹپکتا رہتا۔ تم یقین کرو یا نہ کرو میں اسے ٹپکتے سن سکتا تھا۔ میری آنکھیں پیلی پڑ گئی تھیں۔ میری کھوپڑی کے اندر کا سناٹا میرے باہر بھی پھیل گیا تھا جہاں لوگ صرف ہونٹ ہلاتے رہتے اور میں ان کے الفاظ سن نہیں پاتا اور پھر ایک بھیانک دھماکے کے ساتھ یہ سناٹا ٹوٹ جاتا اور ایک عجیب دل دہلا دینے والا انسانی شور مجھے اپنی گرفت میں لے لیتا اور میں دونوں کان ہاتھوں سے دبائے

گھٹنوں کو سینے سے لگانے پر مجبور ہو جاتا۔''

''میں کبھی بیمار نہیں پڑا۔ میرا مطلب ہے، مجھے یاد نہیں میں کتنے برس پہلے بیمار پڑا تھا۔''

''یہ تمہارا وہم ہے۔ آج ہر کوئی بیمار ہے۔ ڈاکٹر صرف وہی علاج کر پاتے ہیں جن بیماریوں کو وہ جانتے ہیں یا سمجھتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں۔ میرے ساتھ یہی معاملہ تھا۔ میری بیماری ان کی سمجھ سے باہر تھی، مگر وہ ڈاکٹر تھے اس لئے دوا تو ان کو ہر حال میں دینا ہی تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ میرا علاج کرتے کرتے تھک چکے تھے۔ میرا تعلق نچلے متوسط طبقے سے تھا۔ آخر کار میرے پاس ڈاکٹروں کے لئے پیسے ختم ہو گئے اور میرے لئے صرف سرکاری اسپتال یا خیراتی شفا خانے ہی رہ گئے۔ یہی نہیں، میری لمبی بیماری سے میرے گھر کے لوگ بھی اکتا گئے تھے۔ پھر میری قسمت پلٹی۔ میرے ایک چچازاد بھائی کو ریلوے کی ایک بڑی نوکری مل گئی۔ اسے مجھ سے خاصی ہمدردی تھی، ہم دونوں ایک ہی کالج میں طالب علم رہ چکے تھے، بہت برا وقت گذارا تھا ہم دونوں نے ایک ساتھ۔ اس نے ریلوے منسٹر کے پی اے سے کہہ کر میرا داخلہ ریلوے اسپتال میں کروا دیا۔ وہاں میرا سب کچھ مفت تھا۔ برسوں تک ریلوے کے مختلف اسپتالوں میں میرا تبادلہ ہوتا رہا۔ پھر میرے بھائی نے اپنے کچھ اور رسوخ استعمال کئے اور ایک بہت ہی بڑے، بہت ہی قیمتی پرائیوٹ اسپتال میں مجھے داخل کر دیا گیا جہاں کافی بڑے بڑے VIPs آیا کرتے، سنٹرل منسٹر، ارب پتی بزنس مین، ہائی فائی پرفیشنل، ماڈل، فلم اسٹار۔ یہ لوگ صاف ستھری راہداریوں میں سفید یونیفارم پہنے مافیا قیدیوں کی طرح گھوما کرتے اور اپنے اپنے کیبن کے اندر سے اپنے بڑے بڑے معاملات چلایا کرتے۔ اور جب میرا سامنا ان لوگوں سے ہوتا تو حیرت سے ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے اور میری طرف تاکا کرتے کیونکہ میں ایک صفر تھا، ایک پہیلی جسے وہ سلجھا نہ پاتے۔ وہاں میری خاص تیمارداری کی گئی، میرا ہر طرح سے علاج کیا گیا، مگر میری حالت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ اور یہ وہ وقت تھا جب صبح شام میں خدا کے حضور سر جھکائے موت کی دعا مانگا کرتا۔''

''تمہیں کبھی خودکشی کا خیال نہیں آیا؟''

''میری حالت اتنی غیر تھی کہ اس کے لئے جس تیاری کی ضرورت پڑتی ہے میرے اندر اس کی طاقت یا صلاحیت نہیں تھی۔'' سارنگ نے کہا۔ ''تو میں کہہ رہا تھا، میں خدا سے ہر گھڑی اپنی موت کی دعا مانگا کرتا، بس اتنا ہوش تھا مجھے اور پھر ایک دن خدا نے میری سن لی۔ تین ڈاکٹر

میرے بستر پر آئے اور انھوں نے مجھے ایک فارم پر دستخط کرنے کے لئے کہا۔ برسوں کی بیماری کے سبب میری انگلیاں ٹیڑھی ہوگئی تھیں، مگر میں نے کسی نہ کسی طرح اس پر دستخط کر دیا۔

'تمھیں پتہ ہے تم نے کس کاغذ پر دستخط کیا ہے؟' ان میں سے ایک نے پوچھا۔

'کس کاغذ پر دستخط کیا ہے؟' میں نے اپنے دھندلے ذہن سے ان کی بات دہرائی۔

'ہم تمہارا ایک نیا علاج شروع کرنے جا رہے ہیں۔ یہ ایک طرح کا تجربہ ہے، جس کے دوران تم مر بھی سکتے ہو بلکہ ننانوے فیصد اس کا امکان ہے کہ تم مر جاؤ گے۔'

'گنی پگ کا نام تم نے سنا تو ہوگا؟' دوسرے ڈاکٹر نے کہا۔ 'یہ ایک امریکی چوہا ہے جو آج ساری دنیا کی لیبارٹریز میں تجرباتی طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ہم تمھیں گنی پگ کی طرح استعمال کرنا چاہتے ہیں۔'

'گنی پگ...' میں نے اس کی بات دہرائی۔ یہ نام میرے لئے ناآشنا تو نہیں تھا مگر اس وقت میرے لئے ایک نئی اہمیت کا حامل نظر آ رہا تھا۔

'ہاں، ایک گنی پگ کی طرح ہم مختلف طرح کی دوائیاں اور اپریشن تم پر آزمائیں گے۔ چونکہ ہمارے پاس تمہارا کوئی علاج نہیں رہ گیا ہے، اب ہمارے پاس یہی ایک راستہ بچا ہے، یوں سمجھ لو آج سے تمہاری زندگی کسی پوسٹ مارٹم ٹیبل پر شروع ہونے والی ہے۔ تمھیں زندہ رہ کر کم وبیش ان سب چیزوں سے گذرنا ہوگا جن سے لوگ مرنے کے بعد گذرتے ہیں۔'

میں نے انھیں بتایا کہ میں اللہ تعالی سے موت کی دعا ہی تو مانگا کرتا ہوں، اور میں جس اذیت میں زندگی گذار رہا ہوں اس سے بڑی اذیت اور کیا ہوگی؟ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں چاہوں تو کاغذ پھاڑ سکتا ہوں۔ وہ کاغذ میرے بستر پر ڈال کر چلے گئے۔ شام کو لوٹے تو میں اسی طرح لیٹا ایک ٹک چھت کی طرف تاک رہا تھا۔ کاغذ اپنی جگہ ایک سی حالت میں پڑا تھا۔ اسے میں نے چھوا بھی نہ تھا۔

'تو تم مرنے کے لئے تیار ہو۔' ایک ڈاکٹر نے کاغذ اٹھا کر کہا۔ 'شاید یہی ایک راستہ رہ گیا ہے جس کے ذریعے تم زندہ بچ سکتے ہو۔'

مجھے ایک الگ کمرا دیا گیا اور ایک سال تک میں موت اور زندگی کی لڑائی رہتا رہا۔ ان دنوں تم مجھے دیکھتے تو تمھیں ایسا لگتا جیسے کسی سفید لاش کو دیکھ رہے ہو۔ میرے بدن کے سارے

بال گر گئے تھے، میرے چبانے کی صلاحیت جاتی رہی تھی، میری آنکھوں میں چھالے پڑ گئے تھے اور مجھے ایسا لگنے لگا تھا جیسے میرے پھیپھڑوں کے اندر گرم سلاخیں ڈالی جا رہی ہوں۔''

''تمھیں اتنا ہوش تھا؟''

''درد اس دنیا کا سب سے طاقتور میڈیم ہے جو ہمارے دماغ تک اپنی بات سب سے تیزی سے پہنچایا کرتا ہے۔'' سارنگ نے کہا۔ ''ایک سال تک مجھے نیند نہیں آئی۔ میں پڑا پڑا چھت اور دیواروں کو تاکتا رہتا۔ پھر ایک دن کئی ڈاکٹر ایک ساتھ میرے کمرے میں آئے۔ انھوں نے مجھے مادرزاد ننگا کر دیا اور ایک میز پر لٹا کر میرے جسم کے ایک ایک حصے کا معائنہ کیا گیا، میری تمام تازہ رپورٹوں کا جائزہ لیا گیا۔ ڈاکٹروں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر سر ہلایا۔ گلاب کا ایک ہار نکال کر مجھے پہنا دیا گیا، ایک ڈاکٹر نے شیمپن کی ایک بوتل کھولی، جھاگ اڑائے گئے، شراب گلاسوں میں انڈیلی گئی اور سب نے جام ٹکرا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ کسی نے ایک گلاس میرے ہونٹوں سے بھی لگا دیا تھا جب کہ سارا وقت میں لوہے کی ٹھنڈی میز پر ننگا پڑا چھت کی طرف تاک رہا تھا۔''

''تو ان کا تجربہ کامیاب رہا؟'' میں نے کانپتے دل سے پوچھا۔

''ہاں۔ پھر بھی مجھے ٹھیک ہونے میں ایک سال کا عرصہ تو لگ ہی گیا۔ میرے بال اگ آئے، ایک فزیوتھیراپسٹ نے میری مڑی ہوئی انگلیوں کا علاج کیا، میری آنکھوں کا اپریشن کیا گیا۔ اسپتال کے ہال میں ایک بڑا جلسہ کیا گیا جس میں ریلوے کے بڑے بڑے افسران کے ساتھ ساتھ اخبارات کے صحافی اور ٹی وی والے بھی آئے اور لوگوں کی تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ مجھے ایک سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا جس میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح سائنس کی ترقی کے لئے میں نے اپنی جان کی قربانی تک دینا منظور کیا تھا۔ مجھے ریلوے کی طرف سے تاحیات پنشن جاری کی گئی۔ اس کے علاوہ آج بیس برس بعد بھی رائٹرس بلڈنگ سے ہر ماہ پندرہ سو اور کلکتہ کارپوریشن کی طرف سے دو ہزار روپے مجھے ملتے رہتے ہیں۔''

''تو یہ ہے تمہاری کہانی۔ ایک گنی پگ۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''مگر تم ایک گنی پگ سے جادوگر کیسے بن گئے؟''

''ابھی میری کہانی شروع کہاں ہوئی ہے۔'' سارنگ زور سے ہنسا۔ اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''تم جیسے کم عمر کے لوگوں میں یہی خرابی ہے۔ تم پُل پر پیر رکھتے ہی ایک چھلانگ لگا کر اس سے گذر جانا چاہتے ہو۔''

''بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔ میں تھوڑا نشے میں ہوں۔''

سارنگ اسٹول اٹھائے میری طرف تاک رہا تھا۔ پھر کچھ کہے بغیر وہ گلی کی طرف مڑ گیا۔ ریلنگ سے پیٹھ لگا کر اس کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے میں چلایا۔ ''گنی پگ، تم اس سے زیادہ کیا ہو؟''

چوتھی رات

''حقیت یہ ہے کہ یہ میری کہانی بھی نہیں ہے۔'' سارنگ اپنے اسٹول پر بیٹھا بہت بے چین نظر آ رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے شہر میں بارش ہو گئی ہے جس سے شہر اور بھی گرم ہو اٹھا ہے۔ میرے بال پسینے سے تر ہیں اور مجھے اس پر غصہ آ رہا ہے۔

''تو وہ ساری کہانی من گھڑت تھی؟''

''کیا میں نے یہ کہا؟'' سارنگ کے ابرو کا پھن اور بھی بلند ہو گیا تھا۔ ''میں نے کہا یہ کہانی میری نہیں، یہ ایک دوسرے آدمی کی کہانی ہے۔''

''دوسرا آدمی!''

''ہاں۔ وہ تمہاری طرح ہی نمودار ہوا تھا اور اپنی زندگی سے پریشان تھا کیونکہ اس کی پرانی بیماری پھر سے لوٹ آئی تھی۔ یہ کہانی اسی کی تھی۔ تب میں نے اسے غائب ہونے کی تجویز پیش کی۔''

''اور وہ غائب ہونے پر راضی ہو گیا۔'' میں مسکرایا۔ ''اور یہاں سے تمہاری کہانی شروع ہوتی ہے۔''

''بالکل۔ مجھ سے اس کی مایوسی دیکھی نہ گئی اور میں نے اسے غائب کر دیا۔''

''اگر واقعی ایسا کوئی آدمی تھا تو اس نے ایک جھوٹی کہانی سنائی تھی۔''

''وہ جھوٹا نہیں تھا۔ اس کا ثبوت میرے پاس ہے۔'' اس نے اپنے کرتے کی جیب سے ایک پیلا ہینڈ میڈ کاغذ برآمد کیا۔ یہ ایک سرکاری لیٹر ہیڈ تھا جس پر انگریزی میں ٹائپ شدہ

الفاظ دھندلے پڑ چکے تھے۔ لیٹر پیڈ کی پیشانی پر اشوک استمبھ کا نشان ابھرا ہوا تھا، دستخط کے نیچے سرکاری مہر لگی تھی اور ریلوے کا ایمبلم۔"

"یہ جعلی سرٹیفکیٹ ہے۔" میں نے کاغذ سے سر اٹھا کر کہا۔ "جعلی اشوک استمبھ، جعلی مہر، جعلی ایمبلم۔ وہ آدمی بھی جعلی تھا اور تم بھی جعلی ہو۔"

"کاش ایسا ہوتا۔ مگر یہ سچ نہیں۔ ویسے یقین کرو میں نے بھی یہی سوچا تھا۔ لیکن جب وہ غائب ہونے پر راضی ہو گیا تو مجھے یقین آ گیا۔"

"اور تم نے اسے غائب کر دیا۔ ٹوپی پہنانے کے لئے میں ہی رہ گیا تھا۔"

"تمہارے یقین نہ کرنے سے مجھے کیا فرق پڑ جائگا۔" اس نے کاغذ واپس چھینتے ہوئے کہا۔ "میں نے کہا تھا اگر تم غائب ہونا چاہو تو میں تمہیں غائب کر سکتا ہوں۔"

"جانے بھی دو، کسی اور کی تلاش کرو۔"

"دراصل تم میں ہمت نہیں ہے۔" سارنگ نے مسکرانے کی کوشش کی مگر اس پر کھانسی کا دورا پڑ گیا۔ اس سے نجات ملنے پر اس نے اپنے چہرے کا پسینہ کرتے کے کونے سے خشک کیا۔ "شاید اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ مجھے سوچنا چاہئے تھا تم بھاگ رہے ہو جو اس بات کا ثبوت ہے کہ تمہارے پاس بھاگنے کے لئے کچھ ہے۔ تم کہیں بھی چلے جاؤ، تم ایک نہ نظر آنے والی رسی کے ذریعے اس چیز سے بندھے رہو گے۔ تم غائب نہیں ہو سکتے۔ تاعمر گنی پگ بنے رہنا تمہاری تقدیر میں لکھا ہے۔ تمہارا علاج نہیں ہو سکتا۔"

"میں کیسے یقین کر لوں۔ تم ایک ایسی بات کر رہے ہو جو عقل تسلیم نہیں کرتی۔"

"تم صرف ہاں کہو، پھر اس شخص کی طرح جس کا مرض لوٹ آیا تھا میں تمہیں غائب کر دوں گا۔" اس حلق سے بلغم نکل آیا تھا جسے اس نے سیدھے ریلنگ کے پائے پر تھوک دیا۔ لگ رہا تھا وہ برسوں سے یہ مشق کرتا آ رہا تھا۔

"اور اگر نہ کر سکے تو؟"

"تو تمہیں کیا فرق پڑے گا۔ میرا پول کھل جائگا۔ کیا سوچ رہے ہو۔ تم چاہو تو وقت لے سکتے ہو۔"

"نہیں، مجھے تمہارا یقین ہے۔" میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہتا ہوں۔ "شاید تم

ٹھیک کہہ رہے ہو، میں بھاگ رہا ہوں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ کچھ ہے جس سے میں بھاگ رہا ہوں۔ مجھے پتہ ہے میں اس چیز سے پوری طرح بھاگ نہیں سکتا۔ مجھے ہر بار لوٹ جانے کی عادت ہے۔ آزادی کے لئے جس قوتِ ارادی کی ضرورت ہے وہ میرے اندر نہیں ہے۔ میرے کچھ سمجھوتے اپنے ہیں، کچھ زنجیریں میری اپنی ڈھالی ہوئی ہیں، کچھ فریب میرے خود کے بنائے ہوئے ہیں اور کچھ زخموں کا میں عادی ہو چکا ہوں۔ میں اس پرندے کی طرح ہوں جو ایک پنجڑے میں پیدا ہوا اور اسی کے اندر مر جانے والا ہے۔''

''میں جانتا تھا تم غائب نہیں ہو سکتے۔'' اس نے ہانپتے ہوئے دردمندی کے جذبے کے ساتھ کہا۔

''ہاں، ساری عمر گنی پگ بنے رہنے کے علاوہ میرے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں۔ میں واقعی اس شہر کا گنی پگ ہوں''

میں ریلنگ سے الگ ہٹ کر فٹ پاتھ سے نیچے اتر جاتا ہوں اور کوڑے کے ایک ڈھیر کو اپنے جوتے کی نوک سے اڑاتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہوں، ٹرام ڈپو کی طرف جہاں سے کسی کوئل کی کوک نہیں ابھرتی۔

آخری رات

ہوا بند ہے۔ فٹ پاتھ پر ایک جگہ کوڑا دان کی دیوار کی آڑ لے کر ایک آدمی اپنی عورت کے ساتھ صحبت کر رہا ہے۔ اس کے بچے اس سے تھوڑے فاصلے پر فٹ پاتھ کے ایک دوسرے حصے پر سو رہے ہیں۔ مرد کے نرخرے سے غرانے کی آواز نکل رہی ہے، شاید اسے اپنے انزال تک پہنچنے میں دقت ہو رہی ہے۔ اس کے نیچے عورت کسی مردے کی طرح خاموش پڑی ہے۔ اپنے اسٹول پر بیٹھا سارنگ ان کی طرف نہیں تاکتا، مگر اسے اس بات کا علم ہے۔ بڑے بڑے عمودی کھمبوں پر سوڈیم لیمپ سورج کے ٹکڑوں کی طرح دہک رہے ہیں۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس لیتا ہے اور اسٹول اٹھا کر گلی کے اندر لوٹ جاتا ہے۔

گلی کو روشنی اور تیرگی نے الگ الگ خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ فضا میں گرم بھاپ اور گیلے کپڑوں کی ملی جلی بو تیر رہی ہے۔ لانڈری کا ناٹا آدمی ایک کاربائڈ لیمپ جلا کر اس کی روشنی

میں کپڑے استری کرنے میں مصروف ہے۔ اس کا چہرا دہکتے کوئلوں کی آنچ سے تمتمارہا ہے۔ سارنگ کو گذرتے دیکھ کر وہ ہات اٹھا کر سلام کرتا ہے۔

سارنگ کے ایک کمرے والے گھر کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ایک بوڑھی لاغر عورت، جس کے بال سن کی طرح سفید ہیں، بستر پر لیٹی اس کی طرف تاک رہی ہے۔ کمرے میں گلی کے لیمپ بھر روشنی ہے۔ اندر کی دیوار پر کھڑکی کی سلاخوں کا سایہ زیبرا لکیریں بنارہا ہے۔ کونے میں پکائے ہوئے چمڑے اور سولوشن کے ڈرم رکھے ہیں، کچھ لوہے کے اوزار اور کیلیں بھی بکھری پڑی ہیں۔ دن کے وقت یہ کمرا چپل کے کارخانے میں بدل جاتا ہوگا۔

سارنگ دروازہ بند کردیتا ہے اور بوڑھی عورت کے سرہانے بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگتا ہے۔

''تمھیں نیند نہیں آتی؟'' وہ پوچھتا ہے۔

''تمہارے جانے کے بعد میں تھوڑی دیر کے لئے سوگئی تھی۔'' بوڑھی عورت کہتی ہے۔

''رات کیا بہت ہوگئی ہے؟''

''نہیں صرف ایک بجا ہے۔''

''پھر کیا کروگے؟ تمہیں تو نیند نہیں آتی؟''

''اتنے سوالات مت کرو۔ تم ہمیشہ سوالوں میں بات کرتی ہو۔ تم سوجاؤ، میں تمہیں دیکھتا رہوں گا۔''

''تم اگر مجھے دیکھتے رہوگے تو میں سو کیسے سکوں گی؟'' بڑھیا مسکرائی۔ ''تم مجھے غائب کیوں نہیں کردیتے؟''

''پھر میں اس دنیا میں اکیلا رہ جاؤں گا۔''

''اکیلے پن سے بہت ڈر لگتا ہے؟''

''بہت۔''

''ایک دن کسی کو تو اکیلا ہونا ہے؟''

''سو تو ہے۔''

بڑھیا دیوار کی طرف کروٹ لے کر سونے کی کوشش کرتی ہے۔ سارنگ اسی دیوار کی طرف تاک رہا ہے۔ گلی میں ہوا بند ہے۔

سرچ لائٹ

جاڑے کا مضمحل سورج...

اس کے باوجود تالاب میں کنول کے پتے روشن ہو اٹھے تھے۔

بوڑھا مانگے رام جو جھونپڑی کے سامنے چارپائی پر بیٹھا اپنے گھٹنوں کو آرام دیتے دیتے اونگھ رہا تھا چونک کر جاگ اٹھا۔ اس نے اپنی نیم سفید بھوؤں کے نیچے جھریوں دار پپوٹوں کو کھول کر دیکھا: تارکول کی سڑک جو پلیا سے گذر کر پلیگ اسپتال کی طرف چلی گئی تھی دور تک سنسان پڑی تھی۔ یادداشت پر زور دینے پر وہ اب بھی اس سڑک پر لاشوں سے بھری بیل گاڑیوں کو رینگتے دیکھ سکتا تھا جن کے پہیوں کو پچاس برس قبل اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے چرخ چوں کرتے دیکھا تھا۔ پلیگ اسپتال سے بہت کم مریض زندہ لوٹتے۔ خود اس نے اپنے ماں باپ کو اس اسپتال میں کھو دیا تھا۔ وہ اسپتال کی عمارت اب کھنڈر میں تبدیل ہو کر بھینس کے غیر قانونی طویلوں میں بدل گئی تھی اور اس کے آس پاس بے زمینوں کی بستی بس گئی تھی۔ پھر بھی لوگ اس جگہ کو پلیگ اسپتال ہی کہا کرتے۔ دوسری طرف شہر پھیلتے پھیلتے تالاب سے گذر کر ریل کی پٹریوں تک پہنچ گیا تھا۔

مانگے رام نے اپنی آنکھوں کی پتلیوں کو پوری طرح پھیلا کر سورج کی طرف غیض بھری نظروں سے دیکھا جو ان کی تاب نہ لا کر تیزی سے ماند پڑنے لگا اور دیکھتے دیکھتے ڈوب گیا۔ وہ مسکرایا۔ یہ اس کا روز کا مشغلہ تھا۔

''تمہیں پتہ ہے پرانے زمانے میں لوگ بہت چالاک ہوا کرتے تھے اس لئے جلد بوڑھے ہو جاتے، آجکل کے ان گدھوں کی طرح نہیں جو بوڑھے ہونا ہی نہیں چاہتے۔'' مانگے

رام نے اپنے لڑکے ہولا پانی سے کہا جو آنگن کی چہار دیواری پر بیٹھا جال کی مرمت کر رہا تھا۔ اس جال کو پھیلانے وہ گھوڑا مارا پہاڑ کے ڈیم کی طرف جایا کرتا۔ مٹی کی یہ چہار دیواری برسات در برسات بارش میں پگھلتے پگھلتے بالکل چھوٹی ہوگئی تھی اور مٹی سے اس کے کنکر سالخوردہ دانتوں کی طرح باہر نکل آئے تھے۔ اکثر اس چہار دیواری پر سانپ اپنی کینچلی چھوڑ جایا کرتے کیونکہ کھردری دیوار پر بدن کو رگڑ کر کینچلی چھوڑنے میں انھیں آسانی ہوتی۔ وہ ابھی چالیس برس کا ہی تھا مگر اس کی آنکھیں بری طرح کمزور ہوگئی تھیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ اسے پتہ تھا اس کا باپ اس سے کیا کہنا چاہتا تھا۔ اس نے سکندا کو دیکھا جو ریلوے کے محراب دار پل کے نیچے سے دوڑتا ہوا باہر آیا تھا اور سڑک سے گزر کر کمہاروں کے میدان کی جھاڑیوں کو سونگھتے ہوئے ان کی طرف آ رہا تھا۔

''دن بدن اس کی ہمت بڑھتی جا رہی ہے۔'' اس نے اپنے باپ سے کہا جو سکندا کے قریب آنے پر اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر رہا تھا۔ '' پُل کے دوسری طرف سنڈر پٹی میں انجنوں کی راکھ میں وہ جانے کیا ڈھونڈتا رہتا ہے۔''

''وہ تین پیڑھی سے ہمارا کتا ہے۔'' بوڑھے نے سکندا کے بدن سے تصوراتی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''اور کتے انسانوں سے زیادہ وفادار ہوتے ہیں۔''

بوڑھے کا اشارا ہولا پانی سمجھ رہا تھا۔ وہ اس کے سب سے بڑے بھائی کے بارے میں کہہ رہا تھا جو ایک آدی باسی عورت کے چکر میں بوڑھے کے لئے ہر ہفتے سر درد پیدا کیا کرتا۔ ابھی پچھلے ہفتے اس نے اپنی ماں کی پٹائی کی تھی۔ مگر ان دنوں وہ ایک دوسرے معاملے میں پھنس کر جیل کی ہوا کھا رہا تھا جس کے پھاٹک کے باہر اس کی کالی کلیٹی رکھیل منڈلاتی رہتی۔ ہولا پانی کی سمجھ میں نہیں آتا اس چھوٹے سے تالاب میں ایسا کیا تھا کہ بوڑھا اس کا پٹہ ہولکر کو دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ اس کی کائیوں کو صاف کرتے کرتے تھک گیا تھا اور اب تو چاروں طرف گھروں کے بن جانے سے اتنے گندے نالے نکل آئے تھے کہ برسات میں اس کا پانی پہلے جیسا صاف نہیں رہ گیا تھا اور چیت کے سورج کو تو دیکھتے ہی تالاب کا پانی کسی زخم کی پپڑی کی طرح سوکھ جاتا۔ یوں بھی یہ تالاب اتنا چھوٹا تھا کہ اس میں مچھلیوں کی کاشت پرلے سرے کی بیوقوفی تھی۔ اگر میں ہوتا تو ہولکر کو یہ پٹہ دے کر اس تالاب اور ہولکر دونوں سے پیچھا چھڑا لیتا اور اپنی کھٹیا پر بیٹھ کر گھٹنوں کو آرام دیا کرتا، اس نے سوچا۔

بوڑھا مانگے رام مسکرا کر ہولا پانی کے چہرے کو پڑھ رہا تھا۔ وہ کیا سوچ رہا تھا وہ اچھی طرح سمجھ پا رہا تھا۔ وہ پیدائشی بیوقوف ہے، یہ ہولا پانی، اسی لئے جہاں اس کے دوسرے بیٹے بیٹیاں زندگی کی دوڑ میں دوسری طرف نکل گئے جہاں وہ اچھی یا بری مگر اپنی زندگی گذار رہے تھے وہ چہار دیواری پر بیٹھا جال کی مرمت کرتا رہ گیا۔ اگر یہ پٹہ وہ ہولا پانی کی بجائے ہولکر جیسے لچے کو دے دے تو ہولا پانی کے لئے زندگی گذارنا مشکل ہو جائگا۔ اوپر سے ہولا پانی کی بیوی بانجھ تھی جس پر بڑھیا ہر وقت چلاّیا کرتی۔ ہولا پانی کو اپنی ماں بہت عزیز تھی۔ وہ بڑھاپے میں چھہارے کی طرح سوکھ گئی تھی۔ اس کا جی چاہتا وہ ہر دم اپنی ماں کی آنکھوں کے سامنے رہے۔ وہ اپنی ماں کے درد کو سمجھتا تھا، مگر کرانتی کو چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ ایک دانشمند انسان کی طرح اس نے دونوں کے جھگڑے سے خود کو الگ رکھا تھا۔ اور بوڑھا مانگے رام اس معاملے میں اس کا ساتھ دیتا۔

''عورتوں کے جھگڑے آج تک بھگوان نہیں سلجھا پائے، ہم اور تم کس کھیت کی مولی ہیں۔'' وہ ہولا پانی کی ڈھارس بندھاتا مگر جانے کیوں ہولا پانی کو یہ اچھا نہ لگتا۔ اسے اپنی ماں اور اپنی بیوی کے خلاف کچھ بھی سننا پسند نہ تھا۔ بوڑھو کو پتہ نہیں، میں ہر رات کتنی محنت کرتا ہوں اور ایک دن کرانتی کو حاملہ کر کے دم لوں گا اور سب لوگ حیران رہ جائیں گے۔ مگر بوڑھا مانگے رام کو سب پتہ تھا۔ وہ ہر دوسری تیسری رات ہولا پانی کے کمرے سے کھٹیا کے بولنے کی آواز سنا کرتا اور آہ بھرتا۔

''یہ ہولا پانی۔'' وہ سوچتا۔ ''یہاں بھی بیچارا بدنصیب نکلا۔''

سکندا اس کی کھٹیا کے نیچے دبک کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے اپنی تھوتنی زمین پر رکھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں جیسے اب کبھی انھیں کھولنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو۔ ہولا پانی بیوقوف ہے، مانگے رام سوچ رہا تھا۔ سکندا جوان ہو چکا ہے اور اسے ایک ساتھی کی تلاش ہے۔ اس نے ضرور سنڈریٹی میں راکھ کے ڈھیر پر کسی کتیا کا سراغ لگا لیا ہوگا۔

ہولا پانی نے جال بنتے بنتے آسمان کی طرف دیکھا جس میں دو سفید لکیریں قینچی کی طرح ایک دوسرے کو کاٹ رہی تھیں۔

''آسمان پر کچھ ہے۔'' اس نے کہا اور اسے بھول گیا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ بوڑھا مانگے رام نے پہلے پہل اس کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ ہولا پانی بیوقوفی کی

بہت ساری باتیں کر جایا کرتا تھا۔ پھر اس نے لاشعوری طور پر آسمان پر نظر دوڑائی۔ آسمان اب سرمئی ہو چلا تھا جس میں دونوں دودھیا لکیریں سیدھی پگڈنڈی کی طرح دور تک چلی گئی تھیں اور رہ رہ کر ایک دوسرے کا راستہ کاٹ رہی تھیں۔ چونکہ ابھی پوری طرح اندھیرا نہیں ہو پایا تھا اس لئے انھیں ہولا پانی کی کمزور آنکھیں سمجھ نہیں پا رہی تھیں۔

''بدھو۔'' مانگے رام نے کہا۔ ''شہر میں سرکس آیا ہوا ہے۔ یہ اسی کے سرچ لائٹ کی روشنی ہے۔''

''سرکس۔'' ہولا پانی اپنے بیڑی سے سیاہ ہو چکے دانتوں سے ہنسا۔ ''مجھے سرکس پسند ہے۔''

''سرکس کسے پسند نہیں؟ ہم لوگ بہت چھوٹے سے جانوروں کے کرتب دکھا دکھا کر اس پسند کے لئے تیار کئے جاتے ہیں۔'' مانگے رام نے ہنس کر کھٹیا کے نیچے سوتے سکندا کی تھوتھنی کو تھپتھپایا۔ ''مجھے یاد ہے ہم لوگ جب چھوٹے تھے تو سرکس کے لئے کیا کچھ نہ کیا کرتے۔ کیوں سکندا، تمہیں تو پتہ ہوگا۔ تم تو تین پیڑھی سے ہمارا کتا ہو؟''

ہولا پانی اپنا سر کھجانے لگا۔ وہ اپنی جورو کو سرکس دکھانا چاہتا تھا، مگر بوڑھا مانگے رام اتنا ہی قلاش تھا جتنا وہ۔ اس نے فیصلہ کیا وہ کل گھوڑا مارا پہاڑ کے ڈیم پر سورج نکلنے سے پہلے ہی پہنچ جائیگا۔ اسے ڈھیر ساری مچھلیاں پکڑنی ہوں گی اور ریلوے کراسنگ کے بازار میں بیچنا ہوگا جہاں سرکاری کوارٹروں میں رہنے والے مچھلیوں کے شوقین دھوتی کرتا پہنے بنگالی بابو اپنی اوپر کی آمدنی سے بھری جیبوں اور خالی تھیلیوں کے ساتھ آیا کرتے تھے۔

''پچھلے چالیس برسوں سے میں نے کوئی سرکس نہیں دیکھا۔'' مانگے رام نے کہا۔ ''نہ ہی یہ سرچ لائٹ اب سرکس والے استعمال کرتے ہیں۔ مجھے حیرت ہے، مگر یہ اچھا لگتا ہے۔ شہر بہت پھیل گیا ہے پھر بھی یہ روشنی تم کوسوں دور سے دیکھ سکتے ہو۔ انھیں دیکھ کر ہی دور دراز کے گاؤں سے لوگ سرکس دیکھنے آتے ہیں۔''

''پھر تو مچھلیاں بھی اسے دیکھتی ہونگی۔'' ہولا پانی ہنسا۔ اس سے زیادہ مذاق کرنا اسے نہیں آتا تھا۔ اندھیرا اتنا ہو گیا تھا کہ اب جال کی مرمت کرنا ناممکن ہو گیا۔ اس نے اپنی دھوتی سے ایک ادھ جلی بیڑی برآمد کی اور اسے جلانے کے لئے گھر کے اندر چلا گیا جہاں کچے کوئلے کا دھواں چھپر کے کھپریلوں سے باہر نکل رہا تھا جیسے کسی انسان کے نتھنوں سے خارج ہو رہا ہو۔ سکندا

بھی اس کے پیچھے پیچھے بڑھیا کی دھتکار کھانے اندر چلا گیا۔ مانگے رام دیر تک اپنی جگہ بیٹھا آسمان پر روشنی کی دونوں لکیروں کو دھندلے تاروں پر قینچی چلاتے یکھتا رہا۔ ایک مال گاڑی چنگھاڑتی ہوئی محراب دار پل سے گذری۔ ایک تارا آسمان پر لکیر کھینچ کر غائب ہو گیا۔ جلاہوں کے گھروں سے عورتوں کے جھگڑنے کا شور بلند ہوا۔

''پچھلے چالیس برس سے کچھ بھی نہیں بدلا۔'' مانگے رام نے ٹھنڈی آہ بھر کر سوچا۔ ''اور میرے مرنے کے بعد بھی سب کچھ ایسا ہی چلتا رہے گا۔''

//////

مانگے رام کبھی کبھار سکندا کے ساتھ پیدل بہت دور نکل جاتا جہاں ڈھلان پر دھان کے کھیت تھے، نشیب کی طرف گیلی مٹی کی زمین تھی اور ٹیلوں پر کھڑے دیسی کھجور کے کوتاہ قد پیڑوں سے رس کی سیاہ ہانڈیاں عورتوں کے پستانوں کی طرح لٹکتی رہتیں۔ سکندا کو مانگے رام کا ساتھ پسند تھا۔ کبھی کبھی وہ کھیت کی منڈیر کے اندر چھپے کسی چوہے کو ڈھونڈ نکالتا اور شکار کرنے سے پہلے اس کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ یا وہ کسی پانی کے گڈھے میں کسی رنگین چڑیا پر کود پڑتا۔ مانگے رام کو پتہ تھا سکندا ایک بے رحم جانور ہے۔ اس لئے وہ اپنی مضبوط تیل پلائی ہوئی لاٹھی تیار رکھتا۔ مگر سکندا اتنے دنوں سے مانگے رام کے ساتھ رہ رہا تھا کہ وہ اس کے مزاج کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ اس کی لاٹھی کے داؤں پیچ سے بھی اچھی طرح واقف ہو گیا تھا اور سا ذو نادر ہی اس گھاؤ کھاتا۔ پچھلی بار وہ چوک گیا تھا اور لاٹھی کچھ زیادہ زور سے اس کی پیٹھ پر پڑ گئی تھی۔ اس نے بلبلا کر مانگے رام پر حملہ کر دیا مگر شاید اپنے جرم کا احساس ہوتے ہی دُم اور سر کو چاروں ٹانگوں کے بیچ ڈال کر اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

''تمہیں انسان بنانا بہت مشکل ہے سکندا۔'' مانگے رام نے اپنی عینک کے شیشوں کے اندر سے دور گھوڑا مارا پہاڑ کے سیلہوئٹ کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں کم از کم پرندوں پر رحم کھانا چاہئے۔''

اس دن سکندا کو پیچھے چھوڑ کر وہ واپس لوٹا تو اس نے دیکھا بڑھیا چوٹی پکڑ کر کرانتی پر ہنٹر چلا رہی تھی۔ یہ ہر ہفتے دو تین بار ہو جایا کرتا۔ اس نے دلچسپی نہیں دکھائی۔ مگر بوڑھیا کب اسے بخشنے والی تھی۔

''ہولا پانی صبح کا گیا گھر نہیں لوٹا اور اسے کچھ نہیں پتہ۔'' اس نے بوڑھے مانگے رام کی

چار پائی کے پائتانے کھڑے ہوکر اپنی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اتنی دبلی پتلی تھی کہ لگتا تھا اس کی ہڈیوں پر صرف کھال مڑھ دی گئی ہو۔ بیڑی اور کالی چائے، وہ صرف ان پر زندہ تھی۔ ''اور بوڑھو کو تو کتے سے فرصت ہی نہیں۔''

''وہ گدھا لوٹ آئے گا۔'' مانگے رام نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ایک بیل کی طرح اسے گھر کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ معلوم نہیں۔ اور کرانتی کو مار کر تمہیں سورگ مل نہیں جائے گا۔''

''تو کون مارے گا اسے، تم؟'' بڑھیا گھر کے اندر جاتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں تو چار پائی پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے سے فرصت نہیں۔ سب کام تو مجھے ہی کرنا پڑتا ہے۔''

دن کے تین بج رہے تھے جب ہولا پانی مچھلی کا جال اور المونیم کی خالی ہانڈی اٹھائے واپس لوٹا۔ اس کا دن خراب گذرا تھا۔ اسے دوسرے لوگوں کے ساتھ پکڑ کر ڈیم میں قید کر لیا گیا تھا۔ اس کی ساری مچھلیاں چھین لی گئی تھیں۔ سالے ڈیم کے بنگالی بابو لوگ آج رات اپنے کوارٹر میں بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھ کر خوب مچھلیاں اڑائیں گے۔

''مگر میں ہار ماننے والا نہیں۔'' ہولا پانی نے بورے پر بیٹھ کر نمک، پیاز اور جلی ہوئی مرچ کے ساتھ بھات کا نوالا بناتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ڈیم پر ایک ایسی جگہ ڈھونڈ نکالی ہے جہاں کوئی نہیں جاتا۔''

''اور تم دیکھو گے وہاں مچھلیاں بھی نہیں جاتیں۔'' مانگے رام نے چار پائی پر بیٹھے بیٹھے رائے دی۔ بڑھیا جھونپڑی سے نمودار ہوئی اور اس کی ٹانگوں کو تیل پلانے لگی۔

''تو اور دبلی نہیں ہو سکتی، گھٹیاری۔'' مانگے رام نے پیار سے اس کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تجھے کبھی بھات کھاتے نہیں دیکھا۔''

''جیسے بھات کے بنا کوئی زندہ رہ سکتا ہے۔'' بڑھیا نے کہا اور ہولا پانی ہنسنے لگا۔

''سچ مچ۔'' اس نے کہا۔ ''ماں کو بھات کھاتے دیکھنا کیسا لگے گا۔ چبانے کے سارے دانت تو چوہے لے گئے۔''

''چپ کر چتیے۔'' بڑھیا بولی۔ کرانتی ہولا پانی کے برتن اٹھانے کے لئے باہر نکلی۔ وہ آنگن کے کونے میں پرانی بالٹی میں، جس کے اندر زنگ کھا کر چھید پڑ گئے تھے، پس خوردہ انڈیل کر واپس لوٹی تو بڑبڑا رہی تھی۔ آج سکندا نے اسے چھوا تک نہ تھا۔ یہ سکندا، وہ اسے سمجھ نہ پاتی

تھی۔ایسا جنور اس نے جندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔گریبن کو ہمیشہ اپنے اناج کے آس پاس رہنا چاہئے۔

''آجائے گا، آجائے گا'' ہولا پانی نے اسے ڈھارس دی۔''سکندا بڑا ہو گیا ہے۔ اب اسے پہلے کی طرح مت دیکھا کر۔کوئی تیرے کھسم کی طرح ساری جندگی دم نہیں ہلا سکتا۔''

سورج ڈوب رہا تھا جب مانگے رام نے خواب میں دیکھا ہولا پانی نے ایک بہت بڑی مچھلی پکڑی ہے۔جس کے سبب اسے جال کو کھینچنے میں دقت آرہی ہے۔

''جال کو اتنا دھیرے دھیرے کھینچو کہ پانی کو پتہ نہ چلے۔'' نیند کے اندر اس نے مشورہ دیا۔''پانی اور مچھلی کا بہت پرانا سمبندھ ہے اس لئے زندگی کی لڑائی میں پانی جال کے خلاف مچھلی کا ساتھ دیتا ہے۔''

اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ہولا پانی اس پر جھکا ہوا اسے بتا رہا تھا کہ سکندا اب تک لوٹا نہ تھا۔

''اور میں پل سے گھوم کر آرہا ہوں۔'' اس نے بوڑھے کو بتایا۔''اب کیا کیا جائے؟''

جیسے دنیا میں اسے ہر بات کا پتہ ہو۔پھر بھی مانگے رام نے سوچا واقعی اب اس وقت کچھ نہیں کیا جا سکتا۔اندھیرا اچھیل چکا ہے۔اگر سکندا خود سے نہ لوٹے تو کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔پھر بھی دونوں باپ بیٹے سڑک پر جا کر اسٹریٹ لیمپ کی دھندلی روشنی میں سکندا کو ڈھونڈتے پھرے۔وہ لوگ پٹریوں کے جال تک گئے۔اوپر آسمان میں سرکس کی روشنی جاگ اٹھی تھی۔نیچے ابھی ابھی ایک ٹرین گذری تھی اور سگنل مین ہری لالٹین لٹکائے اپنی کھڑکی پر جھکا ہوا دونوں کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔یہاں کا ہر سگنل مین مانگے رام کو پہچانتا تھا۔رات کے دس بجے جب گھر کا ہر فرد سو چکا تھا مانگے رام جاگ اٹھا۔کھڑکی کی سلاخوں سے لپٹ کر ساڑی کا بنا ہوا پردہ کسی حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح پھول رہا تھا۔باہر چاند نکلا ہوا تھا جسے دیکھ کر کوئی جھینگر زور شور سے چلا رہا تھا۔ ایک بار مانگے رام کو لگا یہ جھینگر عین اس کی چارپائی کے کان پر بیٹھا ہوا ہے۔اسے تھوڑی دیر کے لئے جھپکی آگئی۔آنکھ کھلنے پر اس نے دیکھا دوسرے کمرے سے کھٹیا بول رہی تھی۔اسے ہولا پانی پر سخت غصہ آیا۔اس نے اپنی لاٹھی اٹھا کر اس کے دروازے پر دے ماری۔کھٹیا کی آواز بند ہو گئی۔ ہولا پانی اور اس کی بیوی آپس میں سرگوشی کر رہے تھے۔کھٹیا کا بولنا تو بند ہو گیا مگر مانگے رام کو پھر نیند نہ آئی۔صبح سورج نکلنے سے پہلے ہولا پانی مچھلی پکڑنے کا سامان اکٹھا کر رہا تھا جب مانگے رام

کمہاروں کے میدان کی طرف سے دست کر کے واپس لوٹا۔ اس نے ہولا پانی کا جانا ملتوی کیا اور سورج نکلتے ہی دونوں باپ بیٹے سکندا کی تلاش میں نکل پڑے۔ کسی وجہ سے ہولا پانی باپ سے خفا تھا اور اس کی آنکھوں سے گریز کر رہا تھا۔

''اب اس میں غصہ ہونے کی کیا بات ہے؟'' مانگے رام نے اسے سمجھایا۔ ''رات سکندا کے لئے میرا دل دکھ رہا تھا۔''

''ایسا کیسے چلے گا؟'' ہولا پانی نے کہا۔ ''سب لوگ میرے کام پر مٹی ڈال دیتے ہیں۔''

''وہ بھاگی نہیں جا رہی ہے۔'' مانگے رام نے اپنی مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے کہا۔ ''اور ایسی باتوں میں جلد بازی نہیں کرتے، بنا بنایا کام بگڑ جاتا ہے۔ ابھی شاید کرانتی اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ سمئے پر سب کام ہو جائے گا۔''

دونوں پٹریوں کے آر پار اور آس پاس کی سڑکوں پر مارا مارا پھرا کئے۔ کسی حادثے میں کہیں پر کسی کتے کے مرنے کی اطلاع نہ تھی۔ مانگے رام نے ہولا پانی کو کانجی ہاؤس بھیجا جہاں آوارہ جانور پکڑ کر رکھے جاتے تھے۔ سکندا وہاں بھی نہ تھا۔ صرف ایک کانی بڑھیا نے جو اپنی جھونپڑی کی دیوار پر اپلا تھوپ رہی تھی انھیں ایک بھکاری کے بارے میں بتایا جسے اس نے اس قسم کے ایک کتے کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔

''کدھر؟'' ہولا پانی نے پوچھا۔

بڑھیا تھوڑی دیر تک سوچتی رہی پھر اس نے کہا ''چونکہ میں اسے جاتے دیکھ نہیں پائی اس لئے وہ میری خراب آنکھ کی طرف سے گیا ہوگا۔''

مانگے رام تھکا ماندا اپنی چارپائی کے سامنے کھڑا تھا اور ہولا پانی چہار دیواری پر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔

''سکندا مجھے شروع سے پسند نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں جانتا تھا ایک دن وہ گدار نکلے گا۔''

''چپ رہ۔'' مانگے رام نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''وہ تین نسل سے ہمارا وفادار ہے۔ کہیں پر کچھ گڑبڑ جرور ہے۔''

اور دنوں کی طرح وہ سارا دن کھٹیا پر بیٹھ نہ پایا۔ وہ بار بار اٹھ کر سڑک پر جاتا اور پلیگ ہسپتال کی طرف تاکتا رہتا۔ وہ جھاڑیوں سے ڈھکے ڈھلانوں کی طرف بھی گیا مگر وہاں ٹیلے پر

کھڑے کھجور کے پیڑوں سے بہت ہی پراسرار طور پر رس کی ہانڈیاں غائب تھیں جب کہ جاڑے کا موسم ابھی اپنے عروج پر تھا۔ ان ہانڈیوں کا ایک ساتھ اس طرح غائب ہو جانا اچھے سنکیت نہ تھے۔

"کہیں پر کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔" وہ بڑبڑاتا رہا۔ وہ ایک جوہڑ کے کنارے بیٹھ گیا جس کی ڈھالیں گھاس سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ جوہڑ کے دوسری طرف ننگے کھیت تھے جن سے فصلیں کاٹ لی گئی تھیں۔ تیز ٹھنڈی ہوا میں ڈھلان کی سوکھی جھاڑیاں جھانجر کی طرح بج رہی تھیں۔ اوپر آسمان سرخ ہو کر بیچوں بیچ تڑخ گیا تھا۔ وہ دیر تک بیٹھا جوہڑ کے صاف شفاف پانی میں ایک سانپ کے بچے کو کلبلاتے دیکھتا رہا جو اپنا ننگا سر پانی سے اوپر اٹھائے ہوئے تھا۔ پانی سبزی کے کھیتوں سے بہہ بہہ کر آ رہے تھے، جس میں جراثیم کش دوا کے دھبے تیر رہے تھے۔

"پانی کے سانپ زہریلے نہیں ہوتے۔" اس نے خود سے کہا۔ گھر واپس لوٹ کر اس نے دیکھا، بڑھیا سینہ پر ہتھوڑ مار مار کر بین کر رہی تھی۔ ہولکر جیل سے عدالت میں لئے جانے کے دوران سرکاری لاک اپ سے فرار ہو گیا تھا اور اب پولس اس کی تلاش میں تھی۔

"سب میرے بچے کے دشمن ہیں۔" وہ چلا رہی تھی۔ "وہ اسے چین سے جینے نہیں دیں گے۔"

"یہ اس نے اچھا نہیں کیا۔" مانگے رام نے کہا۔ "اب وہ کبھی اچھا آدمی بن نہ پائے گا۔ اس نے جندگی بھر کے لئے تھانے میں اپنا نام لکھوالیا۔"

ہولا پانی گھر پر نہیں تھا۔ پولس ان لوگوں سے پوچھ تاچھ کر کے جا چکی تھی۔ بوڑھا چارپائی پر لیٹا لیٹا آسمان کی طرف تاکتا رہا جو تاریک ہو گیا تھا۔ تاروں کے چمکتے ہی ان کے درمیان روشنی کی قینچی جاگ اٹھی تھی۔ بوڑھا بہت جلد ہولکر کے واقعے کو بھول گیا اور بلاوجہ مسکرانے لگا جس کا اسے خود بھی علم نہ تھا۔ گرچہ ٹھنڈک بڑھ گئی تھی مگر وہ کھٹیا پر بیٹھا رہا۔ سکندا، وہ جہاں بھی ہو، اس سرکس کی روشنی کو ضرور دیکھ رہا ہوگا۔ ٹھنڈ کے ڈر سے وہ گھر کے اندر چارپائی اٹھا تو لایا مگر کھڑکی کے سامنے بیٹھا اس روشنی کی طرف تاکتا رہا۔ پھر اسے تاکتے تاکتے اس کا چہرا تاریک ہو گیا۔

"او بھگوان!" اس نے خوفزدہ نظروں سے سرکس کی روشنی کو دیکھا اور وہ اپنے سر کو ہتھیلیوں سے پیٹنے لگا۔ اس کے بعد بھی وہ دیر رات تک ایک ٹک اس قینچی کو تاکتا رہا یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں پانی بھر آئے۔ ہولا پانی سونے کی تیاری کر رہا تھا جب اس کی بیوی نے اسے

بتایا دروازے پر کوئی ہے۔ یہ بوڑھا مانگے رام تھا جو ایک ہات میں لاٹھی اور دوسرے ہات میں لالٹین اٹھائے کھڑا تھا۔

''کچھ چاہئے بابا؟'' ہولا پانی نے نرمی سے کہا۔ اسے بوڑھے کے درد کا پتہ تھا۔

''سرکس'' بوڑھے نے کہا۔ ''کل صبح ہم سرکس جائیں گے۔''

''ہم چاروں؟'' ہولا پانی نے خوش ہو کر کہا۔

''نہیں، صرف ہم اور تم۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''اور تم یاد رکھنا، کل ڈیم کی طرف نہیں جا رہے ہو۔''

''بڈھو پاگل ہو گیا ہے۔'' اس کے جانے کے بعد ہولا پانی نے اپنی جورو کے بھرے پرے سینے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''مگر آج بڑی ٹھنڈ ہے۔''

''چپ کر۔''

سرکس کے اندر ایک نیا شیر لایا جا رہا تھا۔ گرچہ صبح کے دس بج رہے تھے، میٹنی شو کے لئے ابھی بہت وقت تھا اور ٹکٹ کاؤنٹر ابھی ویران پڑے تھے مگر کچھ لوگ اسی دوران غباروں، چاٹ اور بندوق کی دکانوں پر بھیڑ لگا چکے تھے۔ شیر کو شاید یہ بھیڑ راس نہیں آ رہی تھی۔ وہ اپنے پنجڑے میں سر کو گردن پر اٹھا اٹھا کر دھاڑ رہا تھا۔ پنجڑے کو اس کے پہیوں پر ڈھکیلتے ہوئے مزدور اندر کی بدبو سے پریشان نظر آ رہے تھے۔ ہولا پانی اپنے باپ کے ساتھ کھڑا خوف اور احترام کے ساتھ شیر کو تاک رہا تھا جب ایک جوکر بڑے پھاٹک کا پردہ اٹھا کر باہر آیا اور ٹکٹ کاؤنٹر پر جا کر اندر کے آدمی کے ساتھ بات کرنے لگا۔

ہولا پانی کو جوکر پسند نہ آیا۔ وہ نہ صرف یہ کہ کافی بوڑھا تھا بلکہ اس کا لباس اور میک اپ بھی بڑا اچکانہ تھا۔

''بیوقوف۔'' مانگے رام نے اس کی پیٹھ پر ٹھوکا لگاتے ہوئے کہا۔ ''وہ سب روشنی کا چمتکار ہے جو تم سرکس میں دیکھتے ہو'' اور ہولا پانی نے سوچا اس کے باپ کو ہمیشہ اس کے خیالات کا پتہ کس طرح چل جایا کرتا ہے؟

''بھائی میرے...'' مانگے رام جوکر سے کہہ رہا تھا جو ٹکٹ کاؤنٹر سے لوٹ رہا تھا۔ ''سرکس کے منیجر سے ملنا ہے ہمیں۔''

''کیا کام ہے بڑے میاں؟'' جوکر نے ہتھیلی پر کھینی مسلتے ہوئے کہا۔ ''کوئی پالتو طوطا ووطا بیچنا ہے کیا؟''

''پالتو کتا۔'' ہولا پانی نے کہا۔ ''ہمارا پالتو کتا کھو گیا ہے۔ بڑا وفادار کتا تھا۔ تین پشت سے ہمارے ساتھ تھا۔''

جوکر نے سر سے پیر تک باپ بیٹے کو دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے کہا اور پھاٹک کا پردہ اٹھا کر اندر چلنے لگا جہاں سرکس کے بڑے تنبو کے باہر میدان میں جانوروں کے پنجڑے بکھرے پڑے تھے، گھوڑے طویلوں میں اور دوسرے بھانت بھانت کے جانور کھونٹوں سے بندھے نظر آرہے تھے یہاں تک کہ ایک اونٹ تک نظر آیا جو زمین پر بیٹھا جگالی کر رہا تھا۔ ان جانوروں کو اتنے قریب سے دیکھ کر ہولا پانی خوش تھا جب ایک لڑکی صرف چولی اور جانگیا پہنے ان کے بالکل سامنے سے گذری اور اس کے کولھوں کی گولائی اور سینوں کا ابھار دیکھ کر ہولا پانی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ دل ہی دل میں اس لڑکی کے پستانوں کا کرانتی کے پستانوں سے موازنہ کرنے لگا۔ پھر یہ سب کچھ بھول کر اسے یہ سوچ کر ہنسی آگئی کہ سکندا کو کرتب سکھانے کے لئے کوئی سرکس میں ڈال گیا ہوگا۔ سکندا، جسے ٹھیک طرح سے اپنی دم سے مکھی بھگانا بھی نہیں آتا۔

جگہ جگہ چھولداریاں نصب تھیں جن کے باہر لوگ اسٹو پر کھانا پکا رہے تھے، سبزیاں جھیل رہے تھے، گوشت دھو رہے تھے، پتے کھیل رہے تھے۔ ایک بونا لکڑی کے ایک پیپے پر جسے شاید بھالو لڑھکایا کرتا ہوگا، آلتی پالتی مارے بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور انگریزی کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا جس پر ایک توپ کی تصویر بنی تھی جسے ایک نیم عریاں لڑکی فلیتا سے آگ دکھا رہی تھی۔

جوکر انھیں تنبو کے بالکل پیچھے لے گیا جہاں سرکس کے نالوں کا پانی آکر جمتا تھا اور قطار سے سنڈاس کے پچھواڑے لگے ہوئے تھے۔ ان سے گذر کر ایک جگہ انھیں لوہے کے جنگلے نظر آئے جن کے اندر کچھ تندرست اور مرگھلے کتے کھڑے یا خاموش بیٹھے تھے۔

''دیکھ لو۔ شاید تمہارا کتا ان میں ہو۔'' جوکر نے کہا۔ مانگے رام اور ہولا پانی نے

جنگلا تھام کر باری باری سے تمام کتوں کو غور سے دیکھا۔ ان میں سکندا نہیں تھا۔ ہولا پانی کو سنڈ اس کے پاس ان کتوں کا رکھے جانا اچھا نہ لگا۔

''ان میں ہمارا کتا نہیں ہے۔'' مانگے رام نے اعلان کیا۔

''تب وہ یہاں نہیں لایا گیا ہے۔'' جوکر نے کہا۔ ''یا پھر کون جانے، وہ شیر کے پیٹ میں جا چکا ہو۔ کب گم ہوا؟''

''پرسوں۔'' ہولا پانی نے کہا۔ ''وہ سنڈر پٹی کی طرف آخری بار گیا تھا۔''

''شاید تم لوگوں نے اس کے لئے نہ سوچا ہو اور وہ کسی کتیا کے پیچھے بھاگ گیا ہو۔ شاید ٹھنڈ سے مر کھپ گیا ہو یا پھر کون جانے جیسا کہ میں نے کہا وہ کسی شیر کی خوراک بن گیا ہو۔'' جوکر نے تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''کچھ بھی ممکن ہے اور مجھے افسوس ہے۔''

واپسی پر ہولا پانی نے ایک پہلوان کو دیکھا جو مگدر بھانج رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک کالی مدراسی لڑکی منی اسکرٹ اور بلاؤز پہنے کھڑی اسے چھیڑے جا رہی تھی۔ پہلوان مسکرا رہا تھا مگر لڑکی کی طرف نہیں تاک رہا تھا۔

''مجھے حیرت ہے۔'' ہولا پانی نے سوچا۔ ''یہ شیر کتا بھی کھاتے ہیں۔'' اوا پنے اس جملے کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں خوف اور تردد سے پھیل گئیں۔ اسے سکندا یاد آ گیا مگر اسکے اندر اس سے زیادہ سوچنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ جلد سے جلد اس جگہ سے چلا جانا چاہتا تھا۔ ایک جگہ انھوں نے دونوں سرچ لائٹ کو دیکھا جو کافی بڑے تھے اور آسمان کے رخ اٹھے ہوئے تھے۔ فالحال ان کے شیشے کپڑوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔

آسمان میں سورج کا سرچ لائٹ جو روشن تھا۔

//////

سرچ لائٹ کی روشنی آسمان میں اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ گردش کر رہی تھیں جب مانگے رام اور ہولا پانی کلوا ٹائر کی شراب کی بھٹی سے نمودار ہوئے۔ آج مانگے رام کے پاس جانے کہاں سے پیسے نکل آئے تھے اور دونوں باپ بیٹوں نے جی بھر کر شراب پی تھی۔

''ہولا پانی، بڑھیا سے کہہ دے میرا ماتھا گرم نہ کرے۔'' گھر لوٹ کر مانگے رام نے ٹھنڈی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا جسے وہی اندر لے جایا کرتا۔ ''اور تو گدھا اس چہار دیواری پر

بیٹھا بیٹھا بوڑھا ہو جائے گا۔"

"تو میں کیا کروں؟ تالاب میں جا کر بیٹھوں جس میں اب صرف نالوں کا پانی آتا ہے؟"

"کچھ بھی کر، مگر یہ باپ بننے کا چکر چھوڑ۔" اس نے کہا۔ "تیری عورت میں کوئی کھوٹ نہیں۔ یہ میرا پاپ ہے جو اس گھر پر منڈلا رہا ہے۔"

""پاپ؟" ہولا پانی بولا۔ "کیسا پاپ؟؟ جانے کیا کہہ رہے ہو باپو۔"

مانگے رام نے سر اٹھا کر سرکس کی روشنی پر نظر ڈالی جو آسمان پر بل رہی تھی۔ اسے اس کی قینچی کے درمیان سکندا کا چہرا نظر آیا۔ اس نے ایک آہ بھری۔ یہ تالاب، اب اس میں اچھی مچھلیاں کبھی نہیں آئیں گی، بڑھیا کے مرتے ہی یہ گھر بھوتوں کا مسکن بن جائےگا۔ اور سکندا... اس نے ایک بار پھر آسمان کی طرف اپنی بوڑھی آنکھیں اٹھائیں، یہ میرا پاپ تھا جو اسے کھا گیا۔

دیوار اندھیرے میں غرق ہو گئی تھی مگر ہولا پانی اپنی جگہ بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ بوڑھو بہت زیادہ پی گیا ہے، اس نے سوچا۔

"بالکل بھی نہیں، میں پورے ہوش و حواس میں ہوں۔" مانگے رام نے اسے جواب دیا۔ "میں سترہ برس کا تھا جب میں نے ایسے ایسے کام کئے جو تم سوچ نہیں سکتے۔ وہ تھی ہماری پیڑھی۔ چوری، اٹھائی گیری، جوا، ہر کسی کی اپنی رکھیل۔ ہولا پانی، سچ پوچھو تو ہم سوروں کی طرح آزاد تھے اور اپنی نجاست میں لوٹا کرتے۔ کیا کام نہیں کیا تھا ہم نے۔ اسپتال سے مردے ڈھوئے تھے، ریل کے گدام میں سیندھ لگائی تھی، پٹری سے کٹ کر مر جانے والوں کی جیبیں ٹٹولی تھیں، سنڈر پٹی کی طرف سے لوٹتے رنڈیوں کے گاہکوں کو دھمکا کر ان سے پیسے اینٹھے تھے..."

ایک پل کے لئے وہ چپ ہو گیا اور ایک ٹک سرکس کی روشنی کی طرف تاکتا رہا جس کی حرکت کسی وجہ سے آسمان پر رک گئی تھی۔ "...اور ہم نے ہر سال سرکس آنے پر شہر کے گلی کوچوں سے کتے پکڑ پکڑ کر سرکس والوں کو بیچا تھا۔ میں نے خاص طور پر انہیں پکڑنے کے لئے ایک لوہے کا شکنجہ بنایا تھا جو کتوں کے پیٹ اور پیٹھ کو اس طرح سے جکڑ لیتا کہ مجال ہے کہ وہ ٹیں کر پائیں۔"

"سرکس والے ان کتوں کو کرتب سکھاتے ہونگے۔"

"احمق!" بوڑھا چلایا۔ "پاجی، تو اس دنیا میں جینے کے لائق نہیں۔ وہ ان کتوں کو کرتب سکھاتے ہوں گے۔ تم نہیں دیکھتے سرکس کے آنے کے بعد شہر میں کتوں کی تعداد کتنی کم

ہو جاتی ہے۔ کتوں کو کرتب سکھاتے ہوں گے! وہ انھیں شیر کو کھلاتے ہیں۔"

ہولا پانی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اسے دھاڑتے ہوئے شیر کی یاد آئی اور جوکر کے جملے جنھیں وہ بھول گیا تھا۔

"پھر ایک دن میرے شکنجے میں سکندا کی نانی آ گئی۔" بوڑھے نے کہا۔

"تم جھوٹ کہہ رہے ہو بابو۔" اندھیرے سے ہولا پانی کی آواز آئی۔ "اگر تم نے اسے سرکس میں بیچ دیا تو سکندا کہاں سے آیا؟"

"تیرے گانڑ سے..." مانگے رام نے لاٹھی اٹھا کر اندھیرے میں گھمایا۔ "سالہ بیل، حرامی... سمجھ بوجھ تو ہے نہیں بس بُو بُو بُو۔"

"پائے لاگوں بابو۔"

"مجھے یاد ہے۔" مانگے رام نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔ "میں اسے پکڑ کر سرکس لے جا رہا تھا۔ کافی نشے میں تھے ہم لوگ جب راستے میں ہمارے درمیان لڑائی ہو گئی۔ ان دنوں ہماری لڑائی بات بات پر ہو جایا کرتی تھی، تمہاری طرح نہیں کہ بس دیوار پر بیٹھے چپ چاپ جال بنتے رہو۔ تو ہماری لڑائی ہو گئی اور کتیا ہماری لاعلمی کا فائدہ اٹھا کر بھاگ نکلی۔ پھر تو اسے پکڑنے کے لئے ہمیں اس کے پیچھے پیچھے تقریباً آدھا شہر بھاگنا پڑا۔ آخر کار وہ میرے شکنجے میں دوبارا آ ہی گئی۔ لیکن اندھیرا پھیل چلا تھا اور ہم لوگ بھی تھک چکے تھے۔ تو میں اسے گھر لے آیا۔ اور اس رات آج کی رات کی طرح سرچ لائٹ ہمارے آسمان پر بھی روشن ہوا۔ ان دنوں دیوار پر میں بیٹھا کرتا اور کھٹیا پر تیرے دادا بیٹھتے تھے، بالکل گم سم، اپنے سر کے بال توڑا کرتے۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب ابھی پلیگ کی وبا شہر میں پھیلی نہ تھی۔ اسے میرا کتا پکڑنا پسند نہ تھا۔

"ایک دن یہ کام گھر پر شراپ لے آئے گا۔" تیرے دادا نے ٹھیک کہا تھا۔ مگر بڑا ہٹ دھرم تھا میں ان دنوں۔ تو تیرے دادا سے چھپ کر میں دیوار کی آڑ میں لے جا کر سکندا کی نانی کو روٹی کھلا رہا تھا جب اچانک وہ میری انگلیوں کو چاٹنے لگی اور میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا جو اندھیرے میں بھی صاف چمک رہی تھیں۔ یہ بھاری بھول ہوئی مجھ سے۔ مجھے لگا وہ مجھ سے کچھ کہہ رہی ہو۔ ہولا پانی، کبھی کسی کی آنکھ میں تاکا نہ کرنا۔ یہ انسان کو کمزور بنا دیتی ہے۔ میں نے دیکھا سکندا کی نانی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے سوچا کل دیکھا جائے گا۔ مگر وہ

کل کبھی نہ آیا۔ وہ سرکس کے لئے میرا کتا پکڑنے کا آخری دن تھا۔ سکندا کی نانی نے ایک طرح سے مجھے سدھار دیا۔ میں اسے اس کی مالکن کے پاس بھی لے گیا۔ مگر اس نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ اندھی بھکارن جو ایک درخت کے کھوکھلے میں رہتی تھی، تھوڑی پاگل بھی تھی، یا پھر کون جانے یہ اوپر والے کی طرف سے تھا۔" بوڑھے نے آہ بھری۔ "یہ ان دنوں کا پاپ ہے جو ہمارے سر پر لوٹ آیا ہے ہولا۔"

مانگے رام کے خاموش ہوتے ہی کچھ ٹھنڈ کھائے ہوئے گیدڑ کھیری بن کی طرف چلانے لگے اور گویا اس آواز سے شہ پا کر ایک مینڈک اچانک تالاب میں ٹرا اٹھا۔

ہولا پانی نے سر اوپر اٹھا کر سرچ لائٹ کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی۔ روشنی کی دونوں لکیریں ایک دوسرے کو کاٹ رہی تھیں مگر وہاں اسے کوئی کتا نظر نہ آیا۔

"یہ بڈھے..." اس نے سوچا۔ "خوامخواہ باتوں کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔"

اور وہ دیوار سے جال اٹھا کر گھر کے اندر چلا گیا۔

جنگ اور امن

ہمیں یہ تسلیم کر لینی چاہئے کہ یہ دنیا بدلنے والی نہیں، شہریار نے کہا، اور اس کے بعد بھی کرنے کے لئے اگر کچھ رہ جاتا ہے تو ان کا جواز پیدا کرنا بجائے خود ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

شہریار سے میری برسوں کی دشمنی تھی لیکن پچھلے سال، جب کہ امریکہ عراق پر حملے کے اسباب اکٹھا کر رہا تھا، اچانک ہم دوست ہو گئے تھے۔ اب اگر پلٹ کر دیکھا جائے تو ہماری دشمنی کی کوئی وجہ نہ تب تھی نہ ہماری دوستی کا کوئی جواز اب ہے۔ صرف یہ ہوا تھا کہ ہم لوگ راستہ چلتے ہوئے ایک دوسرے کے روبرو آ گئے تھے اور اچانک ہم نے محسوس کیا تھا کہ اب تک ایک دوسرے کے لئے ہمارا رویہ انتہائی احمقانہ تھا، کہ دنیا میں رونما ہونے والے بڑے سے بڑے واقعات اتنے بڑے نہیں ہوتے کہ انسان کے روزمرّہ کے تعلقات پر اثر انداز ہو سکیں۔ تو ہم نے ہات ملایا، ایک ایسے آسمان کے نیچے جہاں دنیا کے سب سے طاقتور ملک کے بمبار جہاز جوہری ہتھیاروں کی تلاش کے بہانے ایک خاص ملک کی طرف پرواز کر رہے تھے۔

شہریار اور ہم پڑوسی تھے۔ ہماری کچھ کھڑکیاں آمنے سامنے لگی تھیں گرچہ ہمارے صدر دروازے دو الگ گلیوں میں کھلتے تھے۔ ہم محلے کی ایک ہی مسجد میں نماز پڑھنے جاتے جس کا صحن نصف ٹوٹا ہوا تھا اور وضو کے حوض میں چھوڑی ہوئی رنگین مچھلیوں کے فضلے پانی میں تیرتے رہتے۔ اور ہماری سڑک پر، جہاں آٹو رکشا کے مقابلے رکشوں اور تانگوں کی تعداد اب بھی زیادہ ہوتی، ہم نے ایک دوسرے کے روبرو کھڑے ہو کر قسم کھائی تھی کہ ہم ایک دوسرے پر زمین تنگ کر دینگے۔

اس دشمنی کی بنیاد اس دن پڑی تھی جب ایک گول مٹول مشاطہ ہانپتے کانپتے، برقعہ کے اندر پسینہ میں شرابور ہمارے گھر وارد ہوئی اور اس نے محلے کی سب سے خوبصورت لڑکی کا پیغام

میرے بڑے بھائی کے لئے پیش کیا۔ ہم لوگوں کی جواہرات کی ایک بڑی دکان تھی اور ہمارے ابا حضور ذات پات کے معاملے میں بڑے سخت گیر انسان تھے۔ انھوں نے جب لڑکی کے خاندان کا جائزہ لیا تو انھیں پتہ چلا کہ اس رشتے پر شریعت کی مہر نہیں لگائی جا سکتی۔ یہ وہ وقت تھا جب شہریار اپنا تیسرا محبت نامہ اس خوبصورت لڑکی کو ایک پتھر میں لپیٹ کر اس کی بالکنی پر ارسال کر چکا تھا، گرچہ اب تک اس کے جواب سے محروم تھا۔

یہ ہمارے اسکول کا زمانہ تھا جب ہم ہندی فلموں کے زیر اثر پڑھائی لکھائی کے مقابلے عشق و محبت کے بارے میں زیادہ باتیں کرنے لگے تھے اور کسی خوبصورت لڑکی کی صحبت سے محروم ہونے پر کلاس میں لگاتار فیل کرتے رہنے کو ترجیح دینے کے لئے تیار رہتے۔

رانیہ شہریار سے سات برس بڑی تھی اور شہریار اس کا واحد عاشق نہ تھا۔ اس کی بالکنی کے نیچے ہر عمر کے عاشق آہیں بھرا کرتے۔ اس کے باپ کی تیل کی دکان تھی جہاں کچے تیل کی گھانیاں چلتی رہتیں۔ اس تیل کی دکان کی اپنی شہرت رانیہ سے کم نہ تھی اور اس کے باپ کو اپنی تیل کی دنیا سے کبھی اتنی فرصت نہ ملتی کہ آنکھ اٹھا کر وہ رانیہ کی طرف تاکتا جو دن بدن جوان ہوتی جا رہی تھی۔ اگر مشاطہ (جسے اس کی ماں نے اس کے باپ کی لاعلمی میں بھیجا تھا) وہ رشتہ میرے بھائی کے لئے لے کر نہ آتی تو شاید میں بھی اس کے خواب دیکھنا شروع کر دیتا۔ ظاہر ہے میں نے اس عمل سے احتراز کیا اور اب اس کی طرف نہ تاک کر اس کی بالکنی کے باہر منڈلاتے کبوتروں کی طرف تاکتا رہتا جو اس کی کوٹھی کے چھجوں پر اتر کر بے شرمی سے ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کیا کرتے۔ مگر میرا انجبار ذہن کبھی کبھار ان کبوتریوں میں بھی رانیہ کو ڈھونڈ نکالتا۔

مشاطہ کے واقعہ کے ایک ہفتے بعد شہریار نے اپنے اسکول کا بستہ ایک متنازعہ حویلی کی بوسیدہ دیوار پر رکھی جس کے اندر ہم چھٹی کے دنوں میں کھیلا کرتے اور میری طرف پہلی بار معاندانہ نظروں سے تاکتے ہوئے کہا۔

''تمہارے لوگ خود کو کیا سمجھتے ہیں؟''

''کیا سمجھتے ہیں؟''

''یہی تو میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔''

''کیا میں جواب دینے کے لئے مجبور ہوں؟''

''ہاں'' اس نے کہا۔ ''کیونکہ تم لوگوں نے ایک معصوم کا دل دکھایا ہے۔ مجھے اس سلسلے میں کیفیت چاہئے۔''

''تم میرے باپ سے مل کیوں نہیں لیتے؟''

مجھے پتہ تھا شہریار کے اندر میرے باپ سے ملنے کی ہمت نہ تھی۔ میں نے جان بوجھ کر یہ بات کہی تھی۔ مگر شہریار کب ہار ماننے والا تھا۔

''ملنے میں کیا قباحت ہے؟''

''تو مل لو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے شرارت سے کہا۔ ''ویسے اس معاملے میں تمہارا ٹانگ اڑانا ہماری سمجھ سے باہر ہے۔''

شہریار ابھی صرف بارہ برس کا تھا۔ اس نے اپنے منہ پر ہات رکھ لیا۔ واقعی، اگر میرا باپ اس سے یہ سوال کرتا تو اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ دراصل مشاطہ کے واقعے کے بعد پہلی بار رانیہ نے شہریار کے خط کا جواب دیا تھا اور اپنے درد کا اظہار کیا تھا کیونکہ وہ شہریار کو میرے ساتھ اسکول جاتے اور اسکول سے لوٹتے دیکھ چکی تھی۔

''رانیہ نے تمہیں یہ بتایا ہے؟'' میں نے کریدنے کی کوشش کی۔ ''بولو بولو، ہے نا؟''

اس نے پہلے کوئی جواب دینا ضروری نہ سمجھا جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ معاملہ وہی ہے۔

''تم اور تمہارے لوگ جہنم میں سڑیں گے۔'' اس نے بستہ واپس پیٹھ پر لاد کر میری طرف دیکھے بغیر وہاں سے جاتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگوں نے ایک معصوم کا دل دکھایا ہے۔''

مگر یہ ہماری دشمنی کی شروعات نہ تھی۔ ابھی شہر کے چیل کووں کو کچھ اور مردے نوچنے تھے، کچھ اور مہاجر پرندوں کو آسمان سے گذرنا تھا، ابھی گھڑی کے کانٹوں کو ہزاروں بار ایک دوسرے سے ملنا اور بچھڑنا تھا۔ ہم ایک ساتھ ڈھولکا پٹن مسجد کے کھلے میدان میں گیند کھیلتے رہے، ریلوے لائن کے کنارے بچھے پانی کے بڑے پائپ پر دوڑ لگاتے اور پھسلتے رہے، مرگھلے کتوں کی پیٹھ پر پتھر مارتے رہے۔ ہماری سڑک پر ایستادہ بجلی اور ٹیلی گراف کے تار پر بیٹھے کسی نئے پرندے کو دیکھ کر ہم تعجب سے سوچتے، جانے وہ کس ملک سے آیا ہوگا اور اسے کس چیز کی تلاش ہے؟ اور کسی قیمتی چیز کی طرح ایک دوسرے سے اس پرندے کو چھپایا کرتے جب کہ وہ اڑ کر واپس اپنا ملک یا کسی اور جگہ جا چکا ہوتا۔ شہر کی جامع مسجد (جو ہمارے اسکول کے راستے میں پڑتی تھی)

کے سامنے کباب کے کئی ہوٹل ترتیب وار کھڑے تھے جن میں بڑے بڑے تندور سلگتے رہتے۔ ان میں مکھیوں اور شاعروں کا اچھا خاصہ جمگھٹا ہوتا اور باہر ہر رنگ وروغن کے بھکاری اور کتے بیٹھا کرتے اور میلوں کی مسافت طئے کر کے آئے ہوئے جلالی فقیر چمٹا بجا بجا کر کربلا کے واقعات بیان کرتے اور جب تھک جاتے تو چلم سلگا کر مراقبے میں چلے جاتے۔ ایک دن وہاں ہم نے صدّام حسین کے کویت پر حملے کی خبر سنی۔ ہمیشہ کی طرح میں اور شہریار اسکول سے واپس لوٹ رہے تھے۔

اسی درمیان شہریار کچھ کچھ چپ بھی رہنے لگا تھا کیونکہ رانیہ نے اس کے خط کا جواب دینا بند کر دیا تھا۔ یہی نہیں، یہ خبر بھی گرم تھی کہ اس کا رشتہ ایک امیر گھرانے میں ہونے والا ہے۔ شاید اسی لئے اس نے بالکنی پر نکلنا بند کر دیا تھا۔ اوراب کبوتر آزادی کے ساتھ بالکنی کی جالی سے اندر موزیک کے فرش پر اتر کر بدفعلی کیا کرتے۔

اس شادی کی خبر کے دو ہفتے بعد کا واقعہ ہے۔ یہ چھٹی کا دن تھا۔ ہم اس متنازعہ حویلی کے باغ میں اگی جھاڑیوں اور پودوں کے بیچ کرکٹ کھیل رہے تھے۔ یہ کسی نواب کی حویلی تھی جس کا سرکار کے ساتھ مقدمہ چل رہا تھا۔ حویلی کی عمارت بوسیدہ ہوگئی تھی۔ اس کے سارے دروازے اور کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے اور اس کے باہر چاروں طرف کے باغات اجڑ گئے تھے۔ اسکے فوارے کے ٹائل اور لوہے کے پائپ اور ٹونٹیاں ٹوٹی پھوٹی پڑی تھیں۔ باقی کو ہم لڑکے روز بروز تھوڑا بہت توڑتے جارہے تھے۔ میں نے شہریار کو ایک پتھر پر اداس بیٹھا ہوا پایا۔ میں نے سوچا یہ کویت پر صدّام کے حملے کا اثر ہے۔

''صدّام پاگل ہوگیا ہے۔'' میں نے اس کی ہمدردی حاصل کرنے کے مقصد سے کہا۔ ''کوئی اپنے کسی کمزور پڑوسی پر اس طرح حملہ کرتا ہے؟''

''صدّام کون؟'' اس نے سر اٹھا کر کہا جس پر کسی اناڑی حجام نے بری طرح قینچی چلائی تھی۔

مجھے محسوس ہوا وہ ذہنی طور پر کسی دوسری دنیا میں تھا۔ یوں بھی ہم اسکول کے لڑکوں کی اپنی کوئی رائے نہیں ہوتی، ہم اپنے گھر میں بڑوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کی بازگشت ہی تو ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے اس کے باپ کو اپنے کپڑے کی دکان سے فرصت ہی نہ ہو کہ وہ کسی بین الاقوامی واقعے کے تعلق سے کسی طرح کی گفتگو کر پائے۔ ہوسکتا ہے اس کے گھر کے افراد کے

درمیان اس طرح کے مکالموں کا کوئی رواج نہ ہو۔ میں ایسے بہت سارے لڑکوں کو جانتا تھا جو سالوں سال اپنے باپ سے گفتگو کرنے سے کتراتے تھے اور انھیں دیکھتے ہی دوسرا راستہ پکڑ لیتے۔

''اوہ صدّام۔'' یکا یک اسے یاد آ گیا۔ ''مسلمانوں کو ایسے ہی مردِ مجاہد کی ضرورت ہے۔ ایک دن وہ ساری اسلامی دنیا کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور صیہونیت صفحہ ہستی سے مٹ جائے گی۔''

''یہ تم نے کہاں سے سنا؟'' میرے کان کھڑے ہو گئے کیونکہ یہ اس کے جملے نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر ہم دونوں اس معاملے کو بھول گئے۔

کویت کی فتحیابی کے فوراً بعد صدّام کو امریکی فوجی حملے کے دباؤ پر پسپا ہونا پڑا۔ میرے باپ نے ناشتے پر صبح کا اخبار پڑھتے پڑھتے کہا۔ ''امریکہ نے یہ نیک کام کیا ہے۔ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ اپنے پڑوسی ملک کی سالمیت اور آزادی پر نظر ڈالے۔''

دوسرے دن جب سڑک پر چلتے ہوئے ہم دونوں اسکول جا رہے تھے تو میں نے اپنے والد کا مکالمہ دہرایا جسے سن کر اس کا چہرا سرخ ہو گیا۔ وہ سڑک کے بیچوں بیچ بستہ تھام کر کھڑا ہو گیا۔

''کویت میں تیل نہ ہوتا تو کیا امریکہ اس کے دفاع کے لئے آتا؟'' شہریار نے کہا۔ اس کا چہرا غصے کو ضبط کرنے کی کوشش میں تمتما رہا تھا۔ ''یہ تم لوگوں کو کیا پتہ۔ بہت اونچے خاندان کے لوگ بنے پھرتے ہو۔ مسلمانوں کو صدّام جیسے لیڈروں کی ضرورت ہے۔''

''شہریار تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ صدّام تمہارا ہیرو ہے؟ ابّا کہتے ہیں وہ بہت بے رحم آدمی ہے۔''

''یہ ساری افواہ امریکہ کی پھیلائی ہوئی ہے۔'' شہریار نے کہا اور ایک انگریزی محاورہ دہرایا۔

''Give the dog a bad name and kill it.''

''تم نے میرے باپ کو کتا کہا۔'' میں بپھر اٹھا۔ ان دنوں میری انگریزی بہت کمزور تھی۔

''نہیں۔'' شہریار ہنسا۔ ''اور یقین نہ آئے تو کتے سے جا کر پوچھو۔''

''یاد رکھوں گا۔'' میں نے زمین پر تھوکتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات یاد رکھوں گا۔ اور ایک دن تمہیں اس کی سزا بھگتنی ہوگی۔''

''ظاہر ہے، جب ایسا ہونا ہے تو اس دن کا انتظار کرنا ہی ہوگا۔'' شہریار مسکرائے جا رہا

تھا۔ ''لیکن مجھے لگتا ہے اسی دوران تم کسی اچھے انگریزی ٹیوٹر کا انتظام کرلو۔ تمہیں اس کی ضرورت ہے۔''

یہ ہماری دشمنی کی شروعات تھی۔ اسکول کے باقی سال ہم لوگوں نے الگ الگ گذارے۔ ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ رانیہ کی شادی ہونے والی ہے۔ اپنے گھر کے لوگوں کے ساتھ ہم نے بھی اس دعوت میں شرکت کی۔ وہاں مجھے شہریار نظر نہ آیا گرچہ اس کے گھر کے افراد موجود تھے۔ میں نے کچھ دن تک شہریار کو کلاس میں بھی نہیں پایا۔ پھر دکھائی دیا تو مجھے لگا وہ بہت اداس ہے۔ میری خواہش ہوئی کہ اس کی دلجمعی کروں، مگر میری ہمت نہیں ہوئی۔ بعد میں میں نے محسوس کیا کہ وہ اس واقعہ کو بھول گیا تھا کیونکہ اب وہ کھل کر ہنسنے اور اپنے دوستوں کے ساتھ معمول کے مطابق پیش آنے لگا تھا۔

//////

ہمیں اسکول چھوڑے سات برس ہو چکے ہیں۔ میں نے یونیورسیٹی کا امتحان پاس کرلیا ہے اور اب اپنے بڑے بھائی کے ساتھ جواہرات کی دکان پر بیٹھنے لگا ہوں۔ شہریار نے اپنے باپ کی کپڑے کی دکان سنبھال لی ہے جنھوں نے اس کی ماں کے مرنے کے بعد دوسری شادی کرلی تھی اور اب زیادہ تر بیمار رہنے لگے تھے۔ ان کی پہلی بیوی سے بہت دنوں کے بعد شہریار پیدا ہوا تھا جب کہ دوسری بیوی دائمی طور پر بانجھ ثابت ہوئی تھی۔ دوسری طرف رانیہ اب تین بچوں کی ماں ہے۔ اب جب کبھی وہ اپنے باپ کے گھر آتی ہے یہ چھوٹے چھوٹے بچے مرغی کے چوزوں کی طرح اپنے نانا کی بالکنی میں کھیلا کرتے ہیں اور یہ وہی بالکنی تھی جس پر کبھی شہریار پتھر پر محبت نامے لپیٹ کر پھینکا کرتا تھا۔

شہر کا چہرا بدل گیا ہے۔ اس سے ٹانگے تقریباً غائب ہو چکے ہیں۔ ان کی جگہ آٹو نے لے لیا ہے۔ رکشے گاہے بگاہے نظر آجاتے ہیں لیکن اب ان پر زیادہ تر برقعہ پوش خواتین، پنشن یافتہ سرکاری ملازم، داڑھی پوش ملاّ یا جسمانی طور پر معذور افراد بیٹھتے ہیں یا اسکول کے بچے ان کے پنجڑوں میں بند جانوروں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ متنازعہ حویلی کو سرکار نے مقدمے میں جیت لیا ہے۔ اس میں اب ڈیفینس کا ایک اعلیٰ افسر رہتا ہے۔ اس کے پھاٹک پر سر پر پگڑی باندھے، گلہری کی دم نما موچھیں لٹکائے ایک چست تندرست راجپوت حوالدار پہرا دیا کرتا ہے۔

اندر باغوں کی صفائی ہو چکی ہے، گرچہ فوارہ پہلے کی طرح ناکارہ پڑا ہے اور اس کے پیندے میں سوکھے پتے سرسراتے ہیں۔

''ادھر کیا دیکھ رہے ہو؟'' ایک دن جب میں پھاٹک کے سامنے ٹھٹھک کر رک گیا تھا اور اپنے پرانے دنوں کو یاد کر رہا تھا تو گلہری کی دم نما موچھوں والے سنتری نے پوچھا۔

''اسکول کے دنوں میں ہم اس کے اندر کھیلا کرتے تھے۔''

''اچھا۔'' پہرے دار مسکرایا اور اس نے اپنی موچھوں کے کونوں کو پکڑ کر کھینچا جیسے دیکھنا چاہتا ہو کہ وہ وہاں پر مضبوطی سے قائم ہیں یا نہیں۔ وہ شاید جاٹ رجمنٹ کا کوئی حوالدار تھا۔ ''پھر تو بہت پہلے کی بات ہوگی۔ اب تو تم کافی لمبے ہو گئے ہو۔''

''آپ نے میرے بڑے بھائی کو نہیں دیکھا ہے۔ وہ ہم سے بھی نکلتے ہوئے ہیں۔''

''اچھا، پھر تو تم دونوں کو فوج میں بھرتی ہو جانا چاہئے۔''

''نہیں۔'' میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں اپنے والد کا کاروبار سنبھالنا پڑتا ہے۔''

اب ہمارے شہر کی سڑکوں پر اور بھی بہت ساری تبدیلیاں آ گئی ہیں۔ کباب کے ہوٹلوں میں سے کئی ایئر کنڈیشنڈ رستورانوں میں بدل گئے ہیں جن کے باہر چمچماتی کاریں کھڑی رہتی ہیں اور غبارے والے دل کی شکل کے غبارے لئے رستورانوں سے گاہکوں کے نکلنے کا انتظار کرتے ہیں۔ باقی سے چائے کی قیمت بڑھ جانے کے سبب شاعر غائب ہو گئے ہیں جب کہ مکھیوں نے کچڑوں کے ڈھیر پر اپنا دائمی ٹھکانہ بنا لیا ہے۔ خود ہمارے محلے کی مسجد اب تین منزلہ ہو چکی ہے پھر بھی جمعہ کی نماز پر لوگوں کو باہر سڑک پر صفیں قائم کرنی پڑتی ہیں جس کے دونوں طرف نالے سڑاندھ مارتے رہتے ہیں۔ ہمارے محلے میں آئے دن پرانے گھر ٹوٹ ٹوٹ کر نئی عمارتوں میں بدلتے جا رہے ہیں۔ صرف چند ایک مکانات، جن میں ہمارا مکان، اور رانیہ اور شہریار کی کوٹھیاں شامل ہیں، اپنی پرانی طرز پر قائم ہیں۔ وہی محرابیں، وہی دیواروں سے نکلی ہوئی بالکنیاں، کھڑکیوں پر لگی چوبی جالیاں اور مرغولے دار ڈھلائی لوہے کے زینے، اونچی دہلیز، کھلا آنگن، بند حجرے۔

یہ ایک عام سا دن تھا۔ بغیر سورج کا مگر روشن۔ میں اپنے جڑواں بھتیجوں کو اسکول پہنچا

کر اسکوٹر پر واپس لوٹ رہا تھا جب ہم نے ایک جلوس دیکھا۔ عراق پر امریکہ نے اپنی چند اتحادی فوجوں کے ساتھ مل کر فوجی کارروائی کر ڈالی تھی۔ لوگ اس جارحانہ حملے کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ اس جلوس میں داڑھی والے مولاناؤں اور مدرسے کے بچوں کی تعداد زیادہ تھی، باقی شہر کے وہ کامیاب تاجر حضرات تھے جو صاف ستھرے کپڑے پہنے، سر پر جالی دار ٹوپی لگائے خاموشی کے ساتھ اس جلوس کی رہنمائی کر رہے تھے۔ امن قائم رکھنے کے لئے پولس کا ایک دستہ ایک نیلے رنگ کی وین اور سرخ رنگ کی ایمبولنس کے ساتھ آگے آگے چل رہا تھا۔

میں نے اسکوٹر کنارے کر کے جلوس کو جانے کا راستہ دے دیا۔ دکان لوٹ کر میں نے اسکوٹر کو ہمارے شوکیس کے سامنے اس کی مخصوص جگہ پر پارک کیا اور دکان کے اندر داخل ہو گیا۔ وہاں سناٹا تھا۔ بڑے بھیا کیش کاؤنٹر پر بیٹھے دیوار سے لگی ٹی وی پر خبریں دیکھ رہے تھے جہاں اتحادی فوج کی بکتر بند گاڑیاں اور ٹینک ریگستان کے بیچ ایک سنسان سڑک پر آگے بڑھتے نظر آ رہے تھے جب کہ ان کے لڑاکا جہاز اور ہیلی کوپٹر آسمان میں اڑ رہے تھے۔ سیلس مین اپنی اپنی جگہ کھڑے ایک ٹک ٹی وی کے پردے کی طرف تاک رہے تھے۔

''صدّام واحد مردِ مجاہد ہے جو اس راکشش کے مقابلے کھڑا ہونے کی ہمت رکھتا ہے۔'' بھیا نے میری طرف تاکے بغیر کہا اور میں ان کے اس جملے پر حیران رہ گیا۔ کیا امریکی حملے نے اچانک ان کے خیالات بدل ڈالے تھے، ان کے دل میں صدام کے لئے ہمدردی پیدا کر دی تھی؟ اس دن کے بعد میں نے محسوس کیا کہ واقعی ہمارے گھر کے اندر بھی صدّام سے ہمدردی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ جیسے جیسے عراق سے موت اور تباہی کی خبریں آ رہی تھیں لوگوں کا خون کھولتا جا رہا تھا۔ مسجد میں جمعہ کی نماز پر دعائیں مانگی جا رہی تھیں، کباب کے ہوٹلوں میں اڈا دینے والوں کی بھیڑ بڑھ گئی تھی بلکہ اب تو ان کے کچھ شاعر بھی واپس آ گئے تھے جو فوری طور پر عراق اور صدّام کی حمایت میں نظمیں اور قطعات لکھ کر محلّہ کی سطح کے مشاعروں میں مشہور ہو گئے تھے۔ مگر ٹی وی پر اسی درمیان صدّام کے ظلم و ستم کے کارنامے بھی اجاگر ہونے لگے تھے کہ کس طرح وہ اپنے مخالفوں کو طرح طرح کی اذیتیں دے کر ختم کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا، کس طرح اس نے ایران سے جنگ کے دوران ایرانی سپاہیوں پر مہلک کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال کیا تھا جس کے نتیجے میں ہزاروں افراد ہلاک ہو گئے تھے، کس طرح اس نے دھوکے سے اپنے دونوں دامادوں کو عراق

بلوا کر جو اپنی جان کے خوف سے دوسرے ملک میں پناہ لئے ہوئے تھے، قتل کروا دیا تھا، کیسے کردوں پر زہریلے اعصابی گیس کے ذریعے تباہی مچائی تھی، کردستان کے تقریباً ایک لاکھ باشندوں کو ملک بدر ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

دھیرے دھیرے صدام کے لئے ہماری ہمدردی میں کمی آتی گئی، مگر عراق پر امریکہ کا حملہ ایک ایسا فعل تھا جس کے لئے ہم امریکہ کو معاف کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ یوں بھی جوہری ہتھیاروں کی عدمِ دستیابی کے بعد جارج بش بے نقاب ہو گیا تھا۔ پھر بھی یا تو امریکہ کے خوف سے یا صحیح معنوں میں اس کے ساتھ نفرت کے سبب اب صدّام کی حمایت میں ساری دنیا میں کوئی بھی کھڑا ہونے پر تیار نہ تھا گرچہ ہر کوئی بش کے اس حملے کی زبانی مذمت کر رہا تھا۔

ایسے ہی ایک دن، میں اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، مسجد سے نماز پڑھ کر واپس لوٹ رہا تھا جب مجھے دوسری طرف سے شہریار آتا دکھائی دیا۔ ہم سڑک کے داہنے کنارے چل رہے تھے اور ایک دوسرے کو نمایاں طور پر نظر انداز کرنے کے لئے تیار تھے۔ مگر بہت جلد ہمیں پتہ چل گیا کہ اس طرح کترانا ممکن نہ تھا۔ ہم اس تذبذب کے شکار تھے کہ چلتے چلتے ایک دوسرے کے روبرو آ گئے۔ ایک پل کے لئے ہم دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے پر ٹکی رہیں اور پھر ہم ہنس دیے۔

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا تھا۔

''کیسے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''اچھا ہوں۔'' میں نے اس کی ہتھیلی کو گرمجوشی سے دباتے ہوئے کہا۔ ''شادی کی؟''

''نہیں''

''میں نے بھی نہیں کی ہے۔'' میں ہنسا۔ کسی وجہ سے ہم دونوں صدّام کے موضوع سے گریز کر رہے تھے اور یہی وہ موضوع تھا جو کبھی ہماری دشمنی کا سبب بنا تھا۔

''ادھر کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''کہیں نہیں۔ میں نے سوچا تھوڑا کباب چکھ لوں۔ صبح ناشتہ کئے بغیر دکان آ گیا تھا۔''

وہ جھوٹ کہہ رہا تھا۔ مجھے خبر ملی تھی کہ اس کی سوتیلی ماں سے اس کے تعلقات اچھے نہیں جا رہے تھے اور اب وہ ہوٹل میں کھانا کھانے لگا تھا۔

ہم دونوں نے ایک ساتھ ایک ہوٹل کے گندے بینچ پر بیٹھ کر پیپسی کولا کے ساتھ گرم گرم

کھیری کباب (جن میں کوئلے کا ذائقہ شامل تھا) اور پراٹھے کھائے اور تنکوں سے دانت کریدتے ہوئے واپس لوٹے۔ ہم لوگ رانیہ کی کوٹھی کے سامنے سے گذر رہے تھے جب ہم نے اس کے چوزوں کو بالکنی میں کھیلتے دیکھا۔

''شادی کے بعد میں نے کبھی رانیہ کے شوہر کو نہیں دیکھا۔'' میں نے کہا۔ ''اس وقت وہ سہرا، پھول اور تہہ بہ تہہ رنگین کپڑوں میں اتنا ڈھکا ہوا تھا کہ نظر ہی نہ آیا۔''

''میں نے سنا ہے وہ ایک موٹی توند والا کافی بدصورت پولس سرجنٹ ہے جو اپنی خوبصورت بیوی کے ساتھ نکلنے سے خائف رہتا ہے۔''

''خوبصورت لڑکیاں ہمیشہ بدصورت مردوں کو بیاہی جاتی ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''شاید اس طرح قدرت اپنا توازن ٹھیک رکھتی ہے اور چیزیں اعتدال میں رہتی ہیں۔'' پھر میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ ''رانیہ کو اب تمہیں دیکھ کر کیسا لگتا ہے؟''

''برا نہیں لگتا۔ صرف اس کے کولھے تھوڑے سے پھیل گئے ہیں۔ اب میں جب اس کے بچوں کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں یہ بچے میرے بھی ہو سکتے تھے۔''

''اور میرے بھی اگر وہ بڑی بی اس دن میرے بڑے بھائی کے لئے رشتہ لے کر ہمارے گھر نازل نہ ہو جاتی۔''

ابھی ہم اس مذاق سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ رانیہ بالکنی پر دکھائی دی۔ اس نے ایک عینک پہن رکھی تھی۔ نہ صرف یہ کہ اس کے جسم پر چربی کی تہیں چڑھ گئی تھیں بلکہ وہ اپنے کپڑوں اور بال کی طرف سے بھی لاپرواہ نظر آ رہی تھی۔ اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور اپنی چھوٹی بچی کو اٹھا کر اندر چلی گئی۔ رانیہ نے شاید ہمیں نہیں پہچانا تھا یا جان بوجھ کر ہمیں نظر انداز کر دیا تھا۔ یا پھر کون جانے، شاید اس کا سرجنٹ شوہر اندر کمرے میں بیٹھا ہو۔

ہم متنازعہ حویلی کے سامنے سے گذر رہے تھے جب میں نے کہا۔ ''کتنا کچھ بدل گیا ہے۔ لیکن انسان وہی ہے جو وہ ہزاروں سال پہلے تھا، جنگ کرتا ہوا، عشق کرتا ہوا، بیوقوفیاں کرتا ہوا، بچے پیدا کرتا ہوا، تمہارا کیا خیال ہے؟''

''ہمیں یہ تسلیم کر لینی چاہئے کہ یہ دنیا بدلنے والی نہیں۔'' شہریار نے کہا۔ ''اور اس کے بعد بھی کرنے کے لئے اگر کچھ رہ جاتا ہے تو اس کا جواز پیدا کرنا بجائے خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔''

لال چیونٹیاں

''ایسا نہیں ہے کہ خدا کی ذات میں میرا یقین نہیں ہے۔ میں تو صرف بہت ہی احترام کے ساتھ ان کا دیا ہوا ٹکٹ انھیں واپس لوٹا رہا ہوں۔'' آئیوان کاراماز وو

[دوستوئفسکی کے ناول کا ایک کردار]

اینٹ اور محرابوں والا دقیانوسی پل سنسان پڑا تھا۔ اس پر آخری ٹرین کو گذرے آدھا گھنٹہ سے زیادہ ہو چکا تھا۔ پل سے نصف فرلانگ دور ایک بوڑھا اپنی پیوند لگی چھتری اور اردو اخبار کے ساتھ، جسے وہ صبح سے شام تک پڑھا کرتا، ایک ٹیلے پر بیٹھا نیچے ڈھال کی طرف تاک رہا تھا جہاں اس کی بکریاں گھاس چر رہی تھیں۔ نیچے جہاں کھیت شروع ہو گئے تھے ایک ٹیلی گراف پول کے نیچے سوکھی جھاڑیوں سے گھرا ہوا منحنی سا پوکھر تھا جس کے کنارے ایک نو سال کا بچہ سفید نیکر اور آدھی آستین والی عنابی رنگ کی ٹی شرٹ پہنے ایڑیوں کے بل بیٹھا مٹی پر کچھ کر رہا تھا۔ جاڑا ختم ہو رہا تھا مگر رات ہلکی بارش ہو جانے کے سبب ہوا میں خنکی آ گئی تھی جو دھوپ کی تمازت میں آرامدہ لگ رہی تھی۔ پوکھر میں بہت کم پانی رہ گیا تھا جس پر بچھے کنول کے پتوں پر پانی کے قطرے موتی کی طرح ڈول رہے تھے۔

''یہ تم وہاں کیا کر رہے ہو؟'' بوڑھے نے چلا کر کہا۔ ''تمھاری بکریوں کو اچھی گھاس نہیں مل رہی ہے۔''

''میں چیونٹیوں کے ساتھ کھیل رہا ہوں دادا۔''

''کالی کہ لال؟''

''لال!''

بوڑھے نے آسمان پر نظر دوڑائی جس کے نیلے پن میں جگہ جگہ سفید دھاریاں پڑی ہوئی تھیں جیسے بادلوں کے کچھ تراشے وہاں رہ گئے ہوں۔ سورج مشرقی آسمان پر کافی اوپر آ گیا تھا اور اس طرح تمتمار ہا تھا جیسے آج وہ زمین کے زیادہ سے زیادہ حصے پر اپنی روشنی پھیلانے پر بضد ہو۔ ''تم انھیں چھوٹی چیز سمجھنے کی غلطی نہ کرو بچے...'' بوڑھے نے کہا۔ ''...لال چیونٹیاں خطرناک ہوتی ہیں۔ یہ سارا علاقہ ان چیونٹیوں سے بھرا پڑا ہے۔''

''میں انھیں سبق سکھانا چاہتا ہوں۔'' لڑکے نے جواب دیا اور اپنی چھوٹی چھوٹی مضبوط ٹانگوں سے چھلانگ لگاتا ہوا بوڑھے کے پاس آ گیا۔ اس کے ہات میں پلاسٹک کی ایک چھوٹی شیشی تھی جس کے اندر اس نے چیونٹیاں جمع کر رکھی تھیں۔

''یہ تم نے کہاں سے سیکھا؟'' بوڑھے نے شیشی اس کے ہات سے لیتے ہوئے کہا جو اندر کلبلاتی چیونٹیوں کے سبب سرخی مائل ہو گئی تھی۔ ''ہمارے وقت میں ہم اسے سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔''

''میں نے سنا ہے، آپ لوگ بہت ظالم ہوا کرتے تھے۔'' لڑکے نے شیشی واپس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ لوگوں کے سبب ہے کہ اب تتلیاں بہت کم نظر آتی ہیں۔''

بوڑھے نے ایک بار پھر آسمان پر نظر دوڑائی اور مسکرایا۔ ''لگ رہا ہے اب اسکولوں میں اچھی پڑھائی ہو رہی ہے۔ تم بکریوں کو سامنے چڑھائی پر کیوں نہیں لے جاتے جہاں کچنار کے پیڑ ہیں؟ وہاں دوسری طرف ڈھال پر تمہیں دوب نظر آئے گی۔ پھر تم ایک اچھے چرواہے نہیں بن سکتے۔''

''مجھے پرواہ نہیں، میں تو ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔''

ہاں، اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے، بوڑھے نے سوچا۔ ہم بچوں کو ہمیشہ وہی چیزیں نہیں سکھا سکتے جو صدیوں سے چلی آ رہی ہیں۔ بوڑھے نے بچے کے ہات سے شیشی لے کر اس کے اندر کلبلاتی چیونٹیوں کی طرف غور سے دیکھا، گرچہ اس کی آنکھوں میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ ان چیونٹیوں کو انفرادی طور پر دیکھ پاتا۔ شاید وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہ معمولی چیونٹیاں نہیں ہیں۔ ایک بار ہم لوگوں نے اپنے بچپن میں مٹی کے ایک ڈھیر کو توڑا تھا جس کے اندر چیونٹیوں نے اپنی کالونی بسا رکھی تھی۔ اتنی ساری چیونٹیوں کو ایک ساتھ کلبلاتے دیکھ کر وہ لوگ حیران رہ گئے تھے۔ ان میں بہت ساروں کے پر بھی نکل آئے تھے۔ ''تم ان چیونٹیوں کے بارے میں یقین سے نہیں

کہہ سکتے کہ ان کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''یہ بکریاں نہیں کہ جدھر چاہے ہانک دو، جب چاہو گردن پر رسی ڈال دو یا سینگ سے پکڑ کر باڑے میں بند کر دو۔ انھیں قید رہنا پسند نہیں۔ تم انھیں ہمیشہ کے لئے روک نہیں سکتے۔''

بچہ بوڑھے کی چھڑی لے کر نشیب میں اتر چکا تھا۔ ''دادا، ڈھکن مت کھولنا، چیونٹیاں باہر نکل آئیں گی۔''

''تمہارا دماغ تو صحیح ہے؟'' بوڑھا چلایا۔ دراصل اپنی لاعلمی میں وہ ٹن کا زنگ کھایا ہوا ڈھکن کھول چکا تھا اور دیکھتے دیکھتے چیونٹیاں اس کی انگلیوں پر نکل آئی تھیں۔ انگلیوں کو جھاڑتے ہوئے اس نے جلدی سے ڈھکن واپس لگا دیا۔ ''ایسا کیسے چل سکتا ہے۔ تم انھیں اس طرح قید نہیں کر سکتے۔ آخر تمہارا ارادہ کیا ہے برخوردار؟''

بچے کو جواب میں دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بکریوں کو ہنکاتے ہوئے نیچے دھان کے کھیت میں اتر رہا تھا جس کی فصل کاٹ لی گئی تھی اور اب ہر طرف پیال کے برش نما ٹھنٹھ پر بھنبیریاں منڈلا رہی تھیں۔ کھیت کی مٹی رات کی بارش کے سبب گیلی ہو رہی تھی۔ اس سے احتراز کرتے ہوئے وہ چڑھائی چڑھنے لگا جہاں کچنار کے پتے بچھے ہوئے تھے۔ اونٹ کے سموں کا آکار لیے ہوئے یہ پتے بچے کو ہمیشہ حیران کر دیتے۔

بوڑھے نے مڑ کر نصف میل دور اپنے چھوٹے سے گاؤں پر نظر ڈالی جس کے زیادہ تر چھپر پھوس کے تھے مگر چند ٹن کی چھتیں بھی تھیں جو مورچہ کھا کر کتھئی رنگ کی ہو گئی تھیں۔ یہاں سے گھروں اور کھلیانوں کے باہر لگائی گئی کھپچ کی ٹٹریوں یا مٹی کی دیواروں کے آس پاس شاذ و نادر ہی کوئی جانور یا انسان دکھائی دے رہا تھا۔ اب لوگ گاؤں میں رہنا پسند نہیں کرتے، بوڑھے نے آہ بھر کر سوچا۔ میں اس گاؤں میں پیدا ہوا اور ساری زندگی اسی گاؤں میں رہا۔ ایک آدھ بار رشتہ داری یا شادی بیاہ کی خاطر دوسرے گاؤں جانا تو پڑا اور کئی بار علاج کے لئے یا ضروری سامان کی خریداری کے لئے شہر کا رخ بھی کرنا پڑا بلکہ ایک بار عدالت کے چکر میں میں بڑے شہر تک ہو آیا جس کے بڑے سے لوہے کے پل سے جتنے لوگ بقچہ اٹھائے باہر آ رہے تھے اس سے کہیں زیادہ تعداد میں لوگ اندر جا رہے تھے جیسے کوئی ان دیکھی طاقت انھیں اس جہنم میں ڈھکیل رہی ہو، مگر اس سے بڑا عجوبہ یہ تھا کہ وہاں بجلی کے تار کے نیچے لوہے کی پٹریوں پر چوکور کھڑکیوں والے

ڈبے رینگ رہے تھے جن کے اندر لوگ بدھو کی طرح بیٹھے ہوئے تھے جب کہ وہ پیدل زیادہ تیز جا سکتے تھے۔ بعد میں مجھے لوگوں نے بتایا کہ بجلی کے آنے سے پہلے ان ڈبوں کو گھوڑے کھینچتے تھے جیسے وہ اللہ کی مخلوق نہ ہو کر کوئی مشین ہوں جس سے جو بھی کام چاہو لے سکتے ہو۔ مگر کل ملا کر دیکھا جائے تو اس گاؤں سے میں کبھی باہر نہیں گیا۔ اور مجھے نہیں لگتا اس سے میں نے کہیں کچھ کھویا ہے۔ مگر یہ بچے، ان کے دودھ کے دانت ٹھیک سے ٹوٹ بھی نہیں پاتے اور ان کے پر نکل آتے ہیں۔ اس نے شیشی کے اندر کلبلاتی چیونٹیوں کی طرف شرارت سے دیکھا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ لال چیونٹیاں نہ ہوں، سینکڑوں چھوٹے چھوٹے بچے ہوں ہو جن کے پر نکل آئے ہوں۔

بچے کو بکرے بکریاں پسند تھیں۔ وہ ان کے ساتھ ہی کھیلتے ہوئے بڑا ہو رہا تھا۔ یہ اس وقت بھی خطرناک نہیں ہوتے جب ان کے سینگ نکل آتے ہیں۔ یہ جب آپس میں لڑتے ہیں تو ان کے سینگ یا سروں کے ٹکرانے میں کوئی وحشی پن نہیں ہوتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے ایک آدھ ٹکر لگا کر وہ دیکھنا چاہتے ہوں کہ سینگ مضبوطی سے اپنی جگہ قائم ہیں یا نہیں۔ بڑے بڑوں کی دیکھا دیکھی میمنے بھی ان کی نقل کرنے سے باز نہیں آتے۔ اسے ان میمنوں کی منحنی دمیں پسند تھیں جو ہر وقت ہلتی رہتیں، جنھیں آپ ہزار کوشش کے باوجود پکڑ نہیں سکتے۔ اور بکریاں، وہ جب چلاتی ہیں تو دور تک کتنے سکون کا احساس ہوتا ہے۔ یہ چلانا ان کتوں کے بھونکنے سے کتنا مختلف ہوتا ہے جو اچانک سناٹے کو چونکا دیتے ہیں۔ اگر میرا ڈامنا مر نہ گیا ہوتا تو میں اسے ان بکریوں کی تہذیب سکھاتا۔ اسے یاد نہیں تھا اس کا اور ڈامنا کا ساتھ کب شروع ہوا۔ گاؤں کی زندگی میں کوئی چیز باہر سے نہیں آتی، نہ کسی چیز کی شروعات ہوتی ہے۔ سب کچھ یہاں کے ماحول میں موجود ہوتا ہے، ہمیشہ سے موجود ہوتا ہے، اس کے اپنے گاؤں کی طرح جو ہمیشہ سے موجود ہے، اس آسمان کے نیچے جو اس کی پیدائش کے پہلے دن سے موجود ہے اور اس کی موت کے بعد بھی موجود رہے گا چاہے وہ کہیں بھی رہے اور کہیں بھی چلا جائے، یا اس تالاب کی طرح جس کی عمر کوئی نہیں جانتا یا درختوں کے جھنڈ کی طرح جو ڈھلانوں پر ایک ہی انداز سے کھڑے بادلوں کا انتظار کرتے ہیں، بادل جو زیادہ تر انھیں نظر انداز کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں یا زمین سے لہروں کے مانند نکلی ہوئی ان عفریتی چٹانوں کی طرح جن کی کسی نوکیلی چوٹی سے کبھی کبھار کسی اہم جو میمنے کو اتارتے وقت اچھا خاصہ ہنگامہ مچ جاتا ہے۔ ڈامنا، وہ بڑا ہی کمینہ کتا تھا جسے چھوٹے چھوٹے جانوروں میں

دہشت پھیلانا پسند تھا۔ ڈامنا نے کبھی کسی کو کاٹا نہیں تھا، مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ کسی کو کاٹ نہیں سکتا تھا۔ دراصل اس گاؤں میں کاٹنے کے لئے اوسطاً لوگ کم تھے یا پھر یوں ہے کہ گاؤں والوں کے پاس اتنا پیسہ نہ تھا کہ وہ کتوں سے کٹوانے کا خطرہ مول لیتے۔ اس کے گاؤں میں ڈامنا واحد کتا نہ تھا، مگر یہ ڈامنا بھی عجیب تھا۔ اس نے پچھلے سال اچانک ایک دن چپ رہنے کی عادت ڈال لی اور کھانا پینا بند کر دیا۔ اس واقعے کو کچھ ہی دن گذر پائے تھے کہ ایک صبح لوگوں نے دیکھا وہ اپنی دم کے گرد چکر لگا رہا تھا جیسے کسی نے اس کی مقعد پر پٹرول ڈال دیا ہو۔ وہ بلا وجہ بھونکنے اور غرانے بھی لگا تھا۔ اس نے ڈھلان کی طرف بھاگنے کی عادت ڈال لی جہاں سے اسے لانے کے لئے اچھی خاصی محنت کرنی پڑتی۔ ''اس نے کوئی سایہ دیکھ لیا ہوگا۔'' بوڑھے نے بچے کو تاکید کی۔ ''اس سے دور رہنا۔ وہ پہلے بھی کوئی اچھا کتا نہ تھا۔'' بچے کو دادا کی بات سے تکلیف پہنچی تھی۔ کیا صرف اس لئے کہ وہ ایک جانور تھا؟ اگر وہ بیمار ہے تو اس کا علاج کیوں نہیں کیا جا سکتا؟ بوڑھے کو اس کی بات سن کر ہنسی آ گئی تھی۔ ''تم ان کتوں کا کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ اگر مرنے کی ٹھان لیں تو تم انہیں روک نہیں سکتے۔ لیکن گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہر بار ایک دوسرا کتا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ یہ ان جانوروں کی پرانی عادت ہے۔'' ڈامنا کو مرے ہوئے ایک برس ہو چکا تھا، مگر کسی دوسرے کتے نے اس کی جگہ نہیں لی تھی گر چہ گاؤں میں کتوں کی تعداد میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اسے ڈامنا کی موت پر حیرت ہوئی تھی۔ وہ ایک شام ڈھلان سے گھر واپس نہیں لوٹا اور چار دن بعد دو کوس دور جنگل کے اندر مردہ پایا گیا۔ اس کے سارے جسم پر زخم کے نشان تھے، دیدے پھٹے ہوئے تھے، پپوٹوں اور نتھنوں پر پسو بیٹھے ہوئے تھے اور زخموں پر بھاری تعداد میں مکھیاں بھنبنا رہی تھیں۔ (بعد میں اسے پتہ چلا تھا کہ اس نے دور کے کسی آدیباسی گاؤں میں کافی تباہی مچائی تھی، ایک گھر میں گھس کر نہ صرف ایک عورت کو کاٹنے کے بعد اسکول کے میدان میں چار بچوں کے منہ اور پاؤں میں کاٹ لیا تھا بلکہ دو بکریوں اور ایک کتے کو بھی کاٹا تھا۔ آدیباسیوں کو جب اس بات کا پتہ چلا تو انھوں نے لاٹھی ڈنڈوں سے اس کی خوب ٹھکائی کی اور اسے جان بچا کر جنگل کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا جہاں زخموں کی تاب نہ لا کر اس نے دم توڑ دیا تھا۔) یہ ہوا میں تیرتی اس کے جسم کی باس تھی جس کے سبب اسے ڈھونڈنا ممکن ہو سکا۔ چھوٹے چاچا نے جواب اسی طرح کے کاموں کے لئے رہ گئے تھے، اسے ڈھونڈنے میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ شاید ڈامنا کے زخموں میں

زہر پھیل چکا تھا کیونکہ چیل اور کوے اس سے کچھ دور کھڑے چپ چاپ اس کی طرف دیکھ رہے تھے بلکہ ایک بوڑھا گدھ جس کی گردن پر ایک بھی بال نہ تھا ایک قریب کی چٹان پر بیٹھا تذبذب سے اس کی طرف تاک رہا تھا۔ دونوں ناک پر کپڑا دبائے گھر واپس لوٹ آئے۔ شاید یہی وہ موت ہے جسے بڑے بوڑھے کتے کی موت کہتے ہیں۔ بچہ ایک جھاڑی کے سائے میں ہری دوب پر بیٹھا ہوا تھا جہاں سے وہ بکریوں پر نظر رکھ سکتا تھا۔ اس کے سامنے ایک بہت ہی ٹھگنا درخت اپنے پھپھوندی سے ڈھکے ہوئے تنے کے ساتھ کھڑا تھا جیسے اسے فیل پا کی بیماری ہو گئی ہو۔ اس کی خشک ٹہنیوں پر حیرت انگیز طور پر نئے نئے مدور پتے نکل آئے تھے۔ مٹی سے نکلی ہوئی جڑوں پر لال بیگ رینگ رہے تھے اور چیونٹیاں چکردار سیڑھی کی شکل میں درخت کے کھردرے تنے پر چل رہی تھیں جن کا ایک قافلہ اوپر کی طرف جا رہا تھا جبکہ دوسرا نیچے اتر رہا تھا۔ نیچے اترتی چیونٹیوں نے کافی بڑی جسامت کی ہری ہری پتیاں بادبان کی شکل میں اوپر اٹھا رکھی تھیں جن کے بوجھ سے وہ ڈگمگاتے ہوئے چل رہی تھیں۔ دادا ٹھیک کہتے ہیں، یہ سارا علاقہ چیونٹیوں سے بھرا پڑا ہے۔ مگر جانے چیونٹیاں ان پتیوں کا کیا کرتی ہوں گی؟ شاید ان بے ضرر لال بیگ کی طرح انھیں بھی پتوں کا رس مرغوب ہو۔ یہ چیونٹیاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ یہ مردہ جڑوں سے لے کر مردہ کیڑوں مکوڑوں تک کو نہیں چھوڑتیں۔ ان کی اچھی خاصی تعداد یہاں سے سات فرلانگ دور برساتی نالے کے کنارے دیکھی جا سکتی تھی جو نالا کہلاتا تو تھا مگر سال کے نو مہینے سوکھا پڑا رہتا یا اس میں پانی برائے نام رہتا۔ اس نالے کے کنارے کوڑھیوں کی بستی تھی جہاں کے درخت ان جذام کے مریضوں کی طرح ہی مرگھلے تھے اور ہر دوسرے یا تیسرے پیڑ پر دم کوڑوں کا غلبہ تھا۔ موسم کوئی بھی ہو ان کے تنوں سے لاسے رستے رہتے۔ ڈامنا کی تلاش میں وہ ایک بار اس نالے کے اوپر جا نکلا تھا۔ نالا کافی نیچے واقع تھا۔ وہ جس چٹان پر کھڑا تھا وہ کسی چونچ کی طرح نکلی ہوئی تھی جہاں سے نیچے نالے کے پانی کو دیکھا جا سکتا تھا۔ اس نالے میں پانی سے زیادہ پتھر اور چٹانیں تھیں۔ نالا کے دوسرے کنارے کوڑھیوں کے گھاس پھوس کے چھپر تھے جن کی مٹی کی دیواروں سے ہانڈیاں اور بانس کے ٹوکرے لٹک رہے ہوتے۔ ایک ٹن کا گھر بھی تھا جس کی چمنی سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس چمنی کو دیکھ کر لگ رہا تھا کسی متروک ریلوے کوارٹر کی چھت سے اکھاڑ کر اس جگہ لگا دی گئی تھی۔ شاید وہ کسی قسم کا پنچایتی کچن ہو۔ مٹی کی دیواروں پر کھریا مٹی اور چونے سے پھول

بنائے گئے تھے۔ ہر جھونپڑے کے باہر اوکھ کی چٹائیوں سے گھرے سبزی کے کھیت تھے۔ ایک گھر سے لگے ہوئے ڈربے کے باہر ایک چینی مرغی کھڑی اپنے پنجوں سے زمین کو کھرچ کھرچ کر چوزوں کو دانہ چگنے کی تعلیم دے رہی تھی جب کہ ایک دوسرے گھر کے باہر سور کی ایک لحیم شحیم مادہ دیوار سے گتھی ہوئی ناند کے اندر اپنی تھوتھنی ڈالے پیروں سے اپنے ان گنت بچوں کو ڈھکیلتی جا رہی تھی جو اس کے بڑے سے بے شمار گھنڈیوں والے تھن میں گھسے جا رہے تھے۔ وہ دیر تک نالے کے اوپر کھڑا اپنچے کوڑھیوں کی بستی کی طرف دیکھتا رہا۔ مگر کل ملا کر اسے جذام کا صرف ایک ہی مریض دکھائی دیا جس کے پیچھے ایک کتے کا پلا چل رہا تھا جیسے وہ اس کے سائے کے ساتھ گھسٹ رہا ہو۔ وہ شاید کوئی عورت تھی جس نے لنگی پہن رکھی تھی۔ پیروں کی ساری انگلیاں گل جانے کے سبب وہ مشکل سے چل پا رہی تھی۔ مگر فاصلہ کچھ کم ہونے پر اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کا چہرا تو کسی مرد سے ملتا جلتا تھا۔ اس نے پرانے ٹائر کی بڑی جسامت کی چپلیں پہن رکھی تھیں جنھیں بچے نے اپنے گاؤں میں آنے والے زیادہ تر بھکاریوں کو پہنتے دیکھا تھا۔ کوڑھی نے بچے کو دیکھ لیا۔ اس کی ناک کی جگہ ایک سوراخ تھا اور اس کی آنکھوں پر تار کے حلقوں میں پھنسی کانچ کی دو تاریک نکیاں تھیں جنھیں اس نے ڈنڈیوں کی غیر موجودگی میں سُتلی کی مدد سے سر کی پشت سے باندھ رکھی تھیں۔ شاید اسے دھوپ سے پریشانی ہوتی ہو۔ وہ اپنے پوپلے منہ سے عجیب انداز سے ہنس رہا تھا یا ہنس رہی تھی۔ ڈامنا اس گاؤں میں کبھی نہیں ہو سکتا، بچے نے فیصلہ کیا اور واپس لوٹ آیا۔ اس نے جب دادا سے اس بات کا ذکر کیا تو اس نے اپنے مضبوط دانتوں سے ہنستے ہوئے اس کا سر سہلایا۔ ”وہاں پر ہر گاؤں کے نمائندے تمہیں نظر آئیں گے۔ ان میں کافی پڑھے لکھے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ تھوڑا قریب جانے پر تم انھیں پہچان سکتے تھے۔ کوڑھیوں کے ہسپتال سے نکلنے کے بعد انھیں اپنے لوگ قبول نہیں کرتے اس لئے وہ انسانی آبادی سے الگ تھلگ اپنی کالونی بسا لیتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ نالے کے پانی سے سبزی اگاتے ہیں اور عبادت گاہوں کے باہر یا اسٹیشنوں میں بھیک مانگتے ہیں۔ پڑھے لکھے لوگوں کے بارے میں میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے ان کے لوگ پیسے بھیجتے ہوں۔ مگر پھر میں سوچتا ہوں، ان کی انگلیاں تو ہوتی نہیں، جانے وہ منی آرڈر پر کیسے دستخط کرتے ہوں گے! ان کے چہرے پھول کر کپا ہو جانے کے سبب کبھی کبھی پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ تم کسی مرد کو دیکھ رہے ہو یا عورت کو۔ اور وہ زیادہ تر تمہیں

پوپلے نظر آئیں گے کیونکہ ان کے جبڑے فساد خون کے سبب پہلے تو غبارے کی طرح پھول جاتے ہیں اور پھر سکڑنے لگتے ہیں جو دانتوں کو سنبھال نہیں پاتے۔'' اسے دادا پر حیرت ہوتی۔ انھیں ہر بات کا کیسے پتہ ہوتا ہے؟ شاید ان کا اخبار جسے وہ ہر روز بلا ناغہ صبح سے شام تک پڑھا کرتے ہیں یا پھر آسمان یہ سب کچھ دادا کو بتاتا ہے۔ اس نے اکثر دادا کو آسمان سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے دادا کی باتیں غور سے سنا کرتا اور ان کے نامانوس لفظوں کو ان کے مبہم مفاہیم کے ساتھ ذہن نشیں کرنے کی کوشش کرتا۔ ایک بار جب دادا ڈاکیہ سے منی آرڈر کی رقم وصول کر رہے تھے جسے بچے کا باپ شہر سے بھیجا کرتا جہاں وہ ایک سرکاری بینک میں ملازم تھا، تو انھوں نے ڈاکیہ کی سائکل کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ ''میں نے ایک انگریز گارڈ کو دیکھا تھا جو اسی طرح کی ایک سائکل اپنی ٹرین کے کیبن میں رکھا کرتا۔ وہ اپنی سائکل کی بڑی حفاظت کیا کرتا۔ اسے گاؤں کے راستوں پر سائکل چلانا پسند تھا۔'' ''پھر تو وہ بالکل پاگل تھا۔'' ڈاکیہ نے کہا۔ ''کوئی بلاوجہ بھی سائکل چلاتا ہے بھلا۔'' ''ہمیں ہر وہ چیز پاگل دکھائی دیتی ہے جسے ہم سمجھ نہیں پاتے۔'' ڈاکیہ کے جانے کے بعد دادا نے روپیوں کو دوبارا گنتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے نوٹ پر بنی آدمی کی تصویر پر اپنی انگلی رکھ کر بچے کی توجہ اس کی طرف مبذول کی۔ ''اس تصویر کو دیکھ رہے ہو۔ آدمی اپنی تصویر میں کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ نہ ہی وہ مرتا ہے۔ لیکن کیا وہ اپنی تصویر میں بھی اتنا ہی عقلمند یا بے وقوف ہوتا ہے، مجھے یہ نہیں پتہ۔''

اگلے برس جب مجھے بڑے اسکول میں داخلہ ملے گا جو چار کوس دور ہے تو ابو نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے ایک سائکل دلا دیں گے۔ بڑے چاچا کی سائکل کی طرح زنگ کھائی ہوئی مریل سائکل نہیں جس کی چین ہر دس منٹ پر اتر جاتی ہے، بلکہ ایک مضبوط اور بالکل نئی سائکل۔ ممکن ہے وہ اس انگریز گارڈ کی سائکل نکل آئے یا اس جیسا کچھ اور میں وعدہ کرتا ہوں میں اس سائکل کا پورا خیال رکھوں گا۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ایک سفید فام کو دیکھنے لگا جو ایک چمکدار سائکل پر چلا جا رہا تھا۔ دھوپ سے بچنے کے لئے اس نے سر پر تنکے کا ایک ہیٹ چڑھا رکھا تھا اور اس کے تاریک اور مخروطی ہونٹوں کے بیچ ایک بیڑی سلگ رہی تھی۔ اس نے دادا اور ڈاکیہ کو بھی دیکھا جو ایک اونچی جگہ پر کھڑے اس انگریز گارڈ کو حیرت سے دیکھ رہے تھے جیسے اس سے پہلے انھوں نے

کسی احمق کو نہ دیکھا ہو۔

//////

گاؤں کی مسجد کے کھپریلوں کو کوّوں نے تحس نحس کر رکھا تھا۔اس کے مٹی کے برامدے پر قطار سے سجے ہوئے پلاسٹک کے رنگین لوٹوں میں وضو کے بعد جان بوجھ کر تھوڑا پانی چھوڑ دیا جاتا تاکہ وہ ہوا سے الٹ نہ جائیں اور ہر اذان کے بعد اس کا پیش امام جو اس کا موذن بھی تھا ہمیشہ سوچا کرتا، میں یہاں بھٹک کر کیسے آ گیا اور ایسا کیا ہے یہاں میرے رکنے کے لئے کہ میں رک گیا جب کہ یہاں میرے بھر پیٹ کھانے کا انتظام تک نہیں؟ مسجد کے پیچھے جہاں وہ تالاب کے پانی کی مدد سے ٹماٹر اگایا کرتا، بچے کلام پاک پڑھنے آتے جن سے ہر ہفتے اسے ایک اٹھنی کی امید ہوتی۔ فاتحہ اور جھاڑ پھونک سے وہ بس اتنا بھر نکال پاتا کہ گھر کچھ رقم بھیج سکے جس کے لئے ڈھال میں ڈاکخانے کی طرف اسے دو کوس کا فاصلہ پیدل طئے کرنا پڑتا۔اور جب وہ بہت پریشان ہو جاتا تو بڑے کافرانہ انداز سے سوچتا، خدا کو ہم جیسوں کے لئے فرصت نہیں ہے اور اس بوڑھے کو اپنے پوتے اور بکرے بکریوں سے کبھی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ وہ نماز کے لئے مسجد آوے۔ میرا بس چلتا تو میں اس کے لئے کوڑے کی سزا تجویز کرتا۔اور اس لڑکے کو میں اس کے بچپن سے دیکھ رہا ہوں۔ وہ اپنے دادا کی طرح ہی سر پھرا ہے۔ یہ سارا گاؤں ہی سر پھرا ہے۔ خدا کو اگر مجھے یہاں بھیجنا تھا تو اس کی کوئی مصلحت رہی ہوگی۔ مجھے ایسی کوئی مصلحت دور دور تک دکھائی نہیں دیتی۔ شاید خدا کے پاس میرے لئے فرصت نہیں ہے۔اور اب تو لوگ جھاڑ پھونک کے لئے بھی کتنا کم آنے لگے ہیں۔ کیا سارے بھوت پریت نیست نابود ہو گئے؟ اسے عمل برائے نام آتا تھا ورنہ وہ جنوں کو بلا کر اس گاؤں پر نازل کرتا۔ مگر آدھی رات کو چھپر پر کھٹر پٹر سن کر اس کی نیند کھل جاتی تو مارے خوف کے اس کی گھگھی بندھ جاتی۔ وہ دفیعہ بلیات کی ساری سورتیں بھول جاتا۔ پھر ایک رات جب اس نے مسجد کے صحن پر سفید چادر سے لپٹی ایک عورت کو دیکھا جو بال بکھرائے بیٹھی اپنی خونیں آنکھوں سے اس کی طرف تاک رہی تھی تو اس کے ہات پاؤں پھول گئے۔اس نے سورۂ اخلاص پڑھ کر اپنے گرد حصار کھینچنے کی کوشش کی، مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ اس سورت کو سرے سے بھول چکا تھا۔ اسی ادھیڑ بن میں اس کے پیشاب خطا ہو گئی اور اس نے دیکھا وہ عورت اپنی جگہ سے غائب ہو چکی تھی۔ اس صبح جب اذان کی آواز نہیں آئی تو تفتیش کے لئے گئی

کثر نمازی منہ اندھیرے مسجد کی طرف آئے۔ انھوں نے دیکھا امام تالاب کے پتھر پر جنگھیا پہنے بیٹھا تھا اور سر پر لوٹے سے پانی انڈیل رہا تھا۔ اسکے دانت ٹھنڈ سے بج رہے تھے اور آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔ دوسرے دن سے وہ نماز عشاء کے بعد مسجد کے کواڑ پر قفل لٹکا کر گاؤں کے ایک گھر میں سونے لگا۔ بوڑھے نے پیش امام کو ہمیشہ ایک بے وقوف کی طرح دیکھا تھا جس کے سر پر قاعدے کی ہڈیاں تک نہ تھیں کہ ٹوپی ٹھیک طرح سے کھڑی رہ سکے۔ ایسا فاقہ کش انسان میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا ہے۔ بوڑھے کو جمعہ یا جنازہ کی نماز نیز عید بقرعید کے علاوہ کبھی گاؤں والوں نے مسجد جاتے نہیں دیکھا تھا۔ مگر اس سے انھیں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ گاؤں کی تاریخ میں ہمیشہ ایسے بوڑھے موجود رہتے ہیں۔ گاؤں میں کچھ ایسے بوڑھے تھے جن کی بینائی جا چکی تھی مگر جنھیں ایک جگہ بیٹھے رہنے سے خدا واسطے کا بیر تھا اور وہ ٹٹولتے ہوئے ہمیشہ غلط جگہ پہنچ جایا کرتے جہاں سے انھیں واپس لانے میں اچھا خاصہ وقت لگ جاتا اور ایسے بوڑھے بھی تھے جو اونچا سننے لگے تھے مگر وہ لوگوں سے دنیا جہان کی خبریں سننے کے لئے بے تاب نظر آتے اور ایسے بھی کئی بوڑھے تھے جو اپنا کھایا ہوا کھانا ہضم نہ کر پانے کے سبب پریشان پھرا کرتے اور ہمیشہ تالاب کے کنارے کی ملائم مٹی کو اپنی لاٹھی کی نوک سے ٹٹولتے نظر آتے اور جو صحت مند تھے ان سے کسی طرح کی امید فضول تھی۔ کل ملا کر دیکھا جائے تو سارے بوڑھے ایک جیسے تھے جیسے اپنی قبر کا راستہ بھول گئے ہوں۔

اگلے سو برس تک یہ دنیا بدلنے والی نہیں، پیش امام کچے راستے کے کنارے کھڑا گاؤں کی واحد چائے کی دکان کے بارے میں سوچ رہا تھا جہاں اس کا ادھار چلتا تھا۔ میں دیکھ رہا ہوں اس آسمان میں اب تارے بھی نہیں ٹوٹتے اور دور تک کتنی کانٹے دار جھاڑیوں اور اونٹ کٹاروں سے ڈھکی زمینیں ہیں، اور یہ لاغر پیڑ اتنی بنجر مٹی پر پانی کے بغیر کیسے زندہ رہ لیتے ہیں۔ یہ زمین تو خاص طور پر فاقہ کشوں کے لئے بنائی گئی ہے۔

دراصل اس میں قصور اس کا نہ تھا۔ ہم جس طرح کی زندگی گذارتے ہیں دنیا ہمیں ویسی ہی نظر آتی ہے۔ (راوی)

دراصل پانی کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پودوں کو اگنے یا انسانوں کو مرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ (بوڑھا)

دراصل یہ بکریاں بڑی سخت جان ہوتی ہیں۔ جب پتوں کا موسم نہیں ہوتا تب بھی یہ نہیں مرتیں، بس دم ہلاتی رہتی ہیں۔ (بچہ)

اور پھر ایک دن ایسا ہوا کہ پیش امام نے گاؤں والوں کو ایک جگہ جمع کر کے حکم صادر فرمایا کہ اسے بھر پیٹ کھانا کھلایا جائے اور اسے ایک گائے کی ضرورت ہے جو اس کے لئے دودھ دے سکے اور چند بطخ تا کہ تالاب کے جس پانی سے وہ ٹماٹر اگاتا ہے وہ اس میں تیر سکیں اور خدا نے یہ حکم صادر فرمایا ہے کہ جس قوم کے عالم فاقہ کرتے ہیں اس قوم کا علم مر جاتا ہے۔ گاؤں والے پیش امام کو پسند کرتے تھے۔ انھوں نے سوچا اس کے لئے کچھ کرنا چاہئے۔ مگر دن گذرتے رہے اور پیش امام خود اپنی مانگوں کو بھول گیا۔ لیکن ایک دن چھپر پر بیٹھے کووں نے دیکھا اس کے پاس تین بطخ تھے۔ اس کے ایک ماہ کے بعد وہ ڈھال پر ایک مریل گائے کی گردن پر رسی ڈالے آتا نظر آیا۔ لوگوں پر یہ بھی کھلا کہ گاؤں کے چھپروں پر سائے کھسر پھسر کرنے لگے ہیں اور ٹن کی چھتوں پر دھما کہ چوکڑی ہونے لگی ہے۔ انھوں نے پیش امام سے اس کا ذکر کیا تو اس نے ان کی باتوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں دکھائی۔ اس نے صرف اتنا کہا ''یہ ڈر ثابت کرتا ہے کہ خدا کی ذات میں تم لوگوں کا یقین پختہ ہے۔'' اس سال جاڑے کے آخر میں پیش امام نے کئی کافی بڑی جسامت کے ٹماٹر اگائے۔ ''سائنس!'' پیش امام ہنسا۔ لوگوں نے جب اس کی بطخوں کو انڈا دیتے دیکھا تو انڈوں کی جسامت دیکھ کر ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ''سائنس!'' پیش امام پھر ہنسا۔ اپنی گائے کے لئے پیش امام نے ایک چرواہے کو رشوت دی۔ جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ گائے کو زبردست حمل آیا اور وہ دو بچھڑوں کی ماں بن گئی۔ اب پیش امام کے پاس ضرورت سے زیادہ دودھ تھا جس کا بڑا حصہ وہ بیچ دیا کرتا۔ وہ جب اپنا جھاگ سے بھرا ہوا گلاس ہونٹوں سے لگاتا تو آنکھوں کو نچا کر کہتا: ''سائنس!'' لیکن بہت جلد اسے پتہ چل گیا کہ ان تمام چیزوں کے باوجود وہ ویسا ہی تھا، فاقہ کش، مفلس اور ایک بے حس زمین پر زندہ جو چاروں طرف سے بنجر ڈھلانوں سے گھری ہوئی تھی۔ تو اس نے سوچا اسے کاروبار کرنا چاہئے۔ اس نے کچھ رقم ادھار لی اور کپڑوں کا بیوپار شروع کر دیا۔ وہ دن کے وقت گٹھر پیٹھ پر لاد کر ہفتہ وار ہاٹ یا گاؤں دیہات کے میلوں کی طرف نکل جاتا اور ظہر کی نماز سے قبل لوٹ آتا۔ کسی کسی دن صبح سویرے وہ ریلوے اسٹیشن کی راہ لیتا، یا بس میں بیٹھ کر دور دراز کے قصبوں کا رخ کرتا۔ ایک بار وہ واپس لوٹا تو اس کے ساتھ ایک بائسکوپ

والا تھا۔ اس کے بال لانبے تھے جسے اس نے چوٹی کی شکل میں باندھ کر پشت پر لٹکا رکھی تھی اور بات کرتے وقت اس کی کنٹھ کی ہڈی ہمیشہ گرتی رہتی۔ ''یہ چودھری گر نارائن ہے۔'' امام صاحب نے کہا۔ ''اس نے اسلام قبول کرلیا ہے اور اب اس کا نام شیخ سلامت علی ہے۔''

شیخ سلامت علی کو اپنے ماضی کے بارے میں بات کرنا پسند نہ تھا جسے وہ دورِ جہالت سے تعبیر کرتا۔ اس کا بائسکوپ جسے وہ اپنی لکڑی کی قینچی نما اسٹینڈ پر رکھ کر اس کے سامنے کھڑا اپنی لمبی چوٹی سے کھیلتے ہوئے جس میں اس کی منحنی کنگھی گھپی ہوتی پان کی جگالی کیا کرتا۔ بائسکوپ کی دیوار پر جگہ جگہ فلمی ہیرو ہیروئن کی تصویریں حال ہی میں اکھاڑ کر ان کی جگہ مکہ مدینہ کی تصویریں چپکا دی گئی تھیں۔ اس کے سیر بین سوراخوں کے گرد قدیم زمانے کے بے شمار سکے کیل سے جڑے ہوئے تھے جن میں زیادہ تر اب رائج نہ تھے جو اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ یہ بائسکوپ کئی پشتوں سے اس کے ساتھ تھا۔ بائسکوپ ہر طرح کے پھندنوں اور لڑیوں سے ڈھکا ہوا تھا اور جب وہ اندر کے مناظر بدلنے کے لئے اس کی دونوں چرخیوں میں سے کسی ایک کو گھماتا تو گھنٹی بجاتے ہوئے یہ بھی بتاتا جاتا کہ اندر کون سا منظر چل رہا ہے۔ دادا کے ساتھ کھڑے بچے کو بڑی حیرت ہوتی کہ کس طرح وہ بنا دیکھے اندر کی ساری باتیں بتا دیا کرتا تھا۔ بوڑھا اپنی دائمی ہنسی ہنستا۔ ''یہ بائسکوپ والا پچھلے سو سال سے آرہا ہے۔ یہ ہر بار وہی بائسکوپ والا ہے۔''

''اگر بڑھو کو اتنا پتہ ہے تو وہ اس گاؤں میں کیا کر رہا ہے؟'' پیش امام کو اس کی بات پسند نہ آتی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس بات کے مقابلے کہ اس نے ایک کافر کو ایمان کا راستہ دکھایا تھا اس کی اہمیت زیادہ ہوگئی تھی کہ وہ ایک بائسکوپ والا تھا۔ جمعہ کے خطبے میں اس نے خاص طور پر شیخ سلامت علی کا ذکر کیا۔ ''جب کوئی اندھیرے سے اچانک اجالے میں آتا ہے تو اس کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں۔'' پیش امام نے کہا۔ ''شیخ سلامت علی کے سلسلے میں ہمیں اس بات کو دھیان میں رکھنا چاہئے۔ سلامت علی تم کیا محسوس کر رہے ہو؟''

''حضور امام صاحب، اللہ پاک اور رسول پاک اور لا الٰہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ۔''

''مرحبا! مرحبا!'' نمازیوں نے بیک وقت آواز بلند کی اور چھپر پر بیٹھے ایک کوے نے ایک کھپریل کو اپنے پنجے سے ہٹا کر نیچے دیکھا تو اسے مسجد میں اور دنوں کے مقابلے زیادہ نمازی نظر آئے۔ کھپریل کے ہٹنے سے دھوپ کا جو نیزہ اندر داخل ہوا تھا اس سے بیزار ہو کر ہشت پا

مکڑی نے جالا بنتے بنتے کوے کی طرف ناخوشگواری سے دیکھا اور اس پر تھوکنے کی کوشش کی جو تار بن کر ہوا میں لٹک گئی۔

''دراصل...'' پیش امام نے تائید میں سر ہلایا۔ ''یہ دنیا سرائے فانی ہے۔ روزِ حشر ہر کسی کو اس کے اعمال کے ساتھ تولا جائے گا۔ اور وہ جنھوں نے نماز قائم کی اور قبلہ درست کیا وہ بخیرو خوبی پُل صراط سے گذر جائیں گے۔ مگر جنھوں نے خدا کے خوف کو بالائے طاق رکھ کر دنیا کی پیروی کی وہ پل صراط سے دونیم ہو کر دوزخ کی زمین پر جا گریں گے جہاں انھیں گندھک کا لباس اور کھجلی کا دوپٹہ پہنایا جائے گا اور ان کے مال و اسباب ان کے ایندھن ہوں گے۔ حضرات درود شریف پڑھئے اور شیخ سلامت علی سے معانقہ کیجئے۔''

شیخ سلامت علی ایک ہفتہ گاؤں میں رہا۔ اس نے بچوں کو بائسکوپ کے بارے میں بتایا تو پہلی بار لاشعوری طور پر اپنے ماضی کا ذکر چھیڑ بیٹھا۔ ''یہ بائسکوپ پہلی بار لاٹ بہادر نے ولایت سے منگوایا تھا۔ ان دنوں لاٹ بہادر کا دماغ کب کس طرف چل پڑتا کسی کو پتہ نہ تھا۔ اسے میرے دادا چلاتے تھے۔ ایک بار انھوں نے اپنے اونٹ کو کم چارہ کھلایا جس سے اونٹ کو سخت غصہ آ گیا۔ دوسری صبح وہ اسے باہر نکال رہے تھے کہ اونٹ نے ان کے سر کو اپنے جبڑوں میں لے کر توڑ ڈالا۔ اونٹ بڑا ہی خنس جانور ہے۔ جب تک سب کچھ ٹھیک ہے تو ٹھیک ہے، مگر بھگوان نہ کرے کہ اسے طیش آ جائے۔ میری دادی اب بھی زندہ ہے مگر اب اس کے منہ میں صرف ایک دانت بچا ہے اور اسے کچھ بھی یاد نہیں رہتا یہاں تک کہ وہ یہ بھی بھول جاتی ہے کہ اسے پاخانہ جانا ہے۔ لمبی زندگی بھی ایک بڑی مصیبت ہے۔ اوپر والا کسی کو لمبی زندگی نہ دے۔ اب یہ بکس میری تحویل میں ہے۔ وہ بڑا بدنصیب ہوتا ہے جو اسے وراثت میں پاتا ہے۔ اسے چلانا آسان کام نہیں۔ اس کے ساتھ ہی تمہیں دنیا میں پیدا ہونا پڑا ہے۔''

شیخ سلامت علی کے ایمان لانے کے واقعے نے امام صاحب کی شہرت چاردانگ پھیلا دی اور بہت جلد اسے شہر کی ایک مسجد میں باقاعدہ ماہانہ تنخواہ کے ساتھ پیش امامی کی نوکری مل گئی۔ وہاں نہ صرف مسجد میں اذان کے لئے الگ سے ایک موذن مقرر تھا بلکہ امام صاحب کو رہنے کے لئے ایک حجرہ بھی پیش کیا گیا جہاں وہ ذاتی آمدنی کے لئے اپنا مدرسہ چلا سکتا تھا۔ کچھ دنوں تک گاؤں کی مسجد میں گاؤں کا ہی ایک آدمی نماز پڑھاتا رہا۔ مگر اسے صحیح زبان نہیں آتی تھی

اور علم تجوید سے نابلد ہونے کے سبب وہ حروف کی ادائگی صحیح مخرج کے ساتھ کرنہیں پاتا تھا۔ اس کی یادداشت بھی کمزور تھی۔ اکثر وہ نماز کے دوران سورئی سے بھٹک جاتا تو نمازیوں میں سے کسی کے اندر صلاحیت نہ تھی کہ اس کی تصیح کرتا اور جب وہ پڑھتے پڑھتے رک جاتا تو ایسا کوئی نہ تھا جو اسے لقمہ دیتا۔ نتیجہ: وہ لوگ دیر تک کھڑے کے کھڑے رہ جاتے۔ نمازی خوف سے کانپا کرتے کہ کہیں محض اس لئے وہ جہنم نہ پہنچ جائیں کہ انھوں نے نماز کی ادائگی کے لئے ایک غلط امام کا انتخاب کیا تھا۔ پھر ایک دن ایک دبلا پتلا لاغر سا غیر مرئی لڑکا جس کی ایڑیاں پھٹی ہوئی تھیں، جلد سرمے کے رنگ کی تھی اور چہرے پر ایک بڑی ہی بے کس داڑھی اگی ہوئی تھی دھول کی چادر سے نمودار ہوا۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، چہرے کی ہڈیاں کھال کو توڑ کر نکل آنے کے لئے بے چین تھیں اور جسم کے مقابلے سر کافی بڑا تھا۔

''میں نے سنا ہے یہاں پیش امام کی جگہ خالی ہے۔'' اس نے سر سے ٹوپی اتار کر اپنے چہرے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ایک گلاس پانی مل سکتا ہے؟''

//////

ایسا اس گاؤں میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ مگر بوڑھے نے کہا، جو کبھی نہیں ہوتا اس کے ہونے کا امکان سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ دراصل کسی حد تک اس بات کا تعلق نئے امام سے تھا۔ اسے اس گاؤں سے بہت زیادہ امیدیں نہیں تھیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ اسے کوئی امید ہی نہ تھی۔ اور پھر اس نے ایک بڑی غلطی کا ارتکاب کیا تھا۔ پچھلی جگہ جہاں اس نے تھوڑے دن گذارے تھے اپنی شہوانی خواہش سے مجبور ہو کر ایک یتیم لڑکی سے شادی کر لی تھی جسے وہ دوسرے ہی ہفتے پرانی جگہ سے لے آیا تھا۔ اکثر جمعہ کے خطبہ سے قبل وہ گاؤں والوں کے سامنے اپنی مانگیں پیش کرتا۔ گاؤں والے اپنی طرف سے کوشش بھی کرتے مگر ہر بار وہی ڈھاک کے تین پات۔ برسوں سے اس گاؤں کی یہی روایت رہی تھی۔ تو آخر میں تنگ آ کر نوجوان پیش امام نے ہتھیار ڈال کر گاؤں والوں کو بد دعا دینا شروع کر دیا۔

''ایسے گاؤں پر اولے برستے ہیں جہاں کا امام خالی پیٹ تارے گنتا ہے۔'' اس نے یہ جملہ جب جمعہ کی نماز پر خطبہ کی تقریر میں شامل کیا تو مصلیوں نے بیک زبان سر ہلا کر کہا: سبحان اللہ!

مگر اس ہفتے ایک دوپہر شدید گرمی اور حبس کے ساتھ آسمان اچانک سیاہ ہو گیا، زور کی

بجلی کڑکی اور تیز بارش کے ساتھ اتنی شدید اولا باری ہوئی کہ کھیتوں کی زیادہ تر سبزیاں تباہ ہو گئیں۔ ''یہ ایک اتفاق ہے۔ کوئی اس کے لئے پیش امام کو ملزم نہ ٹھہرائے۔'' بوڑھے نے بچے سے کہا۔ شاید اس بات سے گاؤں کے ہر شخص کو اتفاق تھا۔ کچھ لوگوں نے اپنے طور پر پیش امام کی مدد کرنے کی ٹھانی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اس کی عورت ٹھنڈے چولھے کے سامنے لمبا گھونگھٹ نکالے ہمیشہ بیٹھی رہتی ہے۔ گاؤں کے کسی شخص نے اس کی آواز نہیں سنی تھی۔ تالاب میں پتھر پر کپڑا دھوتے وقت بھی وہ لمبا گھونگھٹ نکالے رہتی۔ پیش امام کے لئے کوئی الگ گھر نہ تھا۔ کچھ برس قبل گاؤں والوں نے مسجد سے ملحق ایک حجرہ بنانے کی کوشش کی تھی مگر اپنی تمام کوششوں کے باوجود وہ صرف اینٹ اور گارے کے چار ستون ہی کھڑا کر پائے تھے جن میں سے ایک ڈھ بھی چکا تھا۔ پیش امام نے اس کے کچے فرش پر مٹی اور گوبر کا لیپ چڑھا کر اور چوتھے ستون کی جگہ لکڑی کا ایک طوالہ استادہ کر کے سر پر ایک ترپال ٹانگ لیا اور کسی طرح اپنی بیوی کے لئے ایک پناہ گاہ بنا لی۔ اسے یقین تھا برسات آنے تک گاؤں والے ان کے سر پر ایک چھپر کا انتظام کر دیں گے۔ پردا کے لئے اس نے پرانے ٹاٹ اور گاؤں سے اکٹھی کی ہوئی چادریں اور ساریاں جن کے رنگ برسوں تک دھلنے کے سبب بالکل دھندلے ہو چکے تھے لٹکا رکھی تھیں۔ یہ دیوار کا کام کرتی تو تھیں مگر ہوا میں ہمیشہ اپنے کمزور ٹانکوں سے نکلنے کی جدوجہد میں مصروف نظر آتیں۔ گاؤں والوں نے اس حجرے کی تعمیر کے لئے چندے کی رسید چھپوا کر دور دراز کے علاقوں میں بھیجا جہاں فرزندانِ توحید کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی اور گاؤں کے لوگ کام کی تلاش میں اکثر جایا کرتے۔ مگر ساٹھ فیصد کمیشن اور آمد و رفت نیز کھانے پینے کے اخراجات کے بعد خدا کے گھر کے لئے پیسہ برائے نام بچتا۔ دوسری طرف زیادہ تر لوگ رسید کے پیسے یا تو کھا جاتے یا سرے سے کتاب کے گم ہو جانے کا بہانہ تراش کر دست بردار ہو جاتے۔ نتیجۃً مہینے نکلتے گئے مگر اتنی رقم اکٹھی نہ ہو پائی کہ کسی طرح کا کام شروع ہو پاتا۔ گاؤں والوں نے صرف اتنا کیا تھا کہ عارضی طور پر پھوس کے ایک چھپر کا انتظام کر دیا جس پر چھوٹی چھوٹی چڑیاں پھدکتی رہتیں اور گرگٹ اپنے سر اٹھائے نیلے آسمان کی طرف تاکتے رہتے۔ کل ملا کر نیا امام ابھی تک اپنی بیوی کے لئے اتنا ہی کر پایا تھا جس کا اسے بہت ملال تھا۔ اس کا اظہار وہ لاشعوری طور پر اپنے جمعہ کے خطبے پر کیا کرتا۔ اولا باری کے واقعے کے دو ماہ بعد گاؤں والوں کو محسوس ہوا کہ اس کی روز کی بول چال میں

کفر کی بو شامل ہونے لگی ہے۔ جب ایک دن اس نے ان علمائے دین کا پھر سے ذکر کیا جن کی بیویاں حمل کے دوران پیمبری کے دن گذارتی ہیں۔ ''بھوک...'' اس نے اپنی تقریر میں کہا۔ ''...شیطان کا سب سے مہلک ہتھیار ہے۔ انسان کبھی اسے استعمال نہ کرے ورنہ بچے ٹیڑھے میڑھے پیدا ہوں گے۔'' گاؤں والوں نے اس بات کا کوئی نوٹس نہ لیا ہوتا اگر اگلے چار مہینے کے اندر گاؤں میں جو تین زچگیاں ہوئیں وہ سارے بچے پولیو زدہ نہ نکلتے۔

ہمیں اس کالی زبان والے پیش امام کے لئے کچھ کرنا چاہئے، گاؤں والوں نے آپس میں صلح و مشورہ کیا اور چاول اور سبزیاں اکٹھی کر کے مسجد کے صحن پر لے آئے۔ لیکن اب شاید پیش امام کو ضد آ چکی تھی کیونکہ ہر ہفتے وہ کوئی نہ کوئی چبھتا ہوا سوال لوگوں کے سامنے ڈال دیتا۔ ''طوفانِ نوح لوگوں کے گناہوں کا نتیجہ تھا۔ کیا خدا اب آسمان میں چپ بیٹھا رہے گا؟'' تو لوگوں نے بھاری بارش کی امید کی جو سب کچھ تباہ و برباد کر ڈالنے والی تھی۔ یوں بھی برسات کا موسم آ چلا تھا۔ مگر اس برسات چند چھٹ پٹ بارش کے علاوہ مہینے گذرتے چلے گئے اور بڑا سوکھا پڑا۔ تو پیش امام نے کہا، اگر اسے الٹ کر دیکھا جائے تو یہ ایک طرح کا طوفانِ نوح ہی تھا جو سوکھے کی شکل میں نمودار ہوا تھا۔ اب پیش امام میلا کچیلا رہنے لگا تھا۔ وہ گاؤں میں جب بھی نظر آتا مسکراتا رہتا جیسے اس کے سارے مسائل حل ہو چکے ہوں۔ ''بھئین لوگ خوب کھا پی رہے ہو۔ کھا پی لو۔ بس خدا کے پاس دیر ہے اندھیر نہیں۔'' کبھی وہ گاؤں کی واحد چائے کی دکان پر بیٹھ جاتا جہاں سورج نکلنے سے پہلے دہقان کھیتوں کا کام نپٹانے کے بعد جمع ہوتے۔ ''کھیتوں میں چوہوں کی بلوں کے اندر ہم عالموں کے مقابلے زیادہ اناج ہوتے ہیں۔'' ایک بار اس نے ایک کنویں کو بد دعا دی اور دیکھتے دیکھتے وہ کنواں سوکھ گیا۔ دوسری بار اس نے گاؤں پر ایک نحوست کے نازل ہونے کی بات کہی جس کے دوسرے ہی دن ایک پولس والا نمودار ہو گیا۔ وہ جس پیڑ پر تھوکتا اس کے پتے گرنے لگتے۔ وہ جس مرغی کی طرف دیکھ لیتا وہ کڑک ہو جاتی۔ اب تو ایسا لگنے لگا تھا جیسے اسے اپنی غیبی قوت کا اندازہ ہو چلا تھا کیونکہ نہ صرف وہ کر و فر سے چلنے کا عادی ہو گیا تھا بلکہ اب وہ کھلے عام یا اشارے سے لوگوں کی موت کی پیشن گوئی کرنے لگا تھا جیسے اس کے لئے اسے پیسے ملے ہوں۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ گاؤں کے لوگوں کو موت کی شرح میں اضافہ نظر آنے لگا، یہ الگ بات تھی کہ وہ جن از کار رفتہ بوڑھوں کا ذکر کرتا ان کے گھر والے کافی عرصے سے ان کی موت کا انتظار

کرتے کرتے تھک چکے تھے اور انھوں نے مر کر نہ صرف خود کو ایک لمبی تکلیف دہ زندگی سے نجات دلائی تھی بلکہ اپنے گھر والوں کو بھی راحت بخشی تھی۔ اس نے اپنی بددعا سے کئی تالاب خشک کیے، امرود کے درختوں پر بان مارے، جنوں کو بلانے کے لئے رات رات بھر چلاّ کسا اور جب اس کی بیوی کے مردہ بچہ پیدا ہوا تو وہ نرا پاگل ہو گیا۔ بچوں نے اطلاع دی کہ وہ مسجد میں غیر وقت میں غلط سمت کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگا ہے۔ اور جب گاؤں والوں نے اسے پیش امامی کے عہدے سے برطرف کرنے کا فیصلہ کیا تو اس نے سال بھر کی تنخواہ مانگی اور ہرجانے کا دعویٰ دائر کر دیا۔ اس نے کہا وہ اپنا حق لئے بغیر ٹلنے والا نہیں۔ اس نے اپنے نوزائیدے کو قبرستان لے جانے کی بجائے تالاب کے کنارے ہی دفن کیا تھا جہاں کی مٹی سارا سال گیلی رہتی جس پر اگائے گئے بجنا کے پیڑوں سے لاروے ٹپکتے رہتے جو تتلی بننے سے پہلے ہی کووں کی خوراک بن جاتے۔ وہ اس قبر کے سامنے دن دن بھر بیٹھا رہتا، سستی اگربتیاں جلاتا اور ہات ہلا ہلا کر انھیں جلائے رکھتا یہاں تک کہ وہ منحنی سی قبر ایک خار پشت میں بدل گئی۔ آخر کار گاؤں والوں نے مسجد سے کترانا شروع کر دیا۔ وہ لوگ اس سے خوفزدہ تھے اور اس کی منحوس نظر کے سامنے آنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر ادھر کچھ دنوں سے لوگ دیکھ رہے تھے کہ پیش امام چپ رہنے لگا تھا۔ وہ اپنا کھانا خود پکاتا، خود اپنے کپڑے دھوتا، ہینڈ پمپ سے پانی لاتا۔ جلد ہی اس کا راز کھل گیا۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ اس کی بیوی دکھائی دینا بند ہو گئی تھی۔ کچھ لوگوں نے ٹاٹ کے پردے کے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ انھوں نے دیکھا نہ صرف پیش امام کا چولھا ٹھنڈا پڑا تھا بلکہ انھیں اس کی بیوی کہیں نظر نہ آئی۔ شاید وہ اسے چھوڑ کر بھاگ گئی تھی یا پیش امام اسے پچھلی جگہ چھوڑ آیا تھا۔ پیش امام مسجد کے اونچے صحن پر بیٹھا خندہ انگیزی کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ متواتر فاقوں کے سبب اس کی آنکھوں میں سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ مگر وہ لوگوں کے اس بے جا تجسس سے قطعی پریشان نظر نہیں آیا۔ ''اس کے پاس چارا بھی کیا تھا۔'' اس نے مسکرا کر اپنی ناقص داڑھی کے بال توڑتے ہوئے کہا جو ایسا لگ رہا تھا جیسے کھال کے بجائے سیدھے ہڈیوں سے نکل آئے ہوں۔ ''اب مجھے نہیں معلوم میں اسے کہاں ڈھونڈوں گا۔ مگر واہ ری عورت۔ صبرِ ایوب کی زندہ مثال تھی وہ۔ اور بھوک برداشت کرنے کی اتنی طاقت تو میں نے اور کسی کے اندر نہیں دیکھی۔''

بچے کی موت اور بیوی کے بھاگ جانے کے بعد پیش امام کے اندر اچانک ایک تبدیلی

آ گئی۔اس نے بد دعا دینا بند کر دیا اور نماز بھی درست کر لی۔ایک دن مسجد کے چھپر پر چڑھ کر اس نے اس کی مرمت کی، اندر چھت گیری کے کنڈوں اور بانس کی پھچیوں کو صاف کیا جو نہ صرف گھن کھائے ہوئے تھے بلکہ دنیا جہان کے حشرات الارض کے ٹھکانے تھے۔اس نے کنڈوں سے مکڑیوں کے جالے صاف کئے جن سے تنکے، مکڑیوں کے انڈے اور بے جان کیڑے مکوڑے بھاری تعداد میں لٹک رہے تھے، دیواروں پر آویزاں طغروں کو جن میں کمخواب پر منبت کاری کے ذریعے قرانی آیات لکھی ہوئی تھیں نیچے اتار کران کے شیشے چمکائے، طاقچوں سے گرد جھاڑی، جزدان سے قران پاک کے نسخوں کو نکال کر دھوپ دکھائی اور تسبیح کے دانوں کو لکڑی کے گملے میں ڈال کر میل کاٹنے والے پوڈر سے دھویا۔اس کے اگلے ہفتے تالاب سے مٹی لا کر مسجد کا برامدہ درست کیا جس میں پچھلی برسات چھپر سے پانی متواتر گرتے رہنے کے سبب ایک بڑا سا شگاف بن گیا تھا، فرش کی دڑاروں کو جو کنکھجوروں کے دائمی ٹھکانے بن گئی تھیں مٹی کا لیپ چڑھا کر بند کیا۔اس نے گاؤں کے لوہار سے کیلیں مانگ کر دروازے کے ساتھ ساتھ میت کی چارپائی کی مرمت کی جو لوگوں کے کندھوں پر خطرناک ڈھنگ سے ہلنے لگی تھی، جائے نماز کے پھٹے ہوئے حصوں کی پیوندکاری کی۔وہ دن کے وقت یہ سب کچھ کرتا مگر رات رات بھر مسجد کے برامدے پر بیٹھا دور تک ڈھلانوں کی طرف تاکا کرتا جن پر کھڑے مڑے تڑے نیم جان درختوں کے اوپر تاروں سے ڈھکا آسمان کسی مچھیرے کے جال کی طرح مغرب کی طرف سرکتا جاتا۔ان ستاروں کی طرف تاکتے ہوئے اسے ایسا لگتا جیسے آسمانی مچھیرا ایک جگہ کھڑا اس جال کو اپنی طرف سمیٹ رہا ہو جس میں یہ تارے مچھلیوں کی طرح پھنس کر چاروناچار گھسٹتے جا رہے ہوں۔اس نے لوگوں کے گھروں میں جانا بند کر دیا تھا۔وہ کھانے کی کوئی بھی دعوت قبول نہ کرتا۔''جب دانت تھے تب چنے نہ تھے۔جب چنے ملے تو دانت نہیں۔'' وہ ہنس کر کہتا اور اپنے بچے کی قبر کی طرف اشارا کرتا۔''اسے کہتے ہیں عقلمندی جب بندہ پیدا ہونے سے انکار کر دے اور اپنے آپ کو دنیا کی آلودگی سے بچالے۔'' وہ کہتا۔''برے انسان کو کپڑے اچھا بنا دیتے ہیں جس طرح ہمارے برے اعمال کو دولت ڈھانپ لیتی ہے۔'' ''جب اتنا کچھ ہوا تو باقی بھی ہو جائے گا۔'' ''ایک مسجد میں لاکھوں گنہ گار سما سکتے ہیں مگر ایک اچھے انسان کے لئے سو مسجدیں بھی کافی نہیں ہوتیں۔'' ''جو پیسہ عرب سے آئے صرف وہ پاک ہے، باقی سب جہنم کی آلودگی ہے۔'' ''ایک وہ وقت بھی آئے گا

اور ڈرو اس وقت سے جب حرام اور حلال کا فرق مٹ جائے گا، پیسوں کی بہتات ہوگی اور ہر طرف حاجی ہی حاجی دکھائی دیں گے، الو ویرانوں سے انسانی بستیوں پر اتر آئیں گے، بچے کھوٹے پیدا ہوں گے اور عورتوں کی جسمانی بھوک کبھی نہیں مٹے گی لیکن بچے پیدا ہونے سے انکار کر دیں گے۔''

پھر ایک دن گاؤں میں اچانک شور مچ گیا۔ ''پیش امام پاگل ہوگیا ہے، پیش امام پاگل ہوگیا ہے۔'' لوگ باگ کام کاج چھوڑ کر مسجد کی طرف بھاگ رہے تھے جس کے سامنے پیش امام مادرزاد برہنہ کھڑا مسجد کے چھپر کی طرف تاک رہا تھا جسے اس نے آگ لگا دی تھی۔ وہ زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا اور اپنی داڑھی نوچ رہا تھا۔ اس پر اتنی شدید وحشت طاری تھی کہ وہاں پر جمع لوگ مسجد کے قریب جانے کی جرائت جٹا نہیں پا رہے تھے۔ پھر بھی کچھ لوگوں نے ہمت یکجا کر کے اپنے طور پر تالاب سے ڈول میں پانی بھر بھر کر آگ بجھانے کی کوشش کی، مگر پیش امام کے خوف سے وہ مسجد کے قریب جانے سے گریز کر رہے تھے۔ وہ دور ہی کھڑے ڈول سے پانی پھینکتے رہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مسجد کا چھپر جلتا رہا اور پیش امام قہقہے لگاتا رہا۔ کھپریل کا چھپر جل کر مسجد کی دیواروں کے بیچ زمیں بوس ہو چکا تھا جس سے اڑتی چنگاریوں سے نہ صرف پیش امام کی رہائش گاہ کے چھپر نے آگ پکڑ لی تھی بلکہ ڈوبتے سورج کے سبب سرخ آسمان تک اس طرح نظر آ رہا تھا جیسے اس نے بھی آگ پکڑ لی ہو جب پیش امام اسی برہنہ حالت میں جنگل کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ سارا گاؤں اس کے تعاقب میں تھا۔ حال کی ایک موسلا دھار بارش کے سبب پیڑ پودے چمک اٹھے تھے اور چٹانیں دھل کر صاف ہوگئی تھیں۔ چھوٹے موٹے جانور اور کیڑے مکوڑے اس اچانک کے شور سے گھبرا کر افراتفری میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ گاؤں والے پیش امام کا تعاقب کرتے ہوئے کوڑھیوں کے نالے تک پہنچ گئے جہاں چٹانوں کے درمیان تیز پانی بہہ رہا تھا۔ پیش امام اس آخری چٹان پر رک گیا جو نالے کے اوپر نکلی ہوئی تھی۔ اس سے بس ایک قدم کی دوری پر وہ ساٹھ فیٹ گہری کھائی تھی جس کے اندر چٹانوں کے بیچ نالا شور مچاتے ہوئے بہہ رہا تھا۔ اپنی پشت نالے کی طرف پھیر کر وہ گاؤں کے لوگوں کی طرف رخ کر کے کھڑا تھا اور اپنی سرخ آنکھوں سے ان کی طرف تاک رہا تھا جیسے اسے اس کھیل میں مزا آ رہا ہو۔ لوگ ایک محفوظ فاصلے پر سانس روکے کھڑے تھے اور اس کے اگلے قدم کا انتظار کر رہے تھے کہ پیش امام کی داڑھی کا رخ آسمان کی طرف ہوگیا، اس نے اپنے دونوں ہات اوپر اٹھا کر جیسے

خدا سے مخاطب ہو، ایک وحشیانہ قہقہہ بلند کیا اور مڑ کر نیچے کھائی میں چھلانگ لگا دی۔ وہ اس طرح اڑتا ہوا نیچے گیا تھا جیسے کوئی چڑیا ہو جس کے بال و پر نوچ لئے گئے ہوں۔

گاؤں والے جب چٹان پر اس جگہ پہنچے جہاں سے پیش امام نے چھلانگ لگائی تھی تو انھوں نے دیکھا نیچے نالے میں پیش امام کا جسم ایک چٹان پر پڑا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ کر غلط سمت میں مڑ گئی تھی، داہنا ہات جسم کے نیچے دبا ہوا تھا اور کھوپڑی کے چور ہو جانے سے بھیجا باہر آ گیا تھا۔ آس پاس کے درختوں کے پرندے آسمان میں شور مچاتے ہوئے اڑ رہے تھے اور کوڑھی اپنے اپنے جھونپڑے سے نکل کر پیش امام کے بے جان جسم کے گرد جمع ہو رہے تھے۔

//////

ابھی ابھی ایک مال گاڑی پل کو دہلاتے ہوئے گذری تھی جس کا دھواں تیزی سے ہوا میں منتشر ہو رہا تھا۔

دھوپ کی غیر موجودگی میں پل کے نیچے کا پانی بالکل سیاہ نظر آ رہا تھا۔ پانی سے نظر ہٹا کر بوڑھے نے بچے کی طرف دیکھا جو پل کی ایک محراب سے باہر آ رہا تھا۔

''تم پلیا کے نیچے کیا کر رہے ہو؟ یہاں آؤ، میں نے بہت دیر سے تمہارے ساتھ کوئی بات نہیں کی ہے۔''

بچہ طوعاً کرہاً اپنے دادا کے پاس لوٹ آیا۔ اسے دادا کی نظروں میں رہتے ہوئے کھیلنا پسند تھا مگر اب اس کے اندر اس قید سے آزادی کی چاہت جاگنے لگی تھی۔ بظاہر وہ آج بھی اپنے پرانے جنون میں جی رہا تھا مگر ان دنوں کیڑوں مکوڑوں کے علاوہ کسی اور چیز نے اس کے ذہن پر قبضہ جما رکھا تھا۔ ''اپنے ہات دکھاؤ!'' دادا نے کہا۔ وہ چھتری کے مڑے ہوئے حصے سے کمر ٹکائے دونوں کہنیوں کو ہتھیلیوں سے تھامے چادر میں لپٹے کھڑے تھے جیسے چھتری کے ہٹتے ہی زمین پر جا گریں گے۔ بچے نے پتھر پھینک کر دادا کے سامنے اپنی دونوں مٹھیاں کھول دیں۔ اس کی ہتھیلیاں برف کی طرح ٹھنڈی ہو رہی تھیں۔ ملائم جلد سے کائی کی مہک آ رہی تھی۔ دادا اس کی منحنی انگلیوں کو دبا دبا کر دیکھنے لگے۔ ''تم بھر پیٹ کھایا کرو۔ کہیں تمہارے پیٹ میں جونک تو نہیں۔ بچے، یہ عمر دبلا ہونے کے لئے نہیں ہے۔ جب میری عمر کو پہنچو گے تب یہ انگلیاں تم پر جچیں گیں۔ ابھی نہیں۔''

انھوں نے بچے کا ہات چھوڑ دیا اور بھوؤں پر ہتھیلی کا سائبان بنا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ آسمان میں ہوا تیز بہہ رہی تھی جس میں ایک واحد چیل اپنے پر پھیلائے ترچھا اڑتی چلی جا رہی تھی۔ دور تک ماحول میں سناٹا طاری تھا۔

''دادا۔'' لڑکے نے کہا۔ ''آجکل اتنی لال چیونٹیاں کیوں نظر آ رہی ہیں۔''

''کیونکہ وہ لال ہیں اور یہ رنگ جلد نظر آ جاتا ہے۔ یوں بھی یہ موسم چیونٹیوں کا ہے۔'' بوڑھے نے جواب دیا۔ اس نے ایک بار پھر آسمان پر نظر دوڑائی۔ آج اسے کسی وجہ سے آسمان پر اعتراض تھا جو سورج کی عدم موجودگی میں کسی گندے ترپال کی طرح ٹنگا ہوا تھا۔

''اور پولس مولی صاحب کی لاش اٹھا کر کیوں لے گئی؟''

''اس ملک کا یہی قانون ہے۔ ایسے معاملات میں لاش کو ہسپتال لے جانا پڑتا ہے، اس کی چیر پھاڑ کرنی پڑتی ہے۔ بڑے ہو جانے پر تمھیں اس طرح کے سوالات کی ضرورت نہ ہوگی۔'' بوڑھے کے چہرے سے یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے یہ موضوع پسند نہ تھا۔ اس نے اسے بدلنے کی کوشش کی۔ ''مجھے حیرت ہے، تمہارا چیونٹیوں کا جنون ختم ہو گیا۔ ویسے تم اب سیاہ چیونٹیوں پر غور کر سکتے ہو۔ وہ بے ضرر ہوتی ہیں۔''

''دنیا میں کوئی چیز بے ضرر نہیں ہوتی۔'' بچے نے کہا۔ ''آپ نے ہی کہا تھا ہر کوئی اپنی ضرورت کے مطابق اچھا یا برا ہوتا ہے۔''

''کیا میں نے ایسا کہا تھا؟'' بوڑھا ہنسا۔ ''پھر تو ثابت ہو گیا میں واقعی سٹھیا گیا ہوں۔''

''مگر مولی صاحب نے مسجد کو آگ کیوں لگائی؟''

''کیونکہ یہ اس کے اندر کی آگ تھی۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''اسے کبھی نہ کبھی تو باہر آنا ہی تھا۔ اور بچے، دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے ہمارے پاس خدا سے بہتر چیز اور کیا ہو سکتی ہے؟''

''لوگ کہتے ہیں اس نے اپنی بیوی کو مار ڈالا تھا۔''

''کیونکہ لوگ کچھ بھی کہنے سے باز نہیں آتے، آخر اللہ نے انھیں ایک منہ جو دے رکھا ہے۔'' بوڑھے نے پھر سے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ ''اور تم پلیا کے نیچے نہ جایا کرو۔ ایسا کیا ہے اس کمزور پل کے اندر جو تم وہاں جاتے رہتے ہو؟''

بچے کو خود پتہ نہ تھا وہ اس پل کے نیچے کیوں جایا کرتا تھا۔ شاید محرابوں سے لٹکتے

چمگادڑوں کی کشش اسے وہاں لے جاتی ہو۔ دونوں اپنی جگہ کھڑے تھے جب ہوا میں ایک تیز بھنبھناہٹ ابھرنے لگی جیسے سینکڑوں بھنورے اور تتیا ایک ساتھ گا رہی ہوں جن میں جھینگر شامل ہو گئے ہوں۔ بوڑھے نے اپنا سر ہلایا۔ ''لگ رہا ہے کوئی طوفان آنے والا ہے۔ ہمیں جلد گاؤں پہنچ جانا چاہئے۔'' اور وہ مڑ کر گاؤں کی طرف چل پڑا۔ ٹیلہ سے اترتے ہوئے وہ کسی ایسی ناؤ کی طرح ڈگمگا رہا تھا جس کے بادبان میں تیز ہوا بھر گئی ہو۔ ''اور تم کیا سوچ رہے ہو۔ جلدی کرو ورنہ ہم طوفان میں گھر جائیں گے۔'' اس نے چھتری کھول کر مڑے بغیر بچے سے کہا جو اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا پل کی طرف تاک رہا تھا۔ پل پر بارش اتر چکی تھی۔ اسے اپنی کھوپڑی پر بارش کے ایک دو بھاری بھرکم قطروں کے گرنے کا احساس ہوا اور وہ دوڑتا ہوا دادا کی چھتری کے نیچے جا گھسا۔ دادا نے اپنی چادر سے فوراً اس کے کندھوں کو ڈھک لیا۔

''احتیاط سے، احتیاط سے، پیر پھسل گئے تو کافی چوٹ آئے گی۔ یہ ایک بے رحم زمین ہے۔''

بچے نے حیرت سے دادا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دادا کی جگہ کسی اجنبی کو دیکھ رہا ہو۔

وہ آدھے راستے پر تھے جب بارش نے انھیں آلیا۔ ہوا کافی تیز ہو گئی تھی جس میں دادا کے لئے چھتری سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ مگر وہ چلتے رہے۔ ایسی کوئی جگہ نہ تھی جہاں وہ پناہ لیتے۔ بارش میں گاؤں نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اور جب کہ وہ پتھریلی زمین پر جہاں گھاس اور مٹی کے سبب پھسلن ہو رہی تھی احتیاط سے پیر رکھتے ہوئے چل رہے تھے جانے کیوں بچے کو ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ بارش اگلے سو سال تک ہوتی رہے گی۔ وہ اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا جب اچانک بارش کا زور کم پڑ گیا اور دیکھتے دیکھتے بارش رک گئی جیسے کسی نے آسمان پر ٹونٹی بند کر دی ہو۔ اب نہ صرف گاؤں دکھائی دینے لگا تھا بلکہ مغربی آسمان پر سورج بھی پوری تاب کے ساتھ نکل آیا تھا۔ سورج کی طرف حیرت سے تاکتے ہوئے جس کا نچلا حصہ سرخ ہو رہا تھا وہ گاؤں کے قریب پہنچے تو بچے کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ادھر زمین پر بارش کا کوئی نشان نہ تھا۔ اسے گاؤں کے باہر لوگوں کی اچھی خاصی بھیڑ نظر آئی۔ بچہ کو گاؤں کی طرف لپکتے دیکھ کر بوڑھے نے اسے روک لیا۔ ''ذرا صبر سے کام لو۔ دادا کے بارے میں بھی سوچو۔ گاؤں کہیں بھاگا نہیں جا رہا ہے۔''

وہ جوہڑ کے کنارے جس کا پانی تقریباً سوکھ چکا تھا کاش کے مرجھائے ہوئے سفید پھولوں کے ساتھ چل رہے تھے جب بچے کی نظر ایک سرخ نالے پر پڑی جو ڈھلان سے نکل کر جوہڑ کے کنارے سے ہوتا ہوا گاؤں کے اندر چلا گیا تھا۔ کچھ لوگ نالے کے قریب کھڑے ایک ٹک اس کی طرف تاک رہے تھے۔ بچے نے غور سے نالے کو دیکھا اور چیخ کر دادا کی کمر تھام لی۔ ''لال چیونٹیاں! دادا، یہ تو چیونٹیوں کے دل ہیں۔''

واقعی یہ چیونٹیوں کا ایک مہیب قافلہ تھا جو نالے کی شکل میں مٹی، پتھر اور خش وخاشاک کو تقریباً ڈھکتا ہوا چل رہا تھا۔ کچھ چیونٹیوں کے پر نکل آئے تھے جن کے غول قافلے کے اوپر دھویں کی شکل میں اڑ رہے تھے۔ وہ کلبلاتے ہوئے لاکھوں کی تعداد میں گاؤں کی طرف بڑھ رہے تھے، گاؤں جس کے چاروں طرف کھیتوں میں لوگ اپنے ساز وسامان اور ڈھور ڈھنگر کے ساتھ بکھرے پڑے تھے۔ پالتو جانور اور انسانوں کے درمیان مرغیاں آزادی سے کٹکٹاتے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہی تھیں جب کہ کمبل سے ڈھکے ایک تختہ پوش پر رکھے تار کے بڑے سے پنجڑے کے اندر ایک توتا اپنے پر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ مرد گاؤں کے اندر راحت کے کام میں لگے ہوئے تھے اور بچے کھچے لوگوں اور سامانوں کو نکالنے میں مصروف تھے۔ بچے کو گاؤں کے تقریباً تمام کتے ننگے کھیتوں میں بھاگتے نظر آئے۔ وہ بری طرح بھونک رہے تھے، مگر آج ان کے بھونکنے کا انداز بالکل جدا تھا جیسے مشکی باجوں میں چھید ہو گئے ہوں۔ شاید شروع میں انھوں نے بغیر سوچے سمجھے چیونٹیوں پر حملہ بول دیا تھا جس کے نتیجے میں ان کے جسموں پر چیونٹیاں چڑھ آئی تھیں۔ وہ شور مچاتے ہوئے اپنی دموں کو بھنبھوڑ رہے تھے، زمین پر لوٹ رہے تھے، سر اور مقعد کو مٹی پر رگڑ رہے تھے۔ لوگوں کی بھیڑ میں ہر طرف سے مویشیوں کے ڈکرانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ انسانوں اور جانوروں کا ملا جلا یہ شور ہی تھا جسے شاید انھوں نے دور سے بھنوروں اور تتیوں کی آواز سمجھ لیا تھا۔ اور جب کہ آسمان کے کنارے دھیرے دھیرے سورج افق پر بتدریج بڑا ہوتا جا رہا تھا بچے نے دیکھا، جوہڑ کے دوسرے کنارے سارا گاؤں، اس کی دیواریں، اس کے چھپر، برامدے اور اوسارے، اس کے چاروں طرف پھوٹتی پگ ڈنڈیاں اور ان پر کھڑی بیل گاڑیاں، طوالوں پر استادہ اناج گھر اور پیال کے گول پشتارے یہاں تک کہ تاروں سے لٹکتے کپڑے تک چیونٹیوں کے سبب سرخ ہوتے چلے جا رہے تھے۔

الزورا

اور اب وقت آ گیا ہے کہ الزورا کی کہانی لکھی جائے۔ الزورا جنہوں نے پشت در پشت اس ملک کا نمک کھایا اور اب یہ آخری الزورا میرے سامنے کھڑا ہے۔ وہ ادھیڑ عمر کا بغیر مونچھوں والا انسان جس کی آنکھیں کم پلکیں جھپکتی ہیں۔ شاید اسکے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی ہے ورنہ الزورا (وہ مقدمہ باز انسان) ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر سکتا ہے۔ اس کے پاس اس کے لئے کافی وقت ہے۔

بٹوارے کے قبل بنگالی زمین دار خاندان سے تعلق رکھنے والا علی ضرار جسے آزاد ہندوستان کے بنگالیوں نے الزورا بنانے میں زیادہ وقت نہیں لگایا تھا بہت کم عمر میں ایک بڑی عمارت کا مالک بن بیٹھا۔ جب وہ بڑا ہوا تو اس نے دیکھا کہ اس عمارت کا چپہ چپہ مہاجر پنجابیوں کو کرائے پر دے دیا گیا تھا جن میں سے زیادہ تر غریب ڈرائیور تھے یا ان کے رشتہ دار جو کوٹلا اور نور پور کے گاؤں دیہات سے یہاں آ کر بس گئے تھے اور انہیں کی طرح ٹیکسی چلایا کرتے۔ یہ ان مقدموں کی شروعات تھی جنہوں نے الزورا کو ساری عمر ایک انتہائی مصروف ترین انسان بنائے رکھا۔

اور انہیں مقدمات کے چکر میں الزورا سے میری دوستی ہو گئی تھی۔ اس کی سزا کے طور پر مجھے ہر ہفتے دو تین شامیں اس کے ساتھ شراب پینی پڑتی۔ اور کیوں نہیں، الزورا نہ صرف میرے لئے ایک اہم موکل تھا بلکہ شراب کے معاملے میں کافی دریا دل بھی تھا۔ الزورا جس نے بہت کم عمر میں اپنے پنجابی دوستوں کی صحبت میں شراب پینا سیکھ لیا تھا۔

''صرف اس کے لئے میں نے پریوار کا بکھیڑا نہیں پالا ہے۔'' الزورا نے وہسکی کے گلاس کو اوپر اٹھا کر کہا۔ ''اور مجھے پتہ ہے تمہیں اپنی بیوی سے کتنے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔''

''بہت سی بیویوں کو شراب پینے پر اعتراض نہیں ہوتا۔'' میں نے کہا۔

''اور ایسی بیویاں مجھے پسند نہیں۔'' الزورا نے کہا۔ ''میں بیویوں کے معاملے میں ہمیشہ سے ذرا دقیانوسی قسم کا انسان ہوں۔ ایسی عورتیں جو دوسرے مردوں پر گرتی رہتی ہیں، مجھے پسند نہیں، نہ ہی وہ عورتیں جو اپنے شوہر کو جام بنا کر پیش کرتی ہیں۔''

ایک دن جب عزت مآب چیف جسٹس کلکتہ کی گرمی سے گھبرا کر ٹھنڈے پہاڑوں کی طرف چلے گئے اور ہم مقدموں کے علاوہ بھی کچھ اور سوچنے کے لائق ہو گئے تھے، الزورا نے مجھ سے کہا کہ وہ میرے ساتھ دریا کی طرف جانا چاہتا ہے۔

''دریا کیوں؟'' میں نے پوچھا۔ شاید مجھے تھوڑا نشہ ہو گیا تھا۔ ''ہوگلی کا پانی ہمیشہ کی طرح گندا ہے اور دریا کے دونوں کنارے کولکاتہ اور ہوڑہ کے شہر پچھلے پچاس برس سے نہیں بدلے۔ صرف دونوں شہروں کے بیچ انسانی آبادی نے اپنی گندگی کے تبادلے کے لئے ایک عظیم الشان پل بنالیا ہے۔''

''میں نے ایک عرصے سے کسی انسانی مُردے کو دریا میں بہتے نہیں دیکھا ہے۔'' الزورا ہنسا۔ ''پچھلی بار تیل گھاٹ میں بھٹکتے بھٹکتے میں ایک انسانی بھیڑ میں شامل ہو گیا تھا جو پانی سے ابھرے ہوئے ایک انسانی مردے کو تاک رہی تھی۔ یہ مردہ ہاوڑا پل کے نیچے کسی زیر آب لوہے کے ڈھانچے سے اٹک گیا تھا اور بڑا ہی مضحکہ خیز نظر آرہا تھا۔ پانی پی پی کر وہ دیو کی طرح پھول کر کپا ہو رہا تھا اور اس کے نچلے ہونٹ کو مچھلیوں نے کتر ڈالا تھا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں اگر تم بھی اسے دیکھتے تو اپنی ہنسی نہ روک پاتے۔''

''ہم مردوں پر بہت بات کر چکے۔'' میں نے غصہ سے کہا۔ ''کوئی ضروری نہیں اس بار بھی ہمیں پھر سے کوئی مردہ نظر آجائے۔ میرا خیال ہے ہمیں دریا کی طرف جانے کا ارادہ ترک کر دینا چاہیے۔''

''بالکل بھی نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں ایک ایسی زندگی جی رہا ہوں جس میں اس دریا کی کافی اہمیت ہے۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ اس شہر میں ہر کس و ناکس کی زندگی میں یہ دریا ایک بہت اہم رول ادا کر رہا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا کہ کس طرح۔''

اس کے بعد ہم دونوں کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے اور میں سوچنے لگا کہ کیا الزورا

میری زندگی کے لئے کوئی صحیح واقعہ ہے؟ اس اتنے بڑے شہر میں جہاں ہزاروں گھر آباد ہیں جن میں لاکھوں انسان بستے ہیں جانے وہ کون سے اتفاقات تھے جنہوں نے ہمارے ستاروں کو ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے پر مجبور کیا۔

الزورا میری طرف مسکراتے ہوئے تاک رہا تھا۔

''میں تمہیں ایک تجربے کی بات بتاتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اگر کھانے اور نہ کھانے میں شش و پنج پیدا ہو تو نہ کھانا بہتر ہے اور جانے اور نہ جانے میں تذبذب ہو تو جانا بہتر ہے۔''

''واقعی۔ یہ کافی دانش مندی کی بات کہی ہے تم نے۔'' میں نے اس کی مسکراہٹ واپس لوٹاتے ہوئے کہا۔ ''مثلاً اگر دوا کھانے یا نہ کھانے میں شش و پنج ہو تو نہ کھانا بہتر ہے اور چکلا جانے یا نہ جانے میں شش و پنج ہو تو وہاں جانا بہتر ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں تم مجھ سے دشمنی کی شروعات کرنا چاہتے ہو تا کہ مجھ سے چھٹکارا حاصل کر سکو۔'' الزورا اپنی ہمیشہ کی مسکراہٹ مسکرا رہا تھا جس کے حاشیوں پر خفت کے ذرا بھی نشانات نہ تھے۔ ''مگر میں اتنی آسانی سے درکنار کر دینے والی چیز نہیں ہوں۔ اور میں تمہیں دکھانا چاہتا ہوں کہ یہ دریا میری زندگی میں کیوں اتنی اہمیت رکھتا ہے۔''

''پہلے میں اس کے لئے اپنے اندر دلچسپی جگا تو لوں۔'' میں نے کہا اور اسکی آنکھوں کے اندر تاکنے لگا۔ پھر میں نے اپنے کندھے اچکا کر کہا۔ ''سوری گاڈ فادر، کوئی فائدہ نہیں۔ میں اپنے اندر کسی بھی طرح کے تجسس کا فقدان پا رہا ہوں۔ کیوں نہ ہم لوگ کسی دوسرے موضوع پر گفتگو کریں۔''

الزورا کے مکان کے جس کمرے میں ہم لوگ بیٹھے تھے اس میں قدِ آدم کھڑکیوں کے پلے باہر کو کھلے ہوئے تھے جن پر چڑیوں کی بیٹ کی لمبی لکیریں تھیں۔ ہمارے سامنے کی کھڑکی سے نیچے سڑک کا شور سنائی دے رہا تھا جس کی دوسری جانب ایک عمارت کی شکستہ دیوار پر غالب کا سبزہ اگا ہوا تھا۔ میں میز پر انگلیوں کی پوروں کو پھیلا کر اپنی انگلیوں کی ناہمواری کو ناپنے لگا۔ الزورا میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے خالی گلاس کے اندر بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں اٹھ کر اس کی کرسی کے پاس گیا اور میں نے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''الزورا کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ہم ایک دوسرے کو نہ جانتے۔''

''کیا ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟'' الزورا نے مجھے لاجواب کرتے ہوئے کہا۔

''اور ایک دوسرے کو جاننے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہم اس جانکاری کے بغیر بھی زیادہ بہتر یا بدتر جانور ثابت ہو سکتے ہیں۔''

''تو پھر تم اپنے بارے میں مجھے اتنا کیوں بتانا چاہتے ہو؟ اس کے لئے دریا کی طرف کیوں جانا چاہتے ہو؟''

''زیادہ بتانا مطلب زیادہ چھپانا، مطلب پانی کو زیادہ گدلا کر دیتا ہے۔ الفاظ ہمارے سب سے آزمودہ اور طاقتور نقاب ہیں۔ اور دریا کی طرف جانے کا مطلب ہے اس جگہ کو لوٹنا جہاں سے ہم سارے جاندار رینگ کر باہر آئے ہیں۔ یہ میں نہیں، دنیا کے سب سے پہلے فلسفی طالیس کا کہنا ہے۔ یہ پانی ہماری جبلت میں حاوی ہے اسی لئے لوگ ساری عمر پانی کے طلسم میں گرفتار رہتے ہیں، جھیل اور سمندر کی طرف جانا چاہتے ہیں، کنوؤں میں ڈوب کر مرتے ہیں۔'' الزورا مسکرا رہا تھا اور میں اس کے مسوڑوں میں سونے کے دانتوں کو چمکتے دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ اگر الزورا ہندو ہوتا تو جلنے کے بعد اس کی راکھ کو پانی سے چھوانا کافی فائدے کا کاروبار ہوتا جیسا کہ بنارس کے کلوگھاٹ میں لوگ کرتے ہیں۔

''تم سمجھتے ہو میری کہانی بس اتنی سی ہے، ایک شرابی جسکی کڈنی آخر کار ناکارہ ہو جانے والی ہے۔'' الزورا کی آواز آئی۔ ''ممکن ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یا پھر ممکن ہے تم غلط کہہ رہے ہو اور میں مرنے کے بعد جنت چلا جاؤں۔''

''تم کہیں بھی جاؤ آخر اسے جہنم ہی بنا ڈالو گے۔ چلو چلو دریا کی طرف چلتے ہیں۔''

میں میز سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھاتے ہوئے اکتا کر کہتا ہوں کیوں کہ مجھے یاد آتا ہے ایک دوست کے ساتھ ساتھ میں ایک پرافیشنل بھی ہوں جس کے لئے اپنے گاہکوں کی خوشنودی کا خیال رکھنا لازمی ہے۔ ''تمہیں پتہ ہے الزورا، کبھی کبھی مجھے لگتا ہے میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ مجھے اس کے لئے معاف کر دینا۔ اس سے تمہاری ذمہ داریاں میرے لئے بڑھ سکتی ہیں۔''

''میں نے ہمیشہ دوستوں کے مصائب جھیلے ہیں۔'' الزورا مسکرا رہا تھا۔ ''ایک ستم اور سہی۔ دوست بھلا اور کس لئے ہوتے ہیں؟''

دریا کنارے عام دنوں کی طرح اکے دکے لوگ نظر آ رہے تھے کیونکہ یہ آفس کا وقت تھا۔ مگر مجھے بڑی حیرت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ ایک عورت دریا کی حفاظتی دیوار پر ہماری منتظر تھی جسے اپنی طرف آتے دیکھ کر الزورا مسکرایا تھا۔

''گھبراؤ مت، اسے میں نے بلایا ہے۔'' الزورا نے میرے کان میں سرگوشی کی اور اس پیلے گلاب کی طرف اشارہ کیا جسے اس نے شناخت کے لئے اپنی شرٹ کے کاج میں ٹانک رکھا تھا۔

''مگر یہاں کیوں؟'' مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ کوئی اچھی عورت نہیں تھی۔ اس کے بھڑکیلے میک اپ اور ساڑی اور بلاؤز کو کس کر پہننے کا انداز اس بات کا غماز تھا کہ وہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچنے کی عادی تھی۔ گرچہ اس نے مانگ میں سیندور بھر رکھا تھا مگر جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ یہ سیندور فرضی تھا۔

''سونیکا۔'' الزورا نے عورت کا تعارف مجھ سے کراتے ہوئے کہا۔ ''ہم آج پہلی بار مل رہے ہیں۔ میں نے سونیکا کا نمبر ایک عوامی پیشاب خانے کی دیوار سے لیا تھا۔ اور یہ ایک نئی طرح کا ایڈونچر ہے۔''

''میرا ایک دوست ہے جسے میں نے اس کام پر لگایا ہوا ہے اور یہ کوئی ایڈونچر نہیں، میری روزی روٹی کا سوال ہے۔'' سونیکا نے کہا۔ ''مگر فون پر مجھے کیا پتہ تھا کہ میں دو ادھیڑ عمر کے بن مانس سے ملنے جا رہی ہوں۔ خیر آگے کا کیا پروگرام ہے؟''

''آگے کا کوئی پروگرام نہیں۔'' الزورا نے جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم یہاں صرف شریف آدمی کی طرح بیٹھ کر گفتگو کریں گے، ایک ایسے شریف آدمی کی طرح جس کی کال کوٹھری کا دروازہ ابھی کھولا نہیں گیا ہو۔''

سونیکا نوٹ تھام کر تھوڑی دیر ہچکچاہٹ کے ساتھ کھڑی رہی۔ پھر اس نے پرس کھول کر اسے اندر ڈال دیا، ایک ٹھنڈی سانس لی اور چپ ہوگئی۔ ہم تینوں حفاظتی دیوار کے سامنے کھڑے دریا پار تاک رہے تھے جہاں انگریزوں کے زمانے کے گودام گھر خاموشی کی چادر میں لپیٹے ہوئے تھے اور آزاد ہندوستان کے کارخانے دھواں اگل رہے تھے جو سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے اوپر جا رہے تھے۔

''زیادہ بات کرنا میں پسند نہیں کرتی۔'' آخر کار لانبے قد کی سونیکا نے دیوار پر اپنے

بھاری کو لہجے تکا کر دریا کو رد کرتے ہوئے کہا۔ ''خیر اب پسند ناپسند کا سوال کہاں اٹھتا ہے۔ میرا نام سونیکا ہے۔ یہ میرا اصلی نام نہیں ہے۔ اور کیا جاننا چاہتے ہو تم لوگ؟ یاد رکھو مجھے اپنے کام میں بیک وقت دو آدمی کا سامنا کرنے کی عادت نہیں ہے۔''

''دو کیا میں تو ایک کے تجربے سے محروم ہوں۔'' الزورا ہمیشہ کی طرح اپنی کمینی مسکراہٹ مسکرا رہا تھا۔ ''گرچہ آدمی ہر روز نئی چیزیں سیکھتا ہے۔ ویسے میں بتا دوں اپنے دوست کو میں اس کی مرضی کے خلاف گھسیٹ کر یہاں لایا ہوں گرچہ ہر بار اس طرح کے معاملات میں وہی مرکزی کردار بن کر ابھرتا ہے جس کے بعد میری حیثیت ایک تماشائی سے زیادہ کی نہیں ہوتی یا اس ہدایت کار کی طرح ہوتی ہے جسے کھیل شروع ہوتے ہی اسٹیج سے غائب ہو جانا پڑتا ہے۔''

''مجھے رنڈیاں پسند نہیں۔'' میں ناخوشگواری کے ساتھ کہتا ہوں اور اذیت پسندی کے جذبے سے سرشار نظر آ رہا ہوں۔ ''اور اگر مجھے تمہارے بارے میں علم ہوتا تو میں ادھر کبھی نہ آتا۔ شاید الزورا کو پیسے لٹانے کا شوق ہو۔ ممکن ہے وہ تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہتا ہو۔ مگر میں... میں کچھ دوسری طرح کے گناہ کا شوق رکھتا ہوں۔''

میں ان دونوں کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہوں جہاں حفاظتی دیوار کے سامنے ایک جگہ ایک بوڑھی مارواڑی عورت اپنی جواں سال نوکرانی کے ساتھ کھڑی کوؤں اور کبوتروں کو دانے ڈال رہی تھی۔ میں مڑ کر دیکھتا ہوں، دونوں مسکراتے ہوئے میری طرف تاک رہے ہیں۔ الزورا میری طرف دیکھ کر ہات ہلاتا ہے۔ وہ میری توجہ دریا کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہے جہاں ایک بھینس کا مردہ بہتا جا رہا ہے۔ اس مردے کی گردن پر ایک چڑیا بیٹھی ہوئی ہے جو اس کے کان کے اندر ٹھونگے لگا رہی ہے۔ مجھے ابکائی آتے آتے رہ جاتی ہے۔ جانے کتنا وقت گذر جاتا ہے۔ دریا بہتے بہتے میرے ذہن سے باہر چلا جاتا ہے اور میں دیکھتا ہوں، مارواڑی عورت کی ٹوکری خالی ہو چکی ہے اور وہ اپنی نوکرانی کے ساتھ اپنی کار کے اندر بیٹھ رہی ہے۔ ڈرائیور اسٹیئرنگ وہیل کے پیچھا بیٹھا دریا کی طرف تاک رہا ہے۔ ایک سفید بالوں والا کتا اس کے بغل میں کسی فلسفی کی طرح چہرہ لٹکائے بیٹھا ہے جیسے وہ اس کائنات کی حقیقت سے بیزار ہو۔ کتے کے ابرو کے بال کافی گھنے ہیں جنھوں نے اس کی آنکھ پر سایہ کر رکھا ہے جیسا کہ ستر اسی سال کے بڈھوں کی آنکھوں میں نظر آتا ہے۔

''اسٹامت اتراؤ۔'' میں کتے سے کہتا ہوں اس بات سے لاپرواہ کہ میری آواز صرف مجھے سنائی دے رہی تھی۔ ''تم اس چمچماتی کار میں ہونے کے باوجود ایک کتا ہی رہو گے۔''

ایک مختصری نینداور میری آنکھیں پھر سے کھل گئیں۔ سونیکا آئینہ کے سامنے بیٹھی اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی ہے۔ مجھے پتہ نہیں میں کتنی دیر تک سوتا رہا تھا جب کہ ہمارے درمیان اس طرح کا کوئی معاہدہ نہ تھا۔ وہ اس وقت پینٹی کوٹ اور بلاؤز پہنے ہوئے تھی اور اپنی طبعی عمر سے کچھ زیادہ نظر آ رہی تھی۔ اس نے آئینے کے اندر مجھے جاگتے دیکھا اور ہونٹوں پر لپ اسٹک لگاتے لگاتے مسکرائی جسکا مقصد اور کچھ نہیں لپ اسٹک کو اچھی طرح ہونٹوں کی سلوٹوں کے اندر تک پہنچانا تھا۔

''موبائل پر تمہارے دوست نے تمہیں فون کیا تھا۔''

''اور تم نے اس سے بات کی؟''

''نہیں۔ میں اپنے پیشے کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ میں موبائل پر اسکا نام پڑھ کر بتا رہی ہوں۔''

''گڈ گرل۔'' میں اٹھ کر تکیہ پر کہنی رکھتے ہوئے انگڑائی لیتا ہوں۔ ''تم میرے دوست سے ملتی رہتی ہو؟''

''میں نے صرف ایک دوبار ریستوراں میں اس کے ساتھ شراب پی ہے اور بس۔'' اس نے کھڑے ہو کر ساڑی کی تہوں کو اپنے جسم کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا گرچہ مجھے پتہ تھا وہ جھوٹ کہہ رہی ہے۔ ''وہ بہت زیادہ باتیں کرتا ہے اور بوریت کی حد تک نیک بندہ ہے۔ لیکن جانے اتنی زیادہ پی جانے پر بھی اسے نشہ کیوں نہیں ہوتا۔ پھر وہ پیتا ہی کیوں ہے؟''

''الزورا کے بارے میں سوچنا چھوڑ دو۔'' میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا ذہن تھک جائے گا اور تم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پاؤ گی۔ وہ ایک دلدل ہے۔ جس نے بھی اس کے اندر غوطہ لگایا پھر کبھی ابھر نہیں پایا۔ اس کی جیتی جاگتی مثال میں ہوں۔ ہمارے درمیان کبھی وکیل اور موکل کا رشتہ تھا، اب دیکھو میں کہاں پر ہوں۔ اب میری حیثیت ایک کتے کی طرح ہے جسے وہ جلتے ٹائر کے اندر سے گذارنے کی مشق کرا رہا ہے۔''

''میں تم جیسے پیچیدہ مردوں میں اپنا دماغ نہیں کھپاتی۔'' وہ بولی۔ ''میں صرف اتنا جانتی

ہوں کہ تم مردوں کے پاس دماغ صرف ایک ہوتا ہے جب کہ جیبیں دو یا دو سے زیادہ ہوتی ہیں۔"

ہاوڑا اسٹیشن کے باہر اس بدنام زمانہ ہوٹل سے جب ہم باہر نکلے تو ہاوڑا پل کا ڈھانچہ دھوپ سے تمتمار ہا تھا اور اس پر بچھی تارکول کی سڑک سلگ رہی تھی۔ سونیکا کو ٹالی گنج کے لئے روانہ ہونا تھا۔ میں نے دیکھا ٹرام کی متروک پٹری پر ایک بھاری بھرکم آدمی کھڑا ہماری طرف تفتیشی بھری نظروں سے تاک رہا تھا۔ سونیکا پرس جھلاتے ہوئے ایک سرکاری بس کے اندر غائب ہو گئی جسکا نمبر ونڈ اسکرین پر چونے سے لکھا ہوا تھا اور جسکا ڈرائیور کسی بُل ڈاگ کی طرح اسٹیئر نگ وہیل پر بیٹھا بیزار نظروں سے کلکتہ کی طرف تاک رہا تھا اور رہ رہ کر پلاسٹک کی ایک غلیظ بوتل سے پانی پی رہا تھا۔ میں نے پٹری پر کھڑے اس بھاری بھرکم شخص کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

"شاید آپ مجھے جانتے ہیں؟" میں نے اس سے بنگالی میں پوچھا۔

"قطعی نہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا اور مرطوب علاقے میں جینے والے کسی سمندری گھوڑے کی طرح گیلا نظر آرہا تھا۔ "لیکن یہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ایک بالکل ہی نیا چہرہ بہت شناسا ثابت ہوتا ہے۔"

"جیسے کسی کاربن پیپر کے نیچے سے نکل آیا ہو۔" میں نے مسکراہٹ لوٹاتے ہوئے کہا۔ "اس طرح دیکھا جائے تو ہم اپنے حافظے پر زیادہ بھروسہ نہیں کر سکتے؟"

"انسانی حافظہ وہ سنڈاس ہے جو بھرتا رہتا ہے، بھرتا رہتا ہے۔" فربہ آدمی نے اپنے پیلے دانت باہر نکال دیے تھے جیسے وہ انکی نمائش کے لئے وہاں کھڑا ہو۔ "اور جب گھڑا پھوٹتا ہے تو ہمیں یہ سمجھنے میں پریشانی ہوتی ہے کہ یہ گندگی ہمارا حصہ ہے کہ ہم ایک کیڑے کی طرح اس گندگی میں جی رہے تھے۔"

"چھوڑو بھی، اتنے کھلے عام اندھیرا مت پھیلاؤ۔" میں نے لاپرواہی سے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ "ہم کیوں نہ اچھی چیزیں سوچیں۔ کھاتے پیتے لوگوں کے درمیان اس طرح کی گفتگو کا کیا کام ہے؟ لوگ سمجھیں گے ہم حزن وملال کے پیغمبر ہیں جو ہر روز اس پل کو ٹوٹ کر دریا برد ہوتے دیکھنے کی امید میں اس طرف آنکلتے ہیں۔"

//////

اس شخص سے دوبارہ ملاقات کے قوی امکان کی امید کا جب میں نے الزورا سے ذکر کیا تو وہ فکر مند نظر آیا۔

''کیا کہا تم نے یحیم شیم، یہی الفاظ تھے نہ تمہارے؟'' اس نے کہا۔ پھر سیٹی بجائی۔ ''اور اب تم اس سے کس چیز کی امید رکھتے ہو؟ یاد رکھو، خواہ مخواہ کے کھلونے اکھٹے کرنا دانش مندی کا کام نہیں۔''

''لیکن کچھ کھلونے تفریح طبع کا کام بھی انجام دیتے ہیں اور کچھ کھلونے بلا وجہ سہی مگر ساری زندگی تم اپنی نفسیات کے طاقچے پر انہیں رکھنے پر خود کو مجبور پاتے ہو۔''

''وہ خدا کے بنائے ہوئے خاص کھلونے ہیں جن سے انکار ممکن نہیں۔ اور یہ بھی ہے کہ صحیح کھلونے ہم جیسے گنہگار بچوں کو کبھی ودیعت نہیں ہوتے بلکہ میں تو کہتا ہوں ہمیں اپنے گناہوں کی مغفرت کے لئے ہاتھ اٹھانے کے بارے میں سوچنا ترک کر دینا چاہئے۔ یہ وہ معاملات ہیں جنہیں اوپر والا اپنے ڈھنگ سے طے کر چکا ہے۔''

''تم اپنی باتوں کے ذریعہ کیا ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تمہاری نیت میں کھوٹ نہیں، کہ تمہاری حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ کی نہیں اور اس طرح دیکھا جائے تو تم پر کسی طرح کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، ایک روبوٹ کی طرح جو اپنے پروگرام کے باہر کچھ بھی کرنے پر قادر نہیں؟ چلو بھی، یہ اداکاری چھوڑو۔ تمہارے اس فرسودہ میک اپ سے اب کام چلنے والا نہیں۔ یہ دنیا اپنے محور پر بہت آگے نکل چکی ہے۔''

''میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں۔'' الزورا نے پھر سے دہرایا۔ ''لیکن جیسا کہ تم کہتے ہو میں ان ڈوریوں کا کیا کروں جن سے میں بندھا ہوا ہوں، جو میری مرضی کے خلاف مجھے حرکت کرنے پر مجبور کرتی ہیں، مجھے منھ کے بل گراتی رہتی ہیں، سر کے بل الٹا لٹکائے رکھتی ہیں اور آخر میں ہمارے گلے کا پھندا بن جاتی ہیں۔''

تو کیا کچھ نادیدہ ڈوریوں نے مجھے بھی اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ کیونکہ سونیکا کے لئے میری تڑپ سے میں خود بھی حیران تھا۔ کیا ایک انسانی جسم کسی دوسرے پر اس حد تک قابض ہو سکتا ہے؟ سونیکا جس کی آنکھیں یوں تو ہر وقت مسکراتی ہیں مگر ان میں خوشی کی کوئی رمق نہیں جاگتی، جس کے ہونٹوں کے دبیز نشانات میرے دل تک نہیں پہنچتے، اچانک آنکھیں بند کرنے پر وہ کیوں

اتنی زیادہ روشن ہو اٹھتی ہے کہ اسے پتلیوں پر سنبھالنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

اور اسی دوران اس شہر میں تنہا لوگوں کی بھیڑ بڑھتی جارہی ہے، وہ بھاگتے ہوئے اپنی جگہ منجمد ہوتے ہوئے لوگ ہیں، وہ مستقبل کے لئے کسی طرح کے جائز یا ناجائز دعوے پیش نہیں کرتے اور میں ان لوگوں کی منفرد بھیڑ کا وہ نادر چہرہ ہوں جس نے ایک ننگے اور بے پناہ جسم کی تہوں کے اندر اپنی خفیہ کہانی لکھنے کی کوشش کی ہے، ایک ایسی کہانی جسے وہ دنیا سے چھپا کر لکھنا چاہتا ہے۔

''دھیرے دھیرے تم ایک پتھر بنتی جارہی ہو۔'' ایک دن میں سونیکا سے شکایت کرتا ہوں کیونکہ اسکا جسم کسی بھی طرح کے شہوانی ردعمل سے خالی ہے۔

''سوری۔ میرا لڑکا بیمار ہے۔''

مجھے دلچسپی نہیں ہوتی۔ میں اس کے پیٹ پر سیزیرین کے نشانات دیکھ چکا ہوں۔

''اور دوسرا؟''

''وہ مر چکا ہے۔''

''اسے کیا ہوا تھا؟''

''تھلیسمیا!''

''اور اسے؟''

''یہ بھی تھلیسمیا کا شکار ہے۔''

میں اس کے ننگے چپچپاتے جسم سے اس کی روح کی طرح الگ ہو کر بیٹھ گیا ہوں۔

''اور تمہارا شوہر؟''

''میں طلاق شدہ ہوں۔''

''وہ اپنے بچے کی خبر نہیں لیتا؟''

''وہ اس ملک سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جا چکا ہے۔ اس کے پاس ایک بہت ہی ملائم دل ہے۔ اس سے ان بچوں کا مرنا دیکھا نہیں جاتا تھا۔''

''مجھے افسوس ہے سونیکا۔''

''نہیں۔'' سونیکا میرے ہونٹوں پہ اپنی انگلی رکھ دیتی ہے۔ ''ہمدردی مت جتاؤ۔ تم

واحد شخص ہو جسے میں ہمدردی کی کھائی میں غائب ہوتے نہیں دیکھنا چاہتی۔ میں اس دنیا کی بے رحمی کے سہارے ہی زندہ ہوں۔ تم دیکھ رہے ہو اوپر والا جب شدید دکھ دیتا ہے تو اسے برداشت کرنے کی بے حسی بھی عطا کرتا ہے۔ کم آن، یہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟ دیکھو میں اب جاگ چکی ہوں۔ میں ایک پرافیشنل ہوں۔ مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ میں اسکا ازالہ کرنا چاہتی ہوں۔''

وہ مجھ سے لپٹنا چاہتی ہے۔ اس کی زبان کسی کیڑے کی طرح میرے سارے جسم پر رینگ رہی ہے، میری شہوانی خواہش کو ہوا دینا چاہ رہی ہے۔ مگر بہت دیر کی کوشش کے بعد بھی وہ مجھے جگانے میں ناکام رہتی ہے۔ آخر وہ تکیے کے اندر منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔

''تمہارا دل کسی فاختہ کی طرح نرم ہے۔'' وہ اپنا گیلا چہرہ میری طرف اٹھا کر کہتی ہے۔ ''یہ دنیا کمزور لوگوں کی آماجگاہ بنتی جا رہی ہے۔''

''میں واقعی ایک کمزور انسان ہوں۔ تمہارے شوہر کی طرح۔'' میں کہتا ہوں۔ ''لیکن میں تمہارے بچے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''میں نے اسے اسپتال میں داخل کرا دیا ہے۔'' اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے ہیں۔ ''وہ اچھے ہاتھوں میں ہے۔ چلو بھول جاؤ اسے۔ کسی بار میں بیٹھ کر ہم ایک دو گلاس پیتے ہیں۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔''

''کیوں نہیں۔'' میں کہتا ہوں اور دریا سے گذر کر ہم چورنگی روڈ پر ٹیکسی سے نکل کر ایک بار میں داخل ہوتے ہیں جہاں اس وقت وقفہ نشاط کا دور اپنے خاتمے پر ہے، ایک چینی سنگر اسٹیج پر کھلے عام فولڈنگ چیئر پر بیٹھی میک اپ کر رہی ہے اور ایک آدھ سازندے اپنے ساز ٹھیک کرنے میں مصروف ہیں۔ ہم دن ڈھلنے تک اتنا پی لیتے ہیں کہ مشکل سے اپنی ٹیکسی میں بیٹھ پاتے ہیں۔ گھر پہنچ کر اچانک مجھے لگتا ہے کہ دیواریں کافی دبیز ہو گئی ہیں، گھر کے لوگ، میری بیوی، میرے بچے، میرا کتا بارکی جو میرے بریف کیس کو زمین پر رکھتے ہی اس کے ہینڈل کو جبڑوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے میری خواب گاہ کے اندر اس کی مخصوص جگہ پر لے جاتا ہے، ہر چیز میری سمجھ سے باہر ہے۔ باہر گلی میں ایک سائل کی بے وجہ کی پکار ہے اور ایک طیارہ ہماری چھت کو توڑتا ہوا میرے دماغ کے اندر کریش لینڈ کرنا چاہتا ہے۔

//////

کیتھیڈرل روڈ کے کشادہ فٹ پاتھ پر، بہت ہی بھاری بھرکم پیڑ اپنے نادیدہ گھونسلوں کے ساتھ کھڑے ہیں۔ یہاں پر سڑک کی صفائی ایک دوسرا کلکتہ پیش کرتی ہے۔ بارش کے بعد ہوا بالکل سرد ہو رہی ہے جو اکتوبر کے مہینہ کے لئے غیر فطری ہے۔ میں پی جی اسپتال کے پھاٹک پر پہنچ چکا ہوں اور اس کے گندے گلیاروں میں بھٹک رہا ہوں۔ بچوں کے وارڈ میں وہ لڑکا اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف تاک رہا ہے۔ اس کے سارے بدن میں پلاسٹک کے پائپ لگے ہیں۔ اور تمام وارڈوں کی طرح اس وارڈ کی مہک بھی ناقابل برداشت ہے۔ ہر دوسرے یا تیسرے بستر سے آکسیجن سلینڈر لگے ہیں یا بوتلوں سے قطرہ قطرہ زندگی ٹپک رہی ہے۔ یہاں زیادہ تر آنکھیں ایک ایسے مستقبل کی طرف تاکنے کی عادی ہو چکی ہیں جو تنگ ہوتے ہوتے ایک روزن سیاہ میں بدل جاتا ہے جس سے واپس لوٹنا ممکن نہیں ہوتا۔

سونیکا کی مسکراتی آنکھیں میری طرف تاک رہی ہیں۔ وہ مریض کے سامنے ایک اسٹول پر بیٹھی کافی تر و تازہ نظر آرہی ہے (کیا وہ اپنے بچے کے سامنے کسی طرح کی اداکاری کر رہی ہے؟) وہ اپنے بچے کے لئے آنے والے جاڑے کے پیش نظر ایک سوئٹر بن رہی ہے۔ (شاید اسکا مقصد بچے کے سامنے ایک لمبی زندگی سوانگ قائم کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔) آہ وہ فریب جو ہم خود کو دیا کرتے ہیں! میرا جی چاہتا ہے میں چپ چاپ واپس چلا جاؤں مگر میں بہت دیر تک وہاں رک جاتا ہوں اور تب مجھے الزورا دکھائی دیتا ہے جسے دیکھتے ہی گیس ماسک کے اوپر بچے کی آنکھیں (یہ آنکھیں سونیکا کی تھیں) چمک اٹھی ہیں۔ دراصل یہ ان کی آنکھوں کی چمک تھی جس نے مجھے الزورا کی طرف دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ مجھے دیکھ کر الزورا کی آنکھوں میں کوئی حیرت نہیں جاگتی۔

''سونیکا نے مجھے بتایا تھا کہ تم آنے والے ہو۔'' وہ شاید کہیں سے کوئی رپورٹ لایا تھا جسے سونیکا کے حوالے کر دیتا ہے۔ وہ بچے کے سر پر ہات پھیر رہا ہے، اس کے ساتھ شیڈو باکسنگ کی اداکاری کر رہا ہے۔

''اسے موت سے ڈر نہیں لگتا۔ کیوں الزورا؟'' وہ اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا ویڈیو گیم نکال کر کھیلنے لگتا ہے۔

''الزورا۔ تمہیں یہ گیم چاہئے۔'' وہ بچے سے مخاطب ہے گرچہ اسکی طرف نہیں تا کتا۔
''الزورا ایک کمپیوٹر جینئیس ہے۔'' اس نے مجھ سے مخاطب ہوئے بغیر کہا تھا۔
میں چونک کر اسکی طرف دیکھتا ہوں

''اس کے اس نام سے مت چونکو، اس نے مجھ سے خود یہ نام لیا ہے۔'' الزورا گیم کھیلتے ہوئے کہتا ہے۔ ''اور ہم دونوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ بھی ہو چکا ہے۔''

سونیکا اپنی جگہ بیٹھی اس تماشے کو دیکھ رہی ہے جیسے اسے پتہ ہو الزورا، وہ مقدمہ باز انسان، آخر میں خود بخود اپنا راز اگل دے گا۔ اور وہ وہی کرتا ہے۔

''ہم نے طے کیا ہے کہ ہم مرنے کے بعد بھی ایک دوسرے سے رابطہ قائم رکھیں گے۔''
وہ ویڈیو گیم بچے کی طرف بڑھا دیتا ہے جسے وہ اپنے مرجھائے ہوئے ہاتھ سے تھام لیتا ہے۔

سونیکا رپورٹ کے ساتھ ڈاکٹر کی تلاش میں چلی گئی ہے جو اتنے بڑے اسپتال میں جانے کہاں گھوم رہا ہوگا۔ الزورا نے بچے کا ایک ہاتھ تھام رکھا ہے اور دونوں میٹھی نظروں سے ایک دوسرے کو تاک رہے ہیں۔

''ہمیں ایک دوسرے سے اتنا قریب دیکھ کر تمہیں حسد ہو رہا ہوگا۔'' الزورا مڑ کر میری طرف دیکھ کر آنکھ مارتا ہے۔ ''چھپاؤ مت۔ میں جانتا ہوں۔ تم ہمیشہ سے ایک حاسد انسان رہے ہو۔ لوگ بلاوجہ نہیں کہتے کہ تم سارے وکیل آخر میں جہنم رسید کئے جاؤ گے۔''

الزورا کی پرانی عمارت کی ٹیرس پر ہم کئی جام ٹکرا چکے ہیں۔ نتیجہ: آسمان پر کچھ نئے ستارے نکل آئے ہیں جو دراصل ہماری نشیلی آنکھوں کی ایجاد ہیں۔ نیچے سڑک پر پرچھائیاں مختلف شکلیں لینے لگی ہیں۔ ایک کھڑکی بار بار ہماری سماعت کی دیوار سے ٹکراتی ہے، کھلتی ہے، بند ہوتی ہے، پھر سے کھل جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ ہمیں یاد رہتی ہے، کبھی ہم اسے بھول جاتے ہیں۔
الزورا ایک اور جام بنا رہا ہے۔

On the rocks..

''تمہیں ہم دونوں کے تعلقات کا پتہ تھا؟''
''کسے پرواہ ہے۔'' الزورا ہنستا ہے۔ ''اور پھر اس سے عورتیں نیچے کہاں گرتی ہیں؟ یہ تو

ہم مردہیں جواپنا جسم بیچتے ہیں اور پیسے کی شکل میں اسکا کفارہ ادا کرتے ہیں۔ خیر اب اسے جانے دو۔ اب تو الزورا بھی نیم تلہ میں جل چکا۔"

مجھے اس کی اطلاع مل چکی تھی ۔ میں نے سونیکا کو اس کے بعد بہت تلاش کیا مگر اسکا ٹھکانہ بدل چکا تھا۔ شاید اس نے جینے کا کوئی نیا محور تلاش کرلیا ہو۔"میں اس کے جسم سے گدھ کی طرح چپکا رہا اور تم اس کی مرہم پٹی کرتے رہے۔ تو یہ کردار ہے تمہارا۔ یہ کیسی Hypocracy ہے الزورا؟ مجھے تم سے ڈر لگنے لگا ہے۔ اب میں جان گیا ہوں تم دریا کی طرف کیوں جانا چاہتے تھے؟"

"بہت خوب، تو ایک بار پھر کل کیوں نہ ہم دونوں ہوگلی پل سے گذر کر بوٹینکل گارڈن کے مردہ گھاٹ کی طرف جائیں۔"

"وہاں کوئی مردہ گھاٹ نہیں ہے ۔ صرف ایک جگہ ایک سنسان کنارہ ہے جہاں جانوروں کے مردے ڈالے جاتے ہیں جن کے انتظار میں گدھ درختوں کی پھننگوں میں بیٹھے بیٹھے ٹہنیوں اور شاخوں پر اپنی چونچیں گھستے رہتے ہیں۔"

"وہی سہی، مگر ہم دونوں جانوروں کے جانے سے اسے مردہ گھاٹ کا رتبہ تو مل جائے گا کیونکہ صحیح طور پر دیکھا جائے تو ہم دونوں جانور تو ہیں مگر زندہ کب ہیں؟" الزورا نے جام اٹھا کر آنکھ ماری۔"میں نے پیشاب خانے سے ایک نئی عورت کا پتہ لیا ہے، لیکن اس بار یہ عوامی پیشاب خانہ نہیں بلکہ ایک پانچ ستارہ ہوٹل کا تھا جس کے آئینے میں یہ نمبر ایک قیمتی مارکر پین سے لکھا گیا تھا۔ اس نے فون پر بتایا ہے کہ وہ کلیوپیٹرا کی طرح خوبصورت ہے اور اب میرے لئے یہ جاننا ضروری ہو گیا ہے کہ کیا یہ صحیح ہے؟

تمہارے پاس کلیوپیٹرا کی کوئی تصویر ہے؟ میں نے سنا ہے پورے یورپ کی تاریخ اس کی ناک کی نوک سے لکھی گئی ہے۔"

"تم صرف ایک ناکام جوکر ہو جو ایک کارٹونسٹ بننے کی کوشش کر رہا ہے۔" میں جھک کر اسکی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔"میرے جوکر بتاؤ اب کون سا نیا کرتب دکھانے جا رہے ہو تم؟"

الزورا کوئی جواب نہیں دیتا۔ اور تب مجھے احساس ہوتا ہے کھڑکی کا کھلنا اور بند ہونا اچانک بند ہو گیا ہے۔ پھر الزورا انگڑائی لے کر آسمان کی طرف تاکتا ہے۔

''میں کسی فرشتے میں یقین نہیں رکھتا۔'' وہ دھیرے دھیرے کہتا ہے۔ ''کیونکہ میں جانتا ہوں اب ہم انسان ایسی چیز نہیں رہے کہ اس کے لئے کوئی فرشتہ خدا کی طرف سے پیغام لے کر اترے۔ شاید ہمیں اب اس کے بغیر ہی کام چلانا ہوگا۔ یوں بھی جب اتنی ساری کھائیاں ہماری چاروں طرف بن چکی ہوں تو انہیں لانگھنا تو پڑتا ہی ہے، چاہے اس کوشش میں ہم اس کی نذر ہی کیوں نہ ہو جائیں۔''

''جیسا کہ میں ہو چکا ہوں۔'' میں اپنا گلاس اٹھا کر اس کے گلاس سے ٹکراتا ہوں اور تاریک آسمان کی طرف تاکتا ہوں جہاں دھندلے تاروں کے بیچ ہمارے تخلیق شدہ ستارے زیادہ روشن نظر آرہے ہیں۔ ''چیرس، اور عزت مآب الزورا اگر آپ برا نہ مانیں تو میں اپنی کھائی میں پڑا پڑا ایک جوکر کو چھلانگ لگا کر اپنے اوپر سے گذرتے دیکھتا رہوں گا جب تک وہ میری طرح کھائی کی نذر نہ ہو جائے۔''

''جانے تم کس کھائی کی بات کررہے ہو۔'' الزورا ہنسا۔ ''ایک جوکر کا سارا کھیل ہی بناوٹی ہوتا ہے۔''

جانور

(۱)

میرا بچہ صرف دو برس کا تھا جب میں اس کے لئے مرغی کے دو چوزے خرید کر لائی۔ مشین کے یہ دونوں بچے بہت بدنصیب ثابت ہوئے۔ پہلا تو اسی دن مر گیا۔ دوسرا اس واقعے کے سات دن بعد بالکنی کے جنگلے سے باہر نکل کر دیوار کے کارنس پر ٹہل رہا تھا جب ایک چیل اسے پنجے میں دبا کر لے گئی۔

وہ تین برس کا تھا جب ایک دن اسے اسکول چھوڑ کر واپس لوٹتے وقت فٹ پاتھ کے ایک سوراخ کے اندر جو ایک پرانا لیمپ پوسٹ نکال دئے جانے کے سبب بن گیا تھا میں نے بلی کے بچوں کی آواز سنی۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ اس کے اندر دو بلی کے نوزائدہ بچے پڑے تھے اور اپنے منحنی سر اٹھائے ہوئے اپنی معصوم آنکھوں سے میری طرف تاک رہے تھے۔ ایک کو تو میں نے فٹ پاتھ پر اس کی ماں کی تلاش میں چھوڑ دیا، دوسرے کو گھر لے آئی۔ ایک ماہ کے اندر اندر وہ ٹھنڈ سے مر گئی۔

میرا بچہ چار برس کا تھا جب میں نے اس کی سالگرہ کے دن تحفے میں اسے ایک خرگوش لا کر دیا جسے اس نے اپنے سینے سے لگا کر پیار سے دباتے دباتے بالکل چھوٹا کر ڈالا۔ ہم نے اسے الگ کرنے کی کوشش کی تو اس نے غصے میں اسے فرش پر پٹک دیا اور وہ ایک بے جان لوتھڑے میں بدل گیا۔

میرا بچہ آٹھ برس کا تھا جب اس کی ضد پوری کرنے کے لئے میں گیلف اسٹریٹ سے

ایک افغان ہاؤنڈ خرید کر لائی۔ مجھے علم نہ تھا کہ میں ٹھگ لی گئی تھی۔ کتا پہلے سے بیمار تھا اور اس کی موت یقینی تھی۔ اسے کھانا کھلانے کی ہمارے تمام کوششیں ناکام ہو گئیں اور ایک دن وہ پلنگ کے نیچے ٹھنڈا پایا گیا۔

وہ چودہ برس کا تھا جب میں اس کے لئے ایک طوطا خرید کر لائی۔ وہ ایک خاموش فطرت کا طوطا تھا جو صرف پنجڑے میں الٹا لٹکتا رہتا۔ ایک دن نوکرانی اس کی پیالیوں میں چنا اور پانی ڈالنے کے بعد پنجڑے کا دروازہ ٹھیک سے بند کرنا بھول گئی اور وہ باہر نکل کر سیڑھی گھر کی مصنوعی سِلنگ میں جا گھسا جہاں دو بڑے بھیانک چوہوں نے اپنا مسکن بنا رکھا تھا۔ انھوں نے فوراً اس کا شکار کر لیا۔ بعد میں مصنوعی سِلنگ کٹوانے پر دونوں چوہے بھاگ نکلے اور ہڈیوں کے ڈھیر کے بیچ جنھیں چوہے مہینوں سے وہاں جمع کر رہے تھے ہمیں طوطے کے سبز پر، اس کی سالم سرخ چونچ اور پالش کی ہوئی تازہ سفید ہڈیاں ملیں۔

میں نے سوچا اٹھارا سال ایک لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ میرا بیٹا جو جانوروں کا اتنا شیدائی ہے اور گوشت مچھلی سے جسے کراہیت ہے، شاید جانوروں کے معاملے میں وہ بدنصیب ہے۔

شہر کے قدیم علاقے میں ہم ایک پرانی عمارت کی برساتی میں رہتے ہیں۔ برساتی ان تین کمروں پر مشتمل ہے جس نے چھت کے آدھے حصے کو گھیر رکھا ہے۔ باقی کی چھت خالی پڑی ہے جو ہمارے ہی استعمال میں رہتی ہے۔ میرے بچے کے سر پر بال کم ہیں بلکہ اسے دائمی گنجا کہا جائے تو بہتر ہوگا کیونکہ اب اس کی کھوپڑی پر بال نکلنے والے نہیں۔ وہ پیدائشی لب کٹا ہے اور اس کی ناک ہمیشہ بہتی رہتی ہے۔ ہم اسے پڑھنے کے لئے اسکول نہیں بھیجتے۔ ڈاکٹروں کے مطابق اس کی جسمانی عمر بیس برس کی سہی، ذہنی طور پر وہ ابھی صرف دو سال کا بچہ ہے۔ میں رات رات بھر جاگ کر اس کی تیمارداری کیا کرتی ہوں اور وہ اپنی تیز آنکھیں مجھ پر ٹکائے رکھتا ہے۔

''تمہیں کچھ چاہئے اشرف؟'' میں اس سے پوچھتی ہوں۔

''ماما پٹ، ماما پٹ۔'' (Pet)

''کیسا پٹ؟''

''گھوڑا، ہپّو، ایلی فنٹ۔'' پھر تھوڑی دیر چپ رہ کر وہ کہتا ہے ''ڈک!''

''تم جانتے ہو اشرف، تمہارے سارے پٹ مر جاتے ہیں۔''

''ماما پٹ! ماما پٹ!'' اس پر جیسے ہسٹریا کا دورا پڑ جاتا ہے۔ ''گھوڑا، ہپو، ایلی فنٹ''
''اور ڈک۔'' میں اس کا جملہ مکمّل کرتی۔

میں اسے پبلک پارک لے جاتی جو ہمارے گھر سے تھوڑی دور ایک مصنوعی جھیل کے کنارے واقع تھا۔ وہاں وہ اپنی ہی عمر کے بچّوں کے ساتھ کھیلا کرتا۔ میرا مطلب دو ڈھائی سال کے بچّوں سے ہے۔ بچے اس سے بہت جلد مانوس ہو جاتے کیونکہ وہ خود بھی ایک اچھا کھلونا تھا۔ وہ سر کے بل قلابازیاں کھانے میں ماہر تھا، دونوں ٹانگوں کو اوپر اٹھا کر اپنی ہتھیلیوں پر الٹا چلنے لگتا، قمیض اور بنیان اتار کر اپنا پیٹ غبارے کی طرح پھلا لیتا اور اپنی مٹھیوں سے ڈھول کی طرح بجاتا۔ وہ اپنے کٹے ہوئے ہونٹوں کے بیچ سے چوہوں جیسی آوازیں نکالتا جن سے چھوٹے چھوٹے بچے مسحور ہو کر اس کی طرف تاکتے رہتے۔ مگر مجھے بہت ہوشیار رہنا پڑتا کیونکہ ایک بار وہ ایک بچے کا گال چبا چکا تھا۔

میں جب اس سے بہت خوش ہوتی تو اسے سینے سے لپٹا کر اس کے کٹے ہوئے ہونٹوں کے بیچ بوسہ دیا کرتی۔ دوسرے وقتوں میں میں اس سے لاپرواہ پارک کے بینچ پر بیٹھی پتوں کو ہوا کی زد پر لرزتے دیکھتی رہتی۔ میری جوانی کا ایک بڑا حصّہ اشرف پر صرف ہو چکا ہے۔ میں پھر بھی خود کو یقین دلانے کی کوشش کرتی کہ مجھے کسی بات کا دکھ نہیں، کہ میں خوش ہوں۔

نفیس ہر ماہ ایک نئے ڈاکٹر کی خبر لے کر آتا ہے۔ اتنے برسوں بعد بھی اس نے امید نہیں ہاری ہے۔ اسے میں نے کبھی روتے نہیں دیکھا جیسے ذرا سی کمزوری اور وہ یہ جنگ ہار جائےگا۔ میرے لئے سب سے زیادہ صبر آزما وہ لمحات ہوتے جب اشرف بستر گیلا کر دیتا یا جب اتنا بڑا ہوتے ہوئے بھی وہ پلاسٹک کے کموڈ پر بیٹھنے پر اصرار کرتا اور بعد میں مجھے اس کی صفائی کرنی پڑتی۔ اس کے لئے میں کسی کو الزام نہیں دیتی۔ ہر نوکر نوکرانی کے کام کی ایک حد ہوتی ہے اور ایک جوان لڑکے کی پوٹی سے کسے کراہیت نہیں ہوتی۔ اشرف جسمانی طور پر بالغ ہو چکا ہے، اس کی داڑھی موچھیں نکل چکی ہیں پھر بھی یہ سب کام مجھے کرنے پڑتے ہیں۔ اکثر میں آئینہ کے سامنے کھڑی کھڑی ٹوٹ جاتی ہوں۔ مگر نفیس ہار نہیں مانتا۔ پردوں کا یہ تاجر اشرف پر اپنے لاکھوں روپے خرچ کر چکا ہے مگر اس کی پیشانی پر بل نہیں پڑتا۔ وہ اشرف کو اپنی گود میں بٹھا کر (جب کہ دونوں ایک ہی قد اور کاٹھی کے ہو چکے ہیں) اس کے گنجے سر پر کپڑے کی کیپ رکھ کر کہتا:

"وہ ہم لوگوں کے لئے ایک نیک فال بن کر آیا ہے۔ جان، تمہیں نہیں پتہ، ہم نے جتنا اسے دیا ہے اشرف نے اس کے مقابلے کتنا گنا زیادہ لوٹایا ہے، اس نے ہمیں بڑے بڑے ہوٹلوں سے آرڈر دلوائے ہیں، وینیشین بلائنڈ (Venetian Blind) کی ایجنسی دلوائی ہے۔"

اس دن اشرف کو گھر پر نوکر کے ساتھ چھوڑ کر میں بازار آئی تھی۔ کل اشرف کی سالگرہ ہے۔ مجھے اس کے لئے کچھ پھول خریدنے ہیں۔ اشرف خزاں کی پیداوار ہے۔ خزاں کے موسم میں پھولوں کی قیمتیں آسمان کو چھونے لگتی ہیں۔ مجھے کچھ خاص پھول چاہئیں جو خاص بھی ہوں اور ہماری آمدنی کے مطابق بھی۔ وہ پھول مجھے کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ آخر کار مجھے دوسری طرح کے پھولوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے جس سے مجھے اطمینان نہیں ہوتا مگر میرے پاس کوئی چارہ بھی نہیں۔ مجھے لگتا ہے میں اشرف کے ساتھ بے ایمانی کر رہی ہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ میرے پرس میں پیسہ نہیں ہے۔ مگر ہر چیز کی اپنی قیمت ہوتی ہے۔ آپ پیڑ کی قیمت پر پھل نہیں خرید سکتے۔

میں پھولوں کو تھامے ہوئے نیو مارکیٹ کے فلاور رینج سے نکل کر چورنگی کے فٹ پاتھ پر ٹیکسی کا انتظار کر رہی ہوں۔ سامنے سڑک پر گاڑیاں دوڑ رہی ہیں۔ گاہے گاہے کوئی کار یا مسافر بردار ٹیکسی سگنل کی روشنی پر رکتی ہے تو بچے بوڑھے پھول اسٹرابیری اور پلاسٹک کے کھلونے اٹھائے ان کی کھڑکیوں کی طرف لپکتے ہیں مگر ان سے بچنے کے لئے ان گاڑیوں کے زیادہ تر شیشے چڑھے رہتے ہیں یا فوری طور پر چڑھا دئے جاتے ہیں۔ میرے سامنے سے ان گنت خالی ٹیکسیاں گذر جاتی ہیں مگر میرے ہاتھ دینے پر کوئی نہیں رکتی۔ اس شہر میں ایسا کبھی کبھار ہو جایا کرتا ہے جس کا کوئی جواز آپ کو دکھائی نہیں دیتا۔ میں بس کی سواری کے بارے میں سوچتی ہوں۔ مگر یہ پھول غیر منظم مسافروں کی بھیڑ میں کچل جائینگے اور پھر بس سے اتر کر مجھے اچھا خاصا سفر رکشا پر بھی طئے کرنا پڑے گا جو لوگوں کو مصیبت میں دیکھ کر کرایہ آسمان تک اونچا اٹھا دیتے ہیں۔ میں تھک کر ایک کھمبے سے ٹیک لگائے اس ٹیکسی کا انتظار کرتی ہوں جو میری قسمت میں لکھی ہو جب کوڑھ کا مارا ایک بھکاری میرے سامنے اپنی سڑی گلی انگلیاں پھیلا دیتا ہے۔ یہ زائل شدہ انگلیاں اس کی آمدنی کا خاص ذریعہ ہیں۔ یہ وہ ہتھیار ہیں جن کی مدد سے وہ سفید فام غیر ملکیوں میں دہشت پھیلا کر ان سے بھیک وصولنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ انگلیوں کے زخم مصنوعی ہیں۔ مگر ہمیشہ کی طرح مجھے ان انگلیوں سے کوئی کراہیت نہیں ہوتی۔ کیا یہ اشرف کے

سبب ہے؟ میں کھمبے سے الگ ہو کر چلنے لگتی ہوں اور تھوڑی دور جا کر ایک جگہ پھر سے فٹ پاتھ پر ٹھہر کر آسمان کی طرف تاکتی ہوں جس میں ایک نارنگی کے رنگ کا اشتہاری بیلون ڈول رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے سڑک بالکل سنسان ہوگئی ہے، اس پر کسی بھی رخ سے کوئی گاڑی نہیں آتی۔ اور جب کہ مجھے اپنی تنہائی کا ایک عجیب احساس کھا رہا ہے جیسے یہ کائنات انسانوں سے خالی ہوگئی ہو، جانوروں سے بھری ایک دقیانوسی وین میرے سامنے آ کر رک جاتی ہے۔ وین کے سامنے کا دروازہ کھلتا ہے اور اس سے ایک شخص ایک جانور کی زنجیر تھامے برامد ہوتا ہے۔ یہ عجیب وغریب جانور فوراً میری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اس کا جسم بھیڑ کی طرح بالوں سے ڈھکا ہوا ہے، اس کی چونچ بطخ کی چونچ کی طرح کشادہ، دبیز اور کافی مضبوط ہے، پیر اور پنجوں کے ناخن کسی بھالو سے مشابہ ہیں، دم کتے کی طرح درانتی کی شکل میں اوپر کی طرف اٹھی ہوئی ہے، اور اس کی آنکھیں چوزوں کی آنکھوں کی مانند بیضوی، بے جان اور زرد ہیں جیسے وہ کسی بھی چیز کو نہ تاک رہی ہوں۔

''عجیب جانور ہے یہ۔ لگتا ہے بہت سارے جانوروں کا مرکب ہے۔'' میں حیرت سے اس کی طرف تاکتے ہوئے کہتی ہوں۔ ''میں نے ایسا جانور آج تک نہیں دیکھا۔''

''اسے خریدنا چاہوگی بی بی؟'' جانور کے مالک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ ایک لانبے قد کا دبلا پتلا انسان ہے جس نے سفید سوٹ، سفید ہیٹ اور سفید رنگ کے نوکیلے جوتے پہن رکھے ہیں اور آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ چڑھا رکھا ہے۔ اس کے ہونٹ گہرے شیڈ کی لپ اسٹک سے چمک رہے ہیں اور اس کے رخساروں پر زنانی میک اپ کا استعمال کیا گیا ہے۔ ''وہ ایک خاص جانور ہے۔ ہم نے اسے انسانوں کے جنگل میں پکڑا ہے اور یقین کیجئے یہ آسان کام نہ تھا۔''

''ہمارے گھر میں پٹ نہیں رہتے۔ وہ مر جاتے ہیں۔''

''یہ پٹ نہیں، یہ ایک خالص جانور ہے، بہت ہی سخت جان۔'' وہ اس کی پشت پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔ ''یہ ہر طرح کے مصائب جھیل سکتا ہے، ہفتوں بھوکا رہ سکتا ہے۔ یہ اپنے پہلے مالک کے لئے جلتے ٹائر کے اندر سے کودنے کا کرتب کیا کرتا تھا گرچہ اس کرتب کو بار بار دکھانے کے چکر میں ایک بار اس کے بال بری طرح جھلس چکے ہیں اور اس واقعے کا اثر اس کے مزاج پر بھی پڑا ہے۔''

''نہیں نہیں، میں اس جانور کا کیا کرونگی۔'' میں کہتی ہوں۔ ''یہ عجیب جانور میرے بچے کو اور بھی کنفیوز کر ڈالے گا۔ وہ تو ابھی صرف تین برس کا ہے۔''

مجھے نہیں معلوم میں نے اس کی ذہنی عمر کیوں بتائی تھی!

''مجھے افسوس ہے محترمہ۔'' وہ تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے کہتا ہے۔''میں خود اسے بیچنا نہیں چاہتا مگر آپ کو دیکھ کر جانے کیوں مجھے لگا اس پر مجھ سے زیادہ آپ کا حق ہے۔''

''اس کی کیا قیمت رکھی ہے تم نے؟'' میں بادل ناخواستہ پوچھ بیٹھتی ہوں۔ شاید اشرف کے لئے یہ عجیب جانور ایک نیک فال ثابت ہو۔

''قیمت کی بات کس کافر نے کی ہے بی بی؟'' وہ کہتا ہے۔''اور اگر قیمت پسند نہ آئے تو کچھ دنوں کے بعد آپ اسے لوٹا بھی سکتی ہیں۔''

اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں وہ جانور کی زنجیر میرے ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔ جس کے ساتھ ہی سارے واقعات بالکل ہی ترتیب سے پیش آتے ہیں۔ اس کی انگلی اٹھتی ہے، اور سنسان سڑک پر جیسے عالمِ غیب سے ایک خالی ٹیکسی نمودار ہوتی ہے۔

ٹیکسی میرے سامنے آکر رک گئی ہے۔ اس کا پچھلا دروازہ کھلتے ہی جانور کود کر اندر بیٹھ جاتا ہے جیسے اسے اس کے لئے خاص ٹریننگ دی گئی ہو، اور میں اس کی زنجیر سے کھنچ کر جانور کے بغل میں بیٹھنے پر مجبور ہو جاتی ہوں۔ ابھی میں نے اپنے حواس پر قابو بھی نہیں پایا ہے کہ میں دیکھتی ہوں جانور کا مالک کار کی کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے جھکا ہوا اس کے شیشے کو جو تھوڑا سا نکلا ہوا ہے اپنی مٹھیوں سے تھامے میری آنکھوں میں تاک رہا ہے۔ مجھے یاد آتا ہے اور میں ایک کاغذ پر گھر کا پتہ اور ٹیلیفون نمبر لکھ کر اس کی طرف بڑھا دیتی ہوں جسے وہ جھجکتے ہوئے، جیسے اندر سے شرمسار ہو، اپنی لانبی پتلی انگلیوں کے بیچ تھام لیتا ہے۔

''اس جانور سے بہت جلد آپ کا بچہ مانوس ہو جائے گا۔'' کھڑکی سے ہٹ کر وہ کھڑا ہو جاتا ہے۔''اور مجھے یقین ہے ایک ہفتے کے بعد جب میں آپ کے دولت خانے پر حاضر ہونگا تو تب تک آپ لوگ اس کے اتنے عادی ہو چکے ہوں گے کہ واپس لوٹانے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیں گے۔''

//////////

ہماری عمارت کے دروازے پر متجسس تماشائیوں کی بھیڑ لگ چکی ہے۔ آس پاس کی عمارتوں کے دریچوں سے عورتیں اور بچے جھانک رہے ہیں۔ ان کے اندر کتے بھونک رہے ہیں۔

''عجیب جانور ہے یہ۔'' کوئی بھیڑ میں کہتا ہے۔ ''کون سا جانور ہے؟''

''یہ سب جانوروں کا مرکب ہے۔'' میں کہتی ہوں۔ ''انسان کی طرح۔''

دقیانوسی لفٹ کے اندر وہ فرمانبرداری کے ساتھ کھڑا ہے، یہاں تک کہ اپنی دم تک نہیں ہلاتا۔ لفٹ مین اپنے اسٹول پر بیٹھا ہوا خوف کے عالم میں لفٹ کی دیوار سے بالکل چپک گیا ہے۔ لفٹ سے نکل کر ہمیں چھت پر جانے کے لئے آخری کچھ سیڑھیاں جو لکڑی کی بنی ہیں پیدل طئے کرنی پڑتی ہیں۔ مگر جب میں اپنے فلیٹ میں داخل ہوتی ہوں تو اشرف اسے دیکھ کر اپنے کمرے میں چھپ جاتا ہے۔ میں اس کی زنجیر بالکنی کے جنگلے سے باندھ دیتی ہوں اور تب مجھے یاد آتا ہے میں نے تو جانور کے مالک سے پوچھا ہی نہیں تھا کہ وہ کھاتا کیا ہے؟ میں ایک کٹورے میں پانی بھر کر اس کے سامنے رکھ دیتی ہوں اور نوکر کو چنا بھگونے کے لئے کہہ کر کچھ بسکٹ طشتری پر سجا کر اسے پیش کرتی ہوں۔ کچھ دیر بعد آ کر میں دیکھتی ہوں جانور نے اسی دوران پانی کے کٹورے کو ٹھوکر مار کر الٹ دیا ہے اور اپنے دونوں بھاری بھرکم پیر سامنے کی طرف پھیلائے ہوئے اپنی دم پر بیٹھا ہے۔ تب پہلی بار مجھ پر کھلتا ہے کہ وہ ایک گندا جانور ہے اور اس کی جلد پر عجیب طرح کے بغیر آنکھوں والے سفید سفید کیڑے رینگ رہے ہیں جنھیں تنکے سے ہٹانے پر وہ بالوں کے اندر اس کی جلد سے اس طرح چپک جاتے ہیں جیسے اسی کا حصہ ہوں۔ وہ بسکٹ پر ایک لایعنی نظر ڈالتا ہے اور اپنی چونچ آسمان کی طرف اٹھا کر عجیب کرکش آواز نکالنے لگتا ہے، پھر سامنے کے پنجوں سے پچی کاری کے فرش کو کھرچنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کا تیزابی پیشاب فرش کو گیلا کر رہا ہے۔

''بی بی مجھے تو اس سے ڈر لگتا ہے۔ یہ آپ نے کیا اٹھا لایا؟'' مجھے اپنے پیچھے سے نوکرانی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس کی آنکھیں خوف سے امنڈی پڑ رہی ہیں۔

''چپ رہو، اور دیکھو اشرف کیا کر رہا ہے؟''

''وہ منہ تکیہ میں چھپا کر بری طرح رو رہا ہے۔''

''تو اسے چپ کراؤ۔'' میں بالکنی کی دیوار سے لگے اس عجیب الخلقت جانور کی طرف تاکتی رہتی ہوں جو دس منٹ پہلے کتنی خاموشی اور فرمانبرداری کے ساتھ میرے ساتھ چل رہا تھا۔ میں اس کا کیا کروں۔ میں نے سوچا، میرا شوہر گھر آنے پر اسے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھے گا۔ مگر

اس معاملے میں بھی وہ ایک عجیب آدمی ثابت ہوتا ہے۔ گھر لوٹنے پر وہ پہلی نظر میں ہی اس پر عاشق ہو جاتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ اس دانشمند انسان سے تھوڑی سی چوک بھی ہو گئی ہے کیونکہ اس کے بالوں سے ڈھکے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہی جانور اپنے نوکیلے ناخنوں سے اس کی ہتھیلی کی پشت کو کھرچ ڈالتا ہے۔ میرا شوہر چیخ کر ہاتھ ہٹا لیتا ہے۔ اس کے زخم سے خون رس رہا ہے۔

''وہ ایک خطرناک جانور ہے۔'' میں کہتی ہوں۔

''بالکل وحشی۔'' بیسن کے سامنے کھڑا وہ ایک روئی کے گالے پر ڈٹول انڈیل کر اپنا زخم دھو رہا ہے۔ اس کی جلد پر جانور کے کھرچنے کے نشان صاف نظر آ رہے ہیں۔ وہ انھیں بینڈ ایڈ سے ڈھک دیتا ہے اور واپس بالکنی پر آ کر جانور کی پیٹھ کو اسی ہتھیلی سے سہلانے لگتا ہے۔

''تمہیں ثابت کرنا ہے کہ تم ایک بہتر جانور ہو۔'' وہ جانور سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

''یہی تو وہ ثابت کرنا چاہ رہا تھا۔'' میں مسکرا کر کہتی ہوں۔

دوپہر تک میرے شوہر کو بخار آ جاتا ہے، وہ سردی سے کانپنے لگتا ہے۔ میں ایک ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔ وہ جانور کے بارے میں سنتا ہے اور اسے انسانی حیرت اور ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتا ہے۔

''ان کے خون کی جانچ ضروری ہے۔'' وہ کہتا ہے۔ ''فالحال بخار میں کمی آ گئی ہے۔ بہت بڑھ جائے تو SOS کے طور پر یہ گولی منگوا کر رکھ لیجیے گا۔''

مگر وہ ایمرجنسی کی دوا ہمیں استعمال نہیں کرنی پڑتی کیونکہ نفیس کی طبیعت اچانک سنبھل جاتی ہے۔

''میں اسے گھر سے باہر بھگا دیتی ہوں۔'' شام کے وقت میں کہتی ہوں۔

''نہیں۔ تھوڑا سا وہ ڈر گیا ہے، مگر میرا خیال ہے اشرف کو یہ جانور پسند آئے گا۔ دونوں کی فطرت بہت حد تک ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہے۔ شاید اشرف کے لئے ایسے ہی ایک پٹ کی ضرورت تھی۔ یہ تمہیں کہاں سے ملا؟''

گرچہ مجھے پتہ تھا نفیس نے شعوری طور پر یہ بات نہیں کہی تھی مگر جانے کیوں مجھے اس کی بات پسند نہیں آئی۔

''وہ پٹ نہیں، ایک خالص جانور ہے۔ اسے میں نے ایک جانوروں کے ٹریز سے

خریدا ہے۔‘‘میں کہتی ہوں۔’’اور اگر ہم اسے لوٹانا چاہیں تو اس نے ہمیں کچھ دنوں کا وقت دیا ہے۔‘‘

’’مجھے اس سے مل کر خوشی ہوگی۔ شاید اس جانور کے سلسلے میں ہم اس سے مزید جانکاری حاصل کر سکیں۔‘‘

میں اشرف کے کمرے میں جا کر دیکھتی ہوں وہ تکیہ کے نیچے سر رکھ کر گہری نیند سو رہا ہے۔ تکیہ اس کے سر سے ہٹا کر میں اس کے پسینہ میں ڈوبے ہوئے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک لوری گاتی ہوں جسے برسوں پہلے میں بھول چکی تھی، اور لوری ختم ہو جانے کے بعد دوبارا بھول جاتی ہوں۔

اس رات گھر کا سکون زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا۔ سونے سے قبل گھر کی روشنیاں بجھتے ہی وہ جانور چیخنے لگتا ہے اور اپنی طوطے کی طرح کرکش آواز سے گھر سر پر اٹھا لیتا ہے۔

’’اسے تیرگی نہیں بھاتی۔‘‘ میرا شوہر بالکنی کا بلب جلا دیتا ہے جس کے ساتھ ہی جانور چپ ہو جاتا ہے۔ میں دیکھتی ہوں بالکنی سے ایک عجیب بدبو آ رہی ہے۔ چونکہ نوکرانی اس کے قریب جانے سے ڈرتی ہے مجھے ہی بالکنی کو صاف کرنی پڑتی ہے۔ اس کا پیشاب اور اس کی نجاست کسی انسان سے ملتی جلتی ہے جس کی مجھے عادت ہے۔ میں جب اپنے مخصوص برش اور گیلے کپڑے سے ہمیشہ کی طرح ناک پر کپڑا لپیٹ کر پیشہ ورانہ مہارت سے بالکنی صاف کرتی ہوں تو اس کا چہرا عجیب ڈھنگ سے میری طرف اٹھا ہوا ہے جیسے اس کی آنکھوں کے اندر سے میرا بچہ جھانک رہا ہو۔ اس کی چونچ کھلی ہوئی ہے جس کے کونے سے رطوبت فرش پر ٹپک رہی ہے۔ میں اس سے فاصلہ رکھتے ہوئے اپنا کام کرتی رہتی ہوں۔ بعد میں ہم اسے چھت میں ایک کھلی جگہ پر باندھ دیتے ہیں۔

میں اس دن سے شدت کے ساتھ جانور کے مالک کا انتظار کرنے لگتی ہوں، مگر ایک ہفتہ گذر جانے کے بعد بھی وہ نمودار نہیں ہوتا اور اس کے بعد کئی ہفتے گذر جاتے ہیں اور ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اب ہم اس جانور کے ساتھ زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔ اسی درمیان نفیس کے ہات کا زخم ٹھیک ہو گیا ہے گرچہ کھرچنے کے نشان دائمی طور پر اس کی جلد پر رہ گئے ہیں۔

’’ہمیں اس کے لئے ایک پنجڑا بنانا چاہئے۔‘‘ ایک دن میرا شوہر کہتا ہے اور میں چونک پڑتی ہوں۔ پنجڑا؟ یہ بات اس کی فطرت سے مطابقت تو نہیں رکھتی۔ ’’کون جانے اگر

زنجیر اس کی گردن سے چھوٹ گئی تو وہ کسی کو بھی زخمی کر سکتا ہے۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے اپنا جواز پیش کیا۔

''ہم اس طرح کے معاملات سے پہلے بھی گذر چکے ہیں نا؟'' میں اس کا ڈھارس بندھانے کے لئے اشرف کا حوالہ دیتی ہوں جو اس جانور ہی کی طرح کبھی کبھار انتہا پسندی پر اتر آتا ہے۔ مگر مجھے اندر ہی اندر میرے شوہر کا مشورہ برا نہیں لگتا اور ہم ایک لوہار کے ذریعے چھت پر اس کے لئے ایک پنجڑا بنواتے ہیں۔ اب وہ پنجڑے کے اندر بیٹھا ہماری طرف تاکتا رہتا ہے۔ اس کے پنجڑے کو نجاست سے صاف رکھنے کے لئے ہر روز اسے پنجڑے سے باہر لانا پڑتا ہے اور یہ بہت ہی خطرناک لمحہ ہوتا ہے۔

''جانور کی فطرت!'' میرا شوہر کہتا ہے اور میں دیکھتی ہوں اس نے چمڑے کا ایک چابک خرید لایا ہے۔ پہلا چابک پیٹھ پر پڑتے ہی جانور حیرت سے ہماری طرف تاکتا ہے جیسے اس کی اسے امید نہ تھی۔ وہ اپنی زنجیر توڑ کر نکلنا چاہتا ہے مگر پے در پے چابک پڑتے رہنے پر وہ بلبلا کر سپر ڈال دیتا ہے۔ بہت جلد میرا شوہر اس پر چابک مارنے میں اچھی خاصی مہارت حاصل کر لیتا ہے جیسے وہ اسی چابک کے ساتھ پیدا ہوا ہو۔ بلکہ اب تو اس نے اسے چابک مار مار کر پچھلے دونوں پیروں پر کھڑے ہو کر چلنا بھی سکھا دیا ہے۔ مجھے لگتا ہے اسے اب اپنے اس کام میں لطف آنے لگا ہے کیونکہ اب بلاوجہ بھی اس نے اس پر چابک کا استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ شاید اس چابک کے سبب ہے کہ جانور اب ٹھیک سے کھانے پینے لگا ہے بلکہ اب کھانے پینے کی چیزوں میں وہ کوئی بھی تفریق نہیں کرتا۔ اس کے بالوں کے بیچ چابک کے نشانات صاف نظر آنے لگے ہیں۔ گاہے گاہے ہمیں اس کی مرہم پٹی بھی کرنی پڑتی ہے۔ مگر یہ عجیب واقعہ ہے کہ اس کے اندر جتنی وحشت کم ہوتی جا رہی ہے ہمارے بچے کے اندر اسی تناسب سے وہ بڑھنے لگی ہے۔ اسی دوران اس نے ٹی وی کو ڈھکیل کر نیچے گرا دیا ہے، بہت ساری کتابیں پھاڑ دی ہیں (گرچہ انھیں کھولے ہمیں عرصہ گذر چکا ہے)، تپائی کو سامانوں سمیت الٹ دیا ہے، اور اوون میں اپنا داہنا ہات ڈال کر اسے جلانے کی کوشش بھی کی ہے۔ میں اسے روکنے کے لئے اپنی انگلی پر اس کے دانتوں کے زخم کھا چکی ہوں۔ اس نے بستر کو پیشاب اور نجاست سے کچھ زیادہ ہی گندا کرنا شروع کر دیا ہے جیسے اس کے لاشعور میں اذیت کوشی کا کوئی جذبہ پل رہا ہو۔ مگر ہمیشہ کی طرح میں اپنے

شوہر کے ساتھ مل کر اسے سنبھال لیتی ہوں۔

''ماما پٹ، ماما پٹ۔'' وہ چلاّ تا رہتا ہے۔ آخر کار تھک کر ہم اسے اس عجیب الخلقت جانور کے پاس لے جاتے ہیں جس کی داہنی آنکھ چابک کی مار کھا کھا کر ٹیڑھی ہو گئی ہے۔ اس کا دل بہلانے کے لئے نفیس جانور کو پنجڑے سے نکال کر اس پر چابک برسانے لگتا ہے۔ ہمارا بچہ اسے چابک کھاتے دیکھ کر تالیاں بجانا شروع کر دیتا ہے اور ہم حیرانی سے دیکھتے ہیں کہ ان لمحوں میں وہ ایک بالکل نارمل انسان نظر آ رہا ہے۔

''پٹ ماما، پٹ، گھوڑا، ہپو، الیفنٹ...'' اشرف تالیاں بجاتے ہوئے چیخ رہا ہے۔

''اور ڈک'' میرا شوہر چابک سے جانور کی مقعد پر وار کرتا ہے۔ جانور کے بدن میں کپکپی دوڑ جاتی ہے۔ وہ پنجڑے کی تیلیوں کو پنجوں سے تھام کر پچھلے دونوں پیروں پر کھڑا ہے اور سماج کا ایک بہت ہی مظلوم انسان نظر آ رہا ہے۔

''منہ کھولو'' میرا شوہر چابک اٹھاتا ہے۔ وہ اپنی چونچ کھول دیتا ہے جس کے اندر ہم گوشت کا ایک ٹکڑا ڈال دیتے ہیں۔ اسے وہ فوراً نگل جاتا ہے۔ ان دنوں وہ بے چون و چرا سب کچھ نگلنے لگا ہے یہاں تک کہ ایک دن اشرف کے ہات سے وہ ایک ٹوتھ برش بھی کھا جاتا ہے۔ اس نے نجاست کے لئے ایک خاص وقت بھی مقرر کر لیا ہے اور رات کی تیرگی میں ہم اس کے منہ پر چمڑے کی ایک تھیلی کس دیتے ہیں جو اسی مقصد سے بنائی گئی ہے۔ اسے پہلے تو اس نے پنجڑے کی تیلیوں سے رگڑ رگڑ کر الگ کرنے کی کوشش کی تھی مگر پھر چابک کی مار کھا کھا کر اسے پہنے رہنا قبول کر لیا تھا۔

''اس رفتار سے وہ کچھ دن کے اندر بالکل تہذیب یافتہ ہو جائیگا۔''

''ہم انسانوں کی طرح۔'' میں مسکرا کر کہتی ہوں۔

''بالکل، بلکہ انسانوں سے بھی زیادہ۔''

ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ ہم نے اس جانور کو سدھا دیا ہے۔ اس جانور کے سبب ہمارا گھر ایک خاص گھر بن گیا ہے۔ پاس پڑوس کے لوگ اس جانور کو دیکھنا چاہتے ہیں، مگر ہم اس کی اجازت نہیں دیتے۔ ہم تو اس قابل بھی ہو گئے ہیں کہ اسے ہماری ضرورت کے مطابق آواز نکالنے پر مجبور کریں یا یا کسی پالتو کتے کی طرح ''ٹائگر سائلنس'' کہہ کر یکلخت خاموش کر دیں۔ کل

تک وہ جس کھانے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا آج اسے نفاست سے کھانا سیکھ گیا ہے۔ کاش، ہم سوچتے، اس کی طرح ہم اپنے بچے کو بھی ٹھیک کر پاتے جو پچھلے بیس برس میں ذرا بھی نہیں سدھرا۔ ایک دن، ہم دیکھتے ہیں کہ جانور اور ہمارا بچہ ایک جیسی آوازیں نکال رہے ہیں۔

''دونوں ایک دوسرے کو سمجھ پا رہے ہیں۔'' میرا شوہر کہتا ہے مگر مجھے پتہ ہے وہ صرف جانور کی نقل کر رہا ہے۔ ایک بار اشرف چابک اپنے باپ کے ہاتھ سے لے کر جانور کو مارنے لگتا ہے۔ زنجیر سے بندھا جانور اشرف کے طاقتور ہاتھوں سے چابک کی مار کھا کھا کر لہولہان ہو جاتا ہے مگر اس کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے تھک کر ہمارا بچہ اس رات گہری نیند سو جاتا ہے اور یہ ان چند نادر راتوں میں سے ایک ہے جب ہم دونوں بستر پر اپنی شہوانی بھوک بلا روک ٹوک کسی وحشی کی طرح مٹا پاتے ہیں۔

''تم ان پچیس برسوں کے بعد بھی ایک حیرت انگیز عورت ہو۔'' پسینے میں شرابور میرا شوہر میری گردن کو چومتے ہوئے کہتا ہے جہاں انزال کے وقت اس کے دانتوں کے کاٹنے کا نشان رہ گیا ہے۔ اپنی ٹانگوں کے بیچ کے گیلے پن کو محسوس کرتے ہوئے مجھے یاد آتا ہے کہ میں تو یہ بھول ہی چکی تھی

کہ میں ایک عورت ہوں۔

وہ خوبصورت رات گذر جاتی ہے مگر بہت ہی عجیب طور پر ہمارے اندر دبی ہوئی نفرت اور غصے کے سیفٹی والو* کو بھی کھول دیتی ہے۔

''اچھا ہوا کہ جانور کا مالک نہیں آیا۔'' صبح ٹوتھ برش کرتے ہوئے میں نفیس سے کہتی ہوں۔ وہ گہری نیند سو کر اٹھا ہے اور دوسرے دنوں کے مقابلے بہت پر سکون نظر آ رہا ہے۔ ''ہمیں شاید اسی جانور کی ضرورت تھی۔''

کیا یہ ہماری گفتگو کا نتیجہ تھا کہ دوسرے ہی دن جانور کا مالک آ دھمکتا ہے؟ وہ کافی خوش دکھائی دے رہا ہے۔ اس نے ایک نئی عینک لگا رکھی ہے جس کے کالے شیشوں پر بادل بنے ہوئے ہیں۔ ان بادلوں کے پیچھے اس کی آنکھیں کافی بڑی نظر آ رہی ہیں۔

''ہم اس جانور کی قیمت دینے کے لئے تیار ہیں۔'' میں ناخوشگواری سے کہتی ہوں۔ ہم اسے چائے کے لئے بھی نہیں پوچھتے۔ مگر وہ بہت ہی پر اسرار ڈھنگ سے مسکرا رہا ہے۔

''قیمت؟'' وہ کہتا ہے اور اس کے لپ اسٹک سے رنگے ہونٹوں کے بیچ اس کے سفید دانت اس بری طرح چمک اٹھتے ہیں جیسے وہ نقلی ہوں۔ ''قیمت کی بات آپ سے کس نے کی بی بی؟ میں تو اس سے زیادہ بہتر آفر آپ کو دینے والا ہوں۔ وہ جسے Once in a lifetime آفر کہتے ہیں''

اور مجھے خاموش دیکھ کر وہ سامنے کی طرف جھک کر کہتا ہے۔

''آپ کا بچہ!''

''شٹ اپ!'' میں چیخ پڑتی ہوں۔ ''کیا وہ کوئی جانور ہے جو میں تمہیں دونگی؟''

''یہ ہے نا حیرت انگیز، میں نے کہا صرف 'آپ کا بچہ' اور آپ نے اسے معاضے کے طور پر سوچ لیا کیونکہ یہ آپ کے ذہن میں پہلے سے موجود تھا۔ ہاں میں یہی آفر دے رہا ہوں جسے آپ ٹھکرا بھی سکتی ہیں۔'' اس کی خوش مزاجی میں ذرا سا بھی فرق نہیں آیا تھا بلکہ وہ اپنی دونوں ہتھیلیاں بھی مسل رہا تھا جیسے اندر ہی اندر کسی بات پر نادم ہو۔ ''میں جانتا ہوں آپ کا بچہ ایک انسان کا بچہ ہے مگر آپ کو یقیناً اس بات کا پتہ ہوگا کہ وہ اصل میں کیا ہے؟ آپ نے دیکھا ہوگا میرے جانور کو کتنی آسانی سے آپ نے بدل ڈالا ہے۔ مگر کیا اپنے بچے کو پچھلے بیس برس کی کوشش کے بعد بھی آپ بدل پائے؟ کیوں؟ کیونکہ آپ دونوں انسانی جذبات کے ہاتھوں مجبور تھے جو مجبوری میرے جانور کے ساتھ آپ کو کبھی پیش نہیں آئی۔ اسی لئے میں یہ آفر آپ کو دے رہا ہوں۔ میں ایک مہینے کے بعد پھر آؤں گا اپنا جانور لینے، اب یہ آپ کے ہاتھ میں ہے کہ آپ کون سا جانور دینا چاہیں گی۔''

وہ تیزی سے ہمارے ڈرائنگ روم سے نکل جاتا ہے۔ میں چھت کی چہار دیواری سے سر نکال کر دیکھتی ہوں وہ اسی وین میں جا کر بیٹھ رہا ہے جس میں طرح طرح کے جانور نما انسان اور انسان نما جانور بیٹھے ہوئے ہیں۔ وین کے گرد متجسس لوگوں کا ہجوم کھڑا ہے۔ اس دن میرے شوہر کے لوٹنے پر میں اس کے سینے سے لپٹ کر سسک سسک کر رونے لگتی ہوں۔

''ہم اسے اسکا جانور واپس کر دیں گے۔'' میرا شوہر میرے سر پر دلاسے کا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا ہے پھر وہ ڈاکٹر لانے چلا جاتا ہے کیونکہ اشرف نے اپنا جلا ہوا ہات پھر سے زخمی کر لیا ہے۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ ایک آہ بھر کر اشرف کی طرف تاکتا ہے۔

"بیس سال؟" وہ کہتا ہے۔ ہمیں پتہ ہے ہم دونوں ایک ہی چیز سوچ رہے ہیں، بیس سال، اشرف بیس برس کا ہو چکا تھا اور اتنے برس نہ ہم کہیں گھومنے گئے نہ ہم نے دوستوں رشتہ داروں کی تقریبات میں ٹھیک سے حصہ لیا بلکہ ہم نے تو کبھی کسی کو مدعو کرنے کی جرائت بھی نہیں کی۔ دوسری طرف مجھے اپنی نوکری چھوڑنی پڑی تھی کیونکہ اشرف کے لئے ہر پل گھر میں کسی نہ کسی آدمی کا رہنا ضروری تھا۔ وہ کوئی جانور تو نہ تھا کہ ہم اسے پنجڑے میں ڈالتے، اس پر چابک برساتے، اس کے منہ پر کپڑا باندھتے۔ ایک بار شروع کی طرف ہماری غیر موجودگی میں ایک نوکر (جسے ہم نے اس واقعے کے بعد کام سے نکال دیا تھا) اسے رسی سے باندھ کر سو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ کئی دنوں تک توڑ پھوڑ پر اتر آیا تھا۔ یہی وقت تھا جب ہم اسے Home بھی لے گئے جہاں اس طرح کے مریض رکھے جاتے تھے۔ مگر ایک ہفتے کے بعد جب ہم اس سے ملنے گئے تو اس کی حالت پہلے سے بھی ابتر ہو چکی تھی۔

"میں نے سنا ہے اس طرح کے بچے زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہتے۔" ایک دن میرے شوہر نے کہا تھا اور اس کے بعد ہم نے اپنی ساری محبت اس پر مرکوز کر دی تھی۔ مگر بیس برس کا ایک لمبا عرصہ گذر گیا تھا اور بیس برس کا عرصہ اور بھی لمبا ہو جاتا ہے خاص طور پر جب جنگ اتنی شدید ہو۔ اور اسی درمیان اشرف دن بدن زیادہ تندرست زیادہ کیم شحیم ہوتا چلا گیا۔ شاید اس طرح کے بچوں کے ساتھ قدرت دوسری طرح سے ہر کمی پوری کر دیتی ہے۔

"قدرت کے پاس کوئی انصاف نہیں۔" میرے شوہر نے رات کے حصے میں کہا جب کہ جانور کرکش آواز نکال رہا تھا کیونکہ ہم اس کا منہ باندھنا بھول گئے تھے۔ مگر اس وقت ہمارے اندر اتنی سکت نہ تھی کہ اتنی رات گئے جب کہ چھت کہرے میں ڈوبی ہوئی تھی پنجڑا کھول کر یہ کام انجام دیتے۔ "اتنے برس گذر گئے، ہم نے اشرف کی خاطر دوسرے بچے کے بارے میں بھی نہیں سوچا۔"

کیا ہم شکایت کر رہے تھے؟ تو کس سے؟

دوسرے دن دھوپ بہت دیر سے نکلی۔ مگر اس کے نکلتے ہی نفیس نے جانور پر رات بھر کے چلانے کا غصہ اس طرح نکالا کہ وہ پنجڑے کے باہر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ ہم نے اسکے منہ پر پانی مار مار کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ اشرف اسے دیکھ دیکھ کر تالیاں بجا رہا تھا، اس کی بھاری دم کھینچ رہا تھا۔ اس نے اس کے اوپر بیٹھ کر اس کی طرح کرکش آواز نکالنے کی بھی کوشش

کی۔لیکن آج ہمیں اسے دیکھ کر کوئی خوشی نہیں ہو رہی تھی۔اور گرچہ جانور دھیرے دھیرے ہوش میں آ گیا اور ہمارے اشارے کا انتظار کئے بغیر چپ چاپ پنجڑے کے اندر چلا گیا بعد میں اس کی مرہم پٹی کرتے وقت ہم اس کی آنکھوں سے گریز کر رہے تھے جیسے وہ کوئی جانور نہیں انسان ہو۔ چھت کے کونے میں اس کی چونچ سے نچی نچائی مرہم پٹیوں کا پہاڑ سا بن گیا تھا جس سے ایک عجیب بدبو آنے لگی تھی۔ہم نے اس کے لئے کسی ڈاکٹر سے گریز کیا تھا۔ہمیں لگا تھا اس کا علاج ہم کر سکتے ہیں۔اس دن کے واقعے کے بعد میں نے محسوس کیا میرے شوہر کا سلوک اس جانور کے ساتھ بدل گیا تھا، وہ نہ صرف اس کے ساتھ ہمدردی کے ساتھ پیش آنے لگا تھا بلکہ اسی تناسب سے اس نے اب اشرف کی طرف سرد مہری کا رویہ اختیار کر لیا تھا۔

''تم اشرف سے نفرت کرنے لگے ہو۔'' ایک دن میں نے اس سے شکایت کی۔

''جھوٹ ہے یہ۔'' اس نے جواب دیا۔''میں اشرف سے جتنا پیار کرتا ہوں اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتی۔مگر اس جانور کے اندر کی تبدیلی حیرت انگیز ہے۔ ہے نا؟''

مجھے پتہ تھا وہ جھوٹ کہہ رہا ہے، مگر میرے پاس اشرف کے دفاع کے لئے کوئی اسباب نہ تھے۔پچھلے بیس برس کی تھکن نے مجھے بھی آ لیا تھا۔اشرف کی نجاست سے اب مجھے بو آنے لگی تھی۔اس کے تھوکے ہوئے کھانے میرے بدن میں کپکپاہٹ پیدا کرنے لگے تھے۔اب نیند کے عالم میں اس کے بال اور ناخن کاٹنا، اس کی شیونگ کرنا مجھے اچھا نہ لگتا تھا، کپڑا پہناتے وقت اس کے ننگے پن سے میں گھبرانے لگی تھی کیونکہ (شاید میرے ہاتھوں کے لمس سے) اب وجہ بے وجہ اسے Erection بھی ہونے لگا تھا۔

''ہم لوگ دنیا کے سب سے دکھی انسان ہیں۔'' ایک دن میں نے اپنے شوہر کے سینے پر سر رکھ کر کہا۔میرے گرم آنسو اس کی پسلیوں پر اگے بالوں کے اندر جذب ہو رہے تھے۔''کیا ہمیں اور دوسرے لوگوں کی طرح خوش رہنے کا حق نہیں؟''

''بیس سال بعد یقیناً ہم اتنا تو سوچ سکتے ہیں۔'' اس نے جملہ ابھی پورا نہیں کیا تھا کہ ہمیں اشرف کی چیخ سنائی دی اور ہم دونوں اس کے کمرے کی طرف بھاگے۔اندر ہم نے جو منظر دیکھا اس نے ہمیں کراہیت سے بھر دیا۔اشرف پتلون گھٹنوں کے نیچے سرکائے کھڑا تھا اور مشت زنی میں مصروف تھا۔تلذذ کی انتہا پر پہنچ کر اس کی آنکھیں جل رہی تھیں، اس کے حلق سے

چیخنے اور غرانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ یکا یک اس نے ایک زور کی چیخ ماری اور اس کے بدن پتلون اور بستر پر مادہ منویہ کی برسات سی ہوگئی۔

''میں اسے صاف نہیں کرسکتی۔'' میں نے چیخ مار کر اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے دبائے ہوئے باہر بھاگتے ہوئے کہا۔ ''آخر میں ایک عورت ہوں۔ میں ایک عورت ہوں۔''

//////////

وہ اتوار کے دن نمودار ہوا تھا، تاکہ، جیسا کہ اس نے ہمیں بتایا، ہم دونوں میاں بیوی گھر پر موجود رہیں۔

''کہاں ہے میرا جانور؟'' اس نے ایک ہات میں زنجیر اور دوسرے ہات میں چمڑے کا چابک تھام رکھا تھا۔ اس نے ہم دونوں کو سرے سے نظر انداز کر دیا تھا۔ ہم دونوں سر جھکائے بیٹھے رہے۔ وہ گھر کے اندر گیا اور ہمیں چابک کی آواز کے ساتھ ساتھ جانور کے چیخنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ پھر وہ شور فرو ہو گیا اور وہ آدمی نمودار ہوا۔ اشرف اس کے پیچھے تھا۔ اس کی کمر سے زنجیر بندھی تھی اور اشرف دھندلی آنکھوں سے اس آدمی کی طرف تاک رہا تھا جیسے اسے ہم لوگوں سے کوئی مطلب نہ ہو۔

''یہ سودا مہنگا نہیں بی بی۔'' اس آدمی نے ہم دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ وہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ''میں جو جانور لے جا رہا ہوں اس سے ہمارا کوئی جذباتی تعلق نہیں جس طرح جو جانور میں چھوڑے جا رہا ہوں اس سے آپ لوگوں کا کوئی جذباتی رشتہ نہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں سودا واقعی برا نہیں۔ آپ کو اچھی طرح پتہ ہے یہ انتظام سب سے بہتر ہے بلکہ اس انتظام کے تحت زندگی زیادہ بہتر طریقے سے گذاری جاسکتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ کسی بھی دن اگر اس جانور سے جسے میں چھوڑے جا رہا ہوں اکتا جائیں تو کسی جانور کے ڈاکٹر کے پاس لے جا کر مہلک انجکشن کے ذریعے اسے ایک ابدی نیند سلا سکتے ہیں جس کی قانون کی طرف سے اجازت ہے، اور وہ اجازت نامہ بہت جلد بذریعہ ڈاک میں آپ کو بھجوا دوں گا یا اگر آپ بہت ہی کمزور ثابت ہوئے تو کسی بھی سڑک پر یا کسی پبلک پارک کے اندر اسے چھوڑ کر پیچھا چھڑا سکتے ہیں۔ اس طرح کے جانوروں کی ہمارے سماج کو ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔''

ہم چھت پر کھڑے انہیں نیچے سڑک سے گذرتے دیکھتے رہے۔ اشرف اس کے پیچھے

پیچھے اپنی کمر سے بندھی زنجیر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے، سر جھکائے وفاداری سے ننگے پاؤں چل رہا تھا۔ سڑک کے بیچوں بیچ ایک پل کے لئے وہ رک کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا مگر پیٹھ پر چابک کی مار پڑتے ہی دوڑتا ہوا گاڑی تک گیا جس کا پچھلا دروازہ ایک عجیب وغریب ہاتھ نے نمودار ہو کر کھول دیا۔

اس وین کے اندر ہمیشہ کی طرح بہت سارے انسان نما جانور اور جانور نما انسان بیٹھے ہوئے تھے۔

(safety valve*)
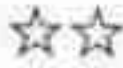
پری اور کلرک

پچھلے بیس برس سے، یا پھر یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا جب سے اس نے اسے پہلی بار دیکھا تھا
وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا۔
اس نے اسے پہلی بار دیکھا تو وہ اپنے باپ کی انگلی تھامے کھڑا تھا جب کہ وہ سفید گنبد پر کھڑی سنہرے آسمان کی طرف تاک رہی تھی۔ شہر کی کثافت کے سبب اس کا رنگ کمہلا گیا تھا مگر بار بار اسے دیکھتے رہنے پر اب ایسا لگنے لگا تھا جیسے اپنی بلندی کے سبب وہ ہر وہ رنگ اپنا لینے پر قادر ہوگئی تھی جو آسمان سے اسے ودیعت ہوتی۔ دھوپ میں، بارش میں، چاندنی رات میں، ہر زاویئے سے، ہر فاصلے سے وہ اسے دیکھتا آیا تھا یہاں تک کہ اب وہ اسے نہ دیکھ کر بھی دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔
"کبھی جب اس کی چول سلامت تھی، یہ ہوا کے دباؤ سے چکر لگایا کرتی تھی۔" ایک دن جب وہ فوارے کے سامنے کھڑا ایک ٹک اسے تاک رہا تھا ایک غیر معمولی طور پر لمبے شخص نے جھک کر اس کے کان کے اندر سرگوشی کی۔ وہ شاید کوئی پنشن یافتہ سرکاری ملازم تھا جو وقت کاٹنے کے لئے پارک میں آنکلا تھا۔ وہ ایک حیرت انگیز بوڑھا تھا۔ وہ نہ صرف سرتاپا سفید پوش تھا بلکہ اس کے بال، بھویں، جوتے اور عینک کے فریم تک سفید تھے۔ اس نے ایک سفید چھتری تھام رکھی تھی اور ایک سفید رنگ کا کتا اس کے سائے میں کھڑا دم ہلا رہا تھا جس کی سفید زنجیر اس کے دوسرے ہات میں تھی۔ "مگر اب اس کے کل پرزے زنگ کھا کر سخت ہو گئے ہیں۔" بوڑھے نے پٹے کو کتے کی گردن پر ٹھیک کرتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

''کیا اس کی یہی وجہ ہو سکتی ہے؟''

''تو تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ تمہارا خیال ہے اس نے اپنی مرضی سے گردش کرنا بند کر دیا ہے؟'' سفید پوش نے دونوں ہاتھوں سے چھڑی پر اپنے جسم کا بوجھ ڈال کر ڈولتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنی دودھ کی طرح سفید بھووں والی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں۔ ''معاف کرنا، یہ تو عجیب بات ہے۔ میں حقیقت بیانی سے کام لے رہا ہوں اور تم ہو کہ کچھ اور کہنا چاہتے ہو۔''

''کیا حقیقت وہی ہے جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اپنے حواسِ خمسہ سے محسوس کرتے ہیں؟ میں اسے پچھلے بیس برس سے دیکھتا آ رہا ہوں اور میرا دل کہتا ہے معاملہ کچھ اور ہے۔''

''کیا معاملہ ہے؟'' اجنبی کے ہونٹ حیرت سے کھل گئے، پھر ''عجیب بات ہے'' کہتے ہوئے وہ اپنے کتے کو زنجیر سے کھینچتا ہوا پیڑوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔ پانی کے حوض کے کنارے سنگ مرمر کی دو رویہ مورتیوں کے درمیان چلتے ہوئے وہ خود بھی کوئی سفید مورتی ہی نظر آ رہا تھا جس میں اچانک جان پڑ گئی ہو۔ اسے جانے کیوں اس شخص کے لئے افسوس ہونے لگا۔ گرچہ وہ ابھی جوان تھا مگر اسے پتہ تھا ایک لمبی زندگی گزارنے کے بعد انسان کتنا اکیلا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی دیر تک وہ بینچ پر اکیلا بیٹھا پری کو تکتا رہا جس کے فلزی رخسار آسمان کی سرخی کے سبب دمک اٹھے تھے۔ اسے لگا وہ اس کے بارے میں جانتی ہے۔ پھر وہ سر نیچا کر کے اس سے مخاطب کیوں نہیں ہوتیں؟

دھیرے دھیرے پارک کی روشوں پر لوگ کم ہونے لگے۔ لان میں مخصوص فاصلوں پر کھڑی ایک گم شدہ دور کی یادگار مورتیاں دھندلی ہونے لگی تھیں۔ کہیں قریب سنتری کی سیٹی سنائی دی اور اس نے ایک آہ بھر کر پری کو دیکھا، اس کے سر پر تارے روشن ہونے لگے تھے۔

//////

وہ جس سرکاری دفتر میں ملازم تھا وہاں سینکڑوں افراد اسی کی طرح بغیر کام کئے تنخواہ لیا کرتے اور وقت گذاری کے لئے راہداریوں میں بھٹکتے رہتے یا اپنے ہم منصبوں کی چائے پیتے۔ افسروں کی اس سے کام کروانے کی ساری کوششیں ناکام ہو چکی تھیں اور آخر میں اسے ایک ایسی جگہ پھینک دیا گیا تھا جہاں بیٹھ کر مکھیاں مارنے کے علاوہ اور کوئی کام نہ تھا۔ اس انتظام سے، نہ صرف وہ خوش تھا بلکہ اس نیم تاریک کمرے میں گرد سے اٹی فائلوں کے بیچ بیٹھا کھڑکی سے باہر

تاکتے ہوئے اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ اس دنیا کا واحد صحیح انسان ہے جسے صحیح جگہ بھیجا گیا ہے۔
یہ تاریک کمرا عمارت کی آٹھویں منزل پر واقع تھا جس کی واحد کھڑکی کو فائلوں کے ایک ریک نے نصف ڈھک رکھا تھا۔ اس کھڑکی سے ایک فرلانگ دور ایک برسوں سے بند پڑے کارخانے کی اینٹوں والی فلک شگاف چمنی نظر آتی جس کی دیواروں کے خارجی حصوں کو طفیلی پودوں نے ڈھک رکھا تھا۔ اس کی تاج نما چوٹی پر چیل کے ایک جوڑے نے گھونسلا بنا رکھا تھا۔ کبھی کبھی اسے یہ سوچ کر حیرت ہوتی کہ انسان اشرف المخلوقات اس قابل بھی نہیں کہ ان چیلوں کی طرح پر پھیلا کر اڑ سکے۔ کاش اس کے پر ہوتے! وہ کتنی آسانی سے اس بگل بردار پری کے پاس پہنچ جاتا اور ''ہو'' کر کے اسے چونکا دیتا۔

ایک دن اس نے ریک پر سجی فائلوں میں سے ایک کو کھینچ کر باہر نکال لیا اور اسے کھول کر دیکھنے لگا۔ فائل دھول سے اٹی ہوئی تھی۔ یہ ایک جھاڑو دار منشارام کی پنشن کے کاغذات تھے۔ وہ لائم اسٹریٹ میں رہا کرتا تھا اور اگر آج زندہ ہوتا تو اس کی عمر ۹۲ برس کی ہوتی۔ یہ پنشن کی وہ فائلیں تھیں جن پر کام ختم ہو چکا تھا اور اب وہ اس کمرے میں ڈھیر کر دی گئی تھیں۔ شروع شروع میں رجسٹروں میں ان کا اندراج ہوتا ہوگا مگر اب یہ کام بھی کئی برسوں سے بند پڑا تھا۔ اس نے ایک دوسری فائل نکال کر دیکھا۔ یہ بھی ایک پنشن کی فائل تھی۔ اس فائل کے آدمی کی عمر بھی نوے برس کے آس پاس ہوتی اگر وہ آج زندہ ہوتا۔ اس فائل کو اس نے آخر صفحے تک کھنگال ڈالا، پھر ایک دوسری فائل کی ورق گردانی میں مشغول ہو گیا۔ یہ ان افراد کی فائلیں تھیں جن کے کیئر ٹیکر کے طور پر اسے وہاں رکھا گیا تھا۔ اسے اپنی اس نئی شناخت پر بڑی حیرت ہوئی اور اس دن سے یہ اس کا روز کا مشغلہ بن گیا۔ وہ ہر روز ناک پر رومال لپیٹ کر فائلیں نکالتا، انھیں پڑھتا اور ان لوگوں کے بارے میں سوچتا رہتا، ایک انسان جو دہائیوں پہلے اس شہر میں پیدا ہوا، اس کی سڑکوں پر بڑا ہوا، جس نے شادی کی، بچے پیدا کیے، زخم کھائے، خوشیاں دیکھیں، گناہ کیے، عبادتیں کیں اور گلی گلی گھوم ...اس شہر سے غائب ہو گیا جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ ان میں سے کسی کسی کی ایک آدھ تصویر ان کے عزیز و اقارب کے پاس بچی ہوں گی یا حافظے کی دیوار پر پیلی پڑتی جا رہی ہوں گی۔ واقعی ہم میں سے ایسے کتنے لوگ ہوں گے جنھیں تین چار پشت قبل اپنے اجداد کے بارے میں سوائے ان کے ناموں کے کچھ اور معلوم ہو؟ بلکہ زیادہ تر لوگ تو ان کے نام بھی بھول

چکے ہوتے ہیں۔

اس دن سے وہ کمرا اسے ایسا لگنے لگا جیسے ہزاروں افراد کا مسکن ہو جو ان فائلوں کے اندر سانسیں لے رہے ہوں۔ اس نے یہ بات پری کو بھی بتائی جو گنبد پر اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑی اس جیٹ پلین کو تاک رہی تھی جو نیلے آسمان پر دھویں کی ایک دہری لکیر کھینچتا گذر رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کا ایک ہات اوپر کی طرف اٹھا ہوا تھا جس سے اس نے ایک بگل تھام رکھا تھا۔

''ان تمام لوگوں نے جو آج دنیا میں نہیں ہیں تمہیں دیکھا تو ہوگا؟ یہ ہے نا حیرت کی بات کہ تم اپنی جگہ کھڑی رہتی ہو اور انسان مٹی بن جاتے ہیں۔ شاید ان میں سے کچھ لوگوں نے تمہیں گردش کرتے بھی دیکھا ہو اور ممکن ہے کہ ان میں ایسے لوگ بھی ہوں جنھوں نے تمہیں اس وقت دیکھا ہو جب تم پہلی بار اس عمارت کے گنبد پر لا کر کھڑی کی گئی تھی۔''

ایک دن میز پر بیٹھے بیٹھے وہ بہت پریشان دکھائی دیا۔ دراصل فائلوں کا مطالعہ کرتے کرتے اچانک اسے خیال آیا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب اس کمرے میں اس کے نام کی بھی ایک فائل ہوگی جب اس کے جسم کو کیڑے ٹھکانہ لگا چکے ہوں گے۔ اس دن بھی پری اسی طرح بگل تھامے اپنی جگہ کھڑی رہے گی۔ اس نے فائل بند کر دی اور اسے واپس ریک پر سجا کر کھڑکی سے باہر تاکنے لگا۔ اسے شہر کے اسکائی لائن کے اوپر پھیلے بے رنگ آسمان کو تاکتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کیا اس کی زندگی کی پوری کہانی صرف اس لائق ہے کہ ایک گرد سے اٹی فائل کے اندر بند کر دی جائے اور پھر وہ فائل خود بھی کیڑوں کی خوراک بن کر رہ جائے اور پھر ایک دن اسے ردّی کاغذات کے ساتھ جلا دی جائے۔

وہ ایک چھوٹے سے مسلم بنگالی خاندان کا فرد تھا جس کا ہر ممبر اپنی ایک خاموش زندگی جی رہا تھا۔ دو برس پہلے اس کے بڑے بھائی نے خودکشی کی تھی مگر آج تک لوگ اس کی وجہ سمجھ نہ پائے تھے۔ اس کی بھابھی اپنے دونوں بچوں کے ساتھ اس گھر کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے جا چکی تھی۔ اس کے باپ نے اسے روکا نہیں تھا۔ اس کی ماں نے شروع میں ایک دو بار اس سے شادی کے لئے ضرور ضد کی تھی مگر اب وہ بھی خاموش ہو چکی تھی۔ آفتاب مسجد لین میں جہاں وہ رہتا تھا اس طرح کی ویران زندگیوں سے گھر آباد تھے۔ اس علاقے کی سنسان گلیوں میں صرف گداگروں یا ہاکروں کی آوازیں شاذ و نادر خاموشی کو توڑ دیتیں یا کبھی کوئی بلّی کسی دیوار سے گذرتے

وقت اپنی ہلکی سی مخدوش میاؤں کے ساتھ غائب ہو جاتی۔

''ہم اس دنیاں میں تنہا دکھی انسان نہیں ہیں'' اس دن آفس جانے سے قبل بھات کا نوالہ بناتے ہوئے اس نے ماں سے کہا جو اس پر تاڑ کا پنکھا جھل رہی تھی۔ گذشتہ کئی دنوں سے بار بار بجلی جا رہی تھی۔ ''اس آسمان کے نیچے لوگ کہیں بھی چلے جائیں ہر جگہ ایک ہی طرح کی کہانی ہے۔ پھر بھی جانے کیوں ماں تم اس طرح میری طرف تاکتی ہو تو میرا دل ڈوب جاتا ہے۔''

''تم اپنے باپ کو ECG کرانے کب لے جا رہے ہو؟''

''میں نے کہا تھا نا ان ڈاکٹروں کے چکّر میں پڑنا ٹھیک نہیں۔'' اس نے آخری نوالہ حلق سے نیچے ڈھکیلتے ہوئے کہا۔ ''وہ ملک الموت کے کارندے ہیں جو زمین پر بھیجے گئے ہیں۔''

//////

پھر بھی سنیچر کے دن جب اس کی چھٹی تھی وہ اپنے باپ کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اسے باہر کے کمرے میں ایک صوفے پر بٹھا دیا گیا اور جب پردے کے پیچھے ایک ٹکنیشین اس کے باپ کے جسم پر الیکٹروڈس لگا رہا تھا تو اس نے رسپشنسٹ کو دیکھا جو کاؤنٹر پر بیٹھی پچھلے دنوں کی رپورٹ کمپائل کر رہی تھی اور بیچ بیچ میں فون بھی ریسیو کرتی جاتی۔ اسے اس لڑکی کا چہرا بہت حد تک بگل بردار پری کے چہرے سے مشابہ نظر آیا۔ (کہیں اس کی آنکھیں چیزوں کو ایک ہی ڈھنگ سے دیکھنے کی عادی تو نہیں ہوتی جا رہی ہیں؟)

''اس سے پہلے کبھی ان کے سینے میں درد ہوا تھا؟'' پری نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھ لیا۔ وہ چونک پڑا اور اسے اس سوال پر حیرت ہوئی۔ عام طور پر ڈاکٹر یہ سوالات کیا کرتے ہیں۔

''مجھے نہیں پتہ۔ یہ پرانے زمانے کے لوگ اپنا بہت سارا درد چھپا لیا کرتے ہیں۔''

پری نے سر اٹھا کر پہلی بار اس کی طرف دیکھا۔

''کیا یہ عقلمندی کی بات ہے؟'' اس نے کہا

''مجھے کیا پتہ۔ ویسے پہلے کے مقابلے میں آج کا آدمی عقل زیادہ استعمال کرنے لگا ہے تو کیا اس سے اس کا درد کم ہو گیا ہے؟''

وہ مسکرا کر اپنا کام کرنے لگتی ہے۔

''آپ بابا ہمیشہ گھر پر بیٹھے رہتے ہو۔ کسی پبلک پارک میں جا کر ٹہلا کیوں نہیں

کرتے؟'' اس دن گھر جاتے وقت رکشا پر اس نے اپنے باپ سے کہا جسے ایک اسی برس کا چگی داڑھی والا بوڑھا ہانپتے ہوئے کھینچ رہا تھا۔

''وہاں ان دنوں بہت بھیڑ ہونے لگی ہے۔ بوڑھوں کی اتنی بڑی تعداد اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ میں گھر پر ہی ٹھیک ہوں۔''

''شاید شہر میں بیماروں کی تعداد بڑھنے لگی ہے۔'' آخری جملہ اس نے خود سے کہا تھا۔

آفس کھلنے پر اس نے ایک فائل ڈھونڈ نکالی جس میں ایک آدمی کی دھندلی تصویر چسپاں تھی۔ ناتھو پرساد، ۴۸ لٹو بابو لین، کلکتہ ۶۰۔ اس نے تصویر اکھاڑ کر اس کی پشت میں یہ تفصیل خشک پڑ چکی گوند کے اوپر ہی کسی طرح قلم سے لکھ ڈالی۔ ان فائلوں میں کہیں کوئی ڈیتھ سرٹیفکٹ نہیں لگی تھی۔ مردے ڈیتھ سرٹیفکٹ نہیں دیا کرتے یا شاید وہ کسی اور فائل کے اندر ہو۔ جب لوگ پنشن لینا بند کر دیتے ہوں گے، بینک کی اطلاع پر یہ فائل خود بخود کسی افسر کے نوٹ کے ساتھ یہاں پہنچ جاتا ہوگا۔ تصویر کو جیب میں ڈال کر وہ دیر تک کمرے کے اندر فائلوں کے ریکس کے درمیان ٹہلتا رہا۔

اسے اس آدمی سے کیا کام تھا جو اس دنیا میں اب موجود نہ تھا؟ وہ کیا مشن تھی جس کی خاطر وہ ان گم شدہ پرچھائیوں کا پیچھا کر رہا تھا؟

سنیچر کے دن جب آفس میں چھٹی تھی وہ گھر سے نکلا تو اس کے قدم خود بخود لٹو بابو لین کی طرف اٹھ گئے۔ گرچہ آج اسے اپنے باپ کی رپورٹ بھی لینی تھی مگر اس کے لئے اس کام کی اہمیت زیادہ تھی۔

لٹو بابو لین ایک اندھی گلی تھی جس میں بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ تین اطراف سے بند ہونے کے سبب لڑکوں کے چلانے کی آواز گلی میں گونج رہی تھی۔ یہاں عمارتوں کی دیواروں پر لگے شکستہ ڈرین پائپ دیواروں پر رستے ہوئے زیر زمین نالوں کے اندر جا رہے تھے۔ ۴۸، لٹو بابو لین؟ لڑکوں نے کھیل روک کر ایک نئی عمارت کی طرف اشارا کیا جس پر ابھی پلستر نہیں چڑھا یا گیا تھا اور جو حال ہی میں کسی پرانی عمارت کو توڑ کر آس پاس کی عمارتوں سے بالکل سٹا کر غیر قانونی طور پر اٹھائی گئی تھی۔ اس عمارت کے سارے کرایہ دار نئے تھے اور ناتھو پرساد نام کے کسی آدمی کو کوئی نہیں جانتا تھا۔

ہوسکتا ہے جب وہ زندہ تھا تو پرانی عمارت میں کسی دوسرے آدمی کے پتے پر رہ رہا ہو۔ کلکتہ میں لاکھوں افراد اس طرح C/o کی زندگی گزار کر مر جاتے ہیں، اس زمین پر ان کے نام کی تختی کبھی نہیں لگائی جاتی۔ اسے مایوسی ہوئی۔

''رپورٹ کچھ خاص بری نہیں، پھر بھی آپ ڈاکٹر سے مل لیجئے۔'' پری نے رپورٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ جانے کیوں آج وہ اس سے آنکھیں چرا رہی تھی۔ ڈاکٹر ایک بہت کم عمر کا لڑکا تھا۔ اس نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارا کیا۔

''آپ کے پتا جی کو تھوڑی سی دھوپ اور چڑیوں کی چہچہاہٹ کی ضرورت ہے۔'' اس نے رپورٹ کا مطالعہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تھوڑا سا پرابلم تو ہے مگر دوا کا استعمال کرتے رہنا پڑے گا۔ اس عمر میں یہی پریشانیاں ہیں جو جینے کا سہارا بنتی ہیں۔''

''میں آپریشن سے ڈر رہا تھا۔''

''اس عمر میں آپریشن سے فائدہ صرف سرجن کو ہی پہنچتا ہے۔'' ڈاکٹر نے پریسکرپشن اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اور آپ اتنے سنجیدہ کیوں نظر آرہے ہیں؟''

''شاید مجھے سنجیدہ رہنا پسند ہو۔''

''یہ آپ کی صحت کے لئے اچھا نہیں، اور آپ کے باپ کے لئے تو بالکل ہی مضر ہے۔ لوگ اپنی اولاد کو ہمیشہ مسکراتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''چاہے اولاد کے پاس مسکرانے کی کوئی وجہ ہو یا نہ ہو؟''

''بالکل'' ڈاکٹر نے اپنی کرسی پشت کی طرف ڈھکیل کر دونوں ہتھیلیوں کو گردن کی پشت پر لے جا کر اس کی طرف غور سے دیکھا۔ ''جس دن اس دھرتی پر آخری انسان مسکرانا بھول جائے گا اس دن سے یہ سورج نکلنا بند ہو جائے گا۔ کسی کو یقین آئے یا نہ آئے مجھے تو اس پر یقین ہے۔ اچھا، پندرہ دن بعد آکر خبر دیجئے گا۔''

واپسی پر وہ اس کم عمر ڈاکٹر کے بارے میں سوچتا رہا جو اسے ڈاکٹر کم اور شاعر زیادہ لگا۔ عجیب آدمی تھا، بلاوجہ مسکرانا کیسے ممکن ہے جیسے جوکر کی طرح آدمی اپنا چہرا رنگ لے! اس نے اپنے باپ کو دوائیاں دیتے وقت ان باتوں کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے باپ نے اس خبر پر کہ اس کا دل کچھ زیادہ بری حالت میں نہیں ہے کوئی خاص دلچسپی نہیں دکھائی۔ مگر اس کی ماں خوش نظر آئی۔ اس دن

وہ دیر تک جائے نماز پر بیٹھی دعا مانگتی رہی۔

سوموار کے دن اس نے فائل سے ایک ایسا پتہ ڈھونڈ نکالا جو ایک متمول رہائشی علاقے کا تھا۔ نوارن بنرجی، وہ ایک بڑے عہدے سے فارغ ہوا تھا اور ہندوستان پارک ایسی جگہ تھی جہاں لوگ اپنے پیتوں پر زندگی گذارتے تھے۔

پارک کے باہر پیڑوں سے ڈھکے ہوئے سنسان راستے پر چلتے ہوئے اسے اپنی منزل ڈھونڈنے میں دقت نہیں ہوئی۔ یہ ایک اینٹ اور سرخی گارے کا بنا ہوا دو منزلہ پرانا مکان تھا جس کا دبیز ستونوں والا اونچا برامدا پھاٹک کے باہر سے نظر آ رہا تھا۔ پھاٹک پر انگریزی میں ''خوش آمدید، ہم کتے نہیں پالتے'' کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ برامدے پر کھڑے ہو کر اس نے سلاخوں والی قدِ آدم کھڑکی سے دیکھا، اندر دو بھاری بھر کم عورتیں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد پلنگ پر لیٹی قیلولہ کر رہی تھیں۔ بہت دیر کے انتظار اور گومگو کی کیفیت کے بعد آخر اس نے پھاٹک کے ستون پر لگی گھنٹی کی سوئچ دبائی۔ یہ نوارن کی بدھوا بڑی بہو تھی جس نے اس کے لئے پھاٹک کھولا تھا۔ خود وہ ساٹھ کے پیٹھے میں ہوگی۔ اس نے جب اپنے بارے میں بتایا تو اسے یہ دیکھ کر ایک خوشگوار حیرت ہوئی کہ گھر کے تمام افراد، عورت مرد اور بچے برامدے میں آ آ کر اسے دیکھ رہے تھے۔

''بابا کے بارے میں ہمیں کیا کرنا ہوگا؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' اس نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ ''میں تو صرف اپنے ذاتی تجسس سے مجبور ہو کر یہاں چلا آیا ہوں۔ میں ایک ایسے آدمی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا جس تک میری رسائی ایک فائل کے ذریعے ہوئی ہے۔''

''کیا جاننا چاہتے ہیں آپ؟''

''کچھ بھی۔'' اس نے کہا۔ ''کیا وہ خوش تھے؟ کیا ان کی خوشی کی وجہ صحیح تھی؟ اور اگر وہ خوش نہ تھے تو اتنی لمبی عمر کس طرح انھوں نے گذاری، کس طرح وہ تاریک دنوں سے گذرتے رہے، وقت کے سنگلاخ راستے پر ننگے پاؤں چلتے رہے؟''

''یہ تو انتہائی ذاتی قسم کے سوالات ہیں جن کا جواب بابا ہی دے سکتے تھے۔'' بوڑھی عورت نے جواب دیا۔ ''بظاہر وہ ایک گھریلو قسم کے انسان تھے۔ ہم لوگوں سے الگ ان کی اپنی کوئی زندگی نہ تھی۔

کبھی کسی کمی کا انھوں نے ذکر تو نہیں کیا، مگر آدمی کے اندر پھر بھی کچھ نہ کچھ رہ ہی جاتا ہے، جس پر صرف وہی روشنی ڈال سکتا ہے۔"

"آپ نے ٹھیک کہا۔ کیا میں یہ گھر دیکھ سکتا ہوں؟ لگتا ہے یہ گھر ان ہی کا بنایا ہوا ہے۔"

"ہم نے تھوڑی بہت تبدیلیاں تو کی ہیں، مگر پھر بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ گھر ان ہی کا بنایا ہوا ہے۔"

وہ لوگ اسے گھر کے اندر لے گئے۔ یہ ایک دومنزلہ متوسط بنگالی طبقے کا مکان تھا۔ اس کا فرش سرخ سمنٹ کا بنا ہوا تھا اور اتنے برسوں کے بعد بھی بے داغ نظر آرہا تھا، صرف دیواریں سالوں سال کے رنگ وروغن کے باوجود کھردری لگ رہی تھیں۔ گھر کے ایک ایک کمرے نے اپنے روشن دان، محرابی درازوں اور سلاخوں والے قدِ آدم دریچوں پر وقت کے گذرنے کے سارے نشانات ہو بہو قائم رکھے تھے۔ اسے اس گھر سے ملاقات کر کے خوشی ہوئی۔

"میں ممنون ہوں آپ نے مجھے اتنا وقت دیا۔"

"میرے پاس اب وقت ہی تو ہے جسے میں کسی کو دے سکتی ہوں۔" بوڑھی عورت نے مسکرا کر کہا۔ جانے کیوں اس عورت کے پان خوردہ سیاہ دانتوں سے اسے کوئی کراہیت نہیں ہوئی۔ اس دن وہ ہندوستان پارک کی صاف ستھری سڑک پر درختوں کے نیچے دیر تک ٹہلتا رہا۔ وہ خوش تھا۔ اس نے ماضی کی کال کوٹھری سے ایک قیمتی خزانہ برآمد کرلیا تھا۔ دوسرے دن آفس کے کمرے میں فائلوں کی طرف تاکتے ہوئے اسے ایک یک گونہ طمانیت کا احساس ہورہا تھا۔ یہ صرف دھول سے اٹے ہوئے کاغذات نہ تھے، یہ وہ زندگیاں تھیں جو اس شہر میں گذر چکی تھیں مگر ختم نہیں ہوئی تھیں بلکہ لوگوں کے حافظوں سے لے کر گھر کی دیواروں دریچوں بلکہ ان کے مال و اسباب سے لے کر شہر کی سڑکوں اور گلیوں کے اندر تک موجود تھیں۔ انسان اپنی موت کے ساتھ مر نہیں جاتا، وہ ایک بڑی کائنات کا حصّہ بن جاتا ہے جہاں ازسرِ نو اس کی تجدید ہوتی رہتی ہے اور پھر وہ دائمی طور پر زندہ رہتا ہے۔ صرف ہم اپنی کم نظری کے سبب انھیں دیکھ نہیں پاتے۔

اس اتوار وہ پری کی طرف تاکتے ہوئے یہی سوچ رہا تھا کہ وہ پنشن یافتہ سفید پوش بوڑھا جانے کہاں سے نکل آیا۔ وہ اسے پچھلے کئی ہفتوں سے لگاتار کسی نہ کسی بینچ پر دیکھتا آرہا تھا۔ آج اس نے اپنے ہات میں ایک سفید پنجڑا اٹھا رکھا تھا جس کے اندر ایک خرگوش بیٹھا ایک

پیلے رنگ کا گاجر کتر رہا تھا۔ اس نے بینچ میں اس کے پہلو میں بیٹھ کر اپنی عینک کے سفید فریم کے اندر سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ زندگی بھی ایک عجیب تماشہ ہے نا؟''

''کیسا تماشہ؟''

''ایک کارنیوال جس میں لوگ رنگے سیار کی طرح گھوم رہے ہیں۔''

''معاف کیجئے میں آپ کا مطلب سمجھ نہیں پایا۔''

''مجھے دیکھو، میں وقت سے اکتا گیا ہوں مگر موت میرے نصیب میں نہیں کیونکہ میں نے آبِ حیات پینے کی غلطی کی ہے۔'' بوڑھا کہہ رہا تھا۔ ''اور تم ایک ایسی پری کی محبت میں مبتلا ہو جس کے پاس دل نہیں ہے۔''

''آپ کو کیسے پتہ؟ اور یہ کس پری کی بات کر رہے ہیں آپ؟''

''وہ جو اس گنبد پر کھڑی ہے، وکٹوری کراؤن*، یہی کہتے ہیں نا لوگ اسے؟''

''وہ تو دھات کی بنی ہے۔ بھلا اس کے پاس دل کہاں۔''

''یہ تم اس لئے کہہ رہے ہو تا کہ اپنی کمزوری چھپا سکو۔ یاد رکھو یہ ایک پاگلپن ہے۔''

''مجھے آپ سے مطلب؟'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیوں آپ سے بات کر رہا ہوں؟''

اور وہ چلتا ہوا عمارت کے داخلے کے پاس واقع دفتر کے اندر داخل ہو گیا۔ دفتر سنسان پڑا تھا۔

افسر نے پردا ہٹا کر اندر آنے والے شخص کی طرف دیکھا اور اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ ''کیا چاہئے شریمان کو؟ آپ کو کس نے اندر آنے دیا؟''

''پری'' اس نے جواب دیا۔ ''...آپ لوگ اس کے لئے کچھ کرتے کیوں نہیں؟''

''کون سی پری؟''

''وہ جسے آپ گنبد پر رکھ کر فراموش کر چکے ہیں۔''

''کیا پاگلپن ہے۔ اس سے آپ کو کیا لینا؟''

''میں اسے اس لائق بنا سکتا ہوں کہ وہ پھر سے گردش کرنے لگے۔''

"آپ کوئی انجینئر ہیں؟ اسے غیر ملکی انجینئر تک دیکھ چکے ہیں۔ اس کا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔"

"نہیں۔" اس نے کرسی پر بلا اجازت بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں ایک کلرک ہوں۔ مگر میں اس پری کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ مجھے پتہ ہے وہ کیوں جامد کھڑی ہے۔ اسے کسی انجینئر کی ضرورت نہیں۔ اسے ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے، جو اس کے ساتھ بات کر سکے، جس کے سامنے وہ اپنا دل کھول کر رکھ سکے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ اتنی بلندی پر کھڑی ہے جہاں کوئی پہنچ نہیں سکتا۔"

افسر ایک ٹک اس کے چہرے کی طرف تاک رہا تھا۔ پھر اس نے میز پر رکھی گھنٹی دبائی اور اردلی کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر کہا۔

"اسے باہر کرو۔ کوئی پاگل لگتا ہے۔"

اردلی اسے کندھے سے پکڑ کر باہر لے جا رہا تھا جب اس نے کہا۔ "تمہارا افسر، وہ آخر کس بات کی تنخواہ لیتا ہے؟ اسے تو کسی بات کی پرواہ ہی نہیں۔"

"وہ بس ایسا ہی آدمی ہے۔" اردلی نے بات کو ختم کرنے کی غرض سے کہا۔ لان میں واپس لوٹ کر اس نے دیکھا سفید پوش شخص اپنی جگہ بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

"میں نے کیا کہا تھا" اس نے اسکے لئے جگہ بنانے کے لئے پنجرا کو بینچ سے اٹھا کر زمین پر رکھ دیا۔

"کیا کہا تھا؟"

"پاگلپن۔ ہمیں ہمیشہ اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ اب تمہیں دیکھ کر میرا بھی یہ یقین ہونے لگا ہے کہ اس پری کے اندر پھر سے زندگی لوٹ سکتی ہے، وہ دوبارا متحرک ہو سکتی ہے۔"

"کوئی راستہ؟"

"ایک پاگل کے لئے راستوں کی کمی نہیں۔ وہ چاہے تو کیا نہیں کر سکتا۔"

اس دن گھر لوٹ کر وہ اپنے کونے میں خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکنے کی کوشش بھی نہیں کی جس کے باہر ایک روشن دنیا پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی ماں کئی بار اس کے کمرے میں داخل ہوئی پھر واپس باورچی خانے کی طرف لوٹ گئی۔ وہ اس سے کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر اپنے اندر ہمت جٹا نہیں پا رہی تھی۔ ایک ردی کا غذ خریدنے والا اپنی تھیلی پیٹھ پر لادے گلی میں چلایا گیا جیسے وہ کوئی اساطیری کردار ہو جو شہر کی وارداتوں کا بوجھ اپنی پیٹھ پر اٹھائے ہوئے چل

رہا ہو۔اس نے بہت اوپر ایک کھڑکی کو دیکھا جو اور کھڑکیوں کے مقابلے زیادہ تاریک تھی۔اسے اس شہر میں دن دھاڑے اس طرح کی تاریک کھڑکیوں کو دیکھنے کی عادت تھی۔

//////

اس واقعے کے ٹھیک ایک ہفتے بعد بگل بردار پری نے چاند سے روشن آسمان سے سر نیچے کی طرف موڑ کر اس آدمی کی طرف دیکھا جو ایک تاریک روشن دان سے رینگ کر باہر آیا تھا اور گنبد کے نچلے حصّے سے چپکا ہوا اسے پکار رہا تھا۔

یہ آج ہی کا واقعہ تھا کہ یہ آدمی عمارت کے اندر سیاحوں کی بھیڑ میں گم ہو گیا تھا اور شام کے وقت جب عمارت کے سارے بھاری بھرکم دروازے بند کئے جا رہے تھے دیوار سے لٹکتے ایک جھالروں والے بڑے قالین کے پیچھے سے جس پر دو فوجیں جنگ سے پہلے آمنے سامنے صف آرا تھیں چھپ گیا تھا اور اب گنبد کی چکنی سطح پر چڑھنے کی کوشش میں بار بار پھسل رہا تھا۔اس کی اس حرکت کے سبب ہی پری اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔مگر پری کیا کرتی۔اس کے پیر نٹ بالٹ کے ذریعے گنبد کی چوٹی سے جکڑ دیے گئے تھے جو خود بھی زنگ کھا کر سخت ہو گئے تھے۔

اپنی کوشش میں بار بار ناکام ہوتے رہنے کے سبب اس کی آنکھوں میں آنسو نکل آئے ۔وہ اپنی پلکیں جھپک رہا تھا جب آنسو کے ان جھلملاتے قطروں کے اندر سے اس نے ایک سفید زینہ کو سرکتے ہوئے گنبد سے نیچے آتے دیکھا۔زینہ فرش سے لگ جانے پر ایک سفید پوش شخص اس سے اترتا نظر آیا۔یہ وہی پنشن یافتہ بوڑھا تھا جو باغ میں بینچ پر بلاضرورت بیٹھا رہتا تھا۔مگر اس وقت کتنا چاق و چوبند نظر آ رہا تھا!

''تم؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، میں، اور اب وقت آ گیا ہے کہ میں تمہیں بتاؤں کہ میں کون ہوں۔'' بوڑھے نے زینے کے آخری قدموں پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں خواجہ خضر ہوں اور میں لوگوں کو ان کی منزل تک پہنچنے میں مدد دیتا ہوں۔مگر صرف ان کو جو اپنی عقل کے غلام نہیں ہوتے۔اب تم اس سیڑھی کے ذریعے پری تک آسانی سے پہنچ جاؤ گے۔'' بوڑھے نے اپنا جملہ ختم کیا اور سیڑھی سے نیچے کود کر اسے تھام کر کھڑا ہو گیا۔ایک پل کے لئے وہ ہچکچایا پھر سیڑھی پر چڑھتا ہوا پری کے کندھوں تک پہنچ گیا۔اس نے دیکھا پری کی خوبصورت آنکھیں جاگ رہی تھیں۔

''تم بہت خوبصورت ہو۔'' اس نے داہنے کندھے پر احتیاط سے کھڑے ہو کر پری کی آنکھوں کو باری باری سے چومتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تمہارا اس طرح ہلے ڈولے بغیر کھڑے رہنا اچھا نہیں لگتا۔''

''ایک وقت تھا جب میں چاروں طرف گھوم گھوم کر اس دنیا کو دیکھا کرتی تھی اور میں بہت خوش رہا کرتی تھی ان دنوں۔'' پری کی آواز اس کے کانوں میں شکر گھولنے لگی۔ ''اور یہ وہ زمانہ تھا جب میرے چاروں طرف روشن دریچے کھلے ہوئے تھے اور آسمان قوسِ قزح کے رنگوں سے نہایا ہوا تھا اور میں جدھر بھی دیکھتی مجھے خوشیاں ہی خوشیاں نظر آتیں۔''

''کیا واقعی اس دنیا پر ایسا وقت بھی کبھی آیا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔ ہر انسان پر یہ وقت آتا ہے جب وہ کھل کر ہنستا ہے، اس کی آتما پر دکھوں کا کوئی سایہ نہیں ہوتا۔ یہ وہ دور ہوتا ہے جب وہ صرف روشن اور خوبصورت چیزیں ہی دیکھ پاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی شروع شروع میں ایسا ہی ہوا۔ مگر پھر مجھے آزادی کی خواہش ستانے لگی۔ میں یہ سوچ کر غمگین رہنے لگی کہ میرے پاس پر ہوتے ہوئے بھی میں اڑ نہیں سکتی جب کہ لوگ جو ان پروں سے محروم تھے کتنی آزاد دنیا تھی ان کی! کاش میں ان کی طرح کہیں بھی جانے آنے کے لئے آزاد ہوتی۔ میرا اپنا غم کچھ کم نہ تھا۔ مگر میری آتما کا بوجھ اور بھی بڑھ گیا جب میں نے انسانوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا اور مجھ پر دھیرے دھیرے یہ راز کھلا کہ یہ انسان تو مجھ سے بھی بدتر غلامی کی زندگی جی رہے تھے۔ یہ آزادی جو ان کے پاس تھی وہ تو ایک فریب تھا، ایک دکھاوا، بلکہ اس کے سبب تو وہ آزادی کے دعوے سے بھی محروم کر دئے گئے تھے۔ یہ ایک عجیب دنیا تھی جہاں لوگ ایک ایسی زندگی جی رہے تھے جو پہلے سے ان کے لئے طئے کر دی گئی تھی۔ یہی نہیں، اپنی اس زندگی میں زہر بھرنے کے لئے وہ ایک دوسرے کو زدوکوب کرنے کے سارے ہتھکنڈے آزمانے سے باز بھی نہیں آتے تھے اور اس طرح جانے ان جانے سب نے ایک دوسرے کو غلام بنا رکھا تھا۔ اس عجیب انکشاف سے میرا دل بجھ گیا اور میں نے دیکھا اچانک وہ دریچے جو کل تک روشن تھے تاریک ہو گئے تھے، آسمان دھوؤں سے بھر گیا تھا، پیڑوں نے ایک عجیب محزونیت کا لبادہ اوڑھ لیا تھا اور میں اس بے معنی تاریک دنیا سے منہ موڑنے پر مجبور ہو گئی۔ اب میرے اندر نیچے تاکنے کی ہمت نہیں ہے۔''

''کتنی دردناک کہانی ہے تمہاری، کتنا درد تھام رکھا ہے تم نے اپنے دل میں؟ اور میں

صرف تمہارے پروں کے بارے میں سوچتا رہتا تھا'' اس نے پری کے گیلے ٹھنڈے رخساروں پر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''تو یہ تمہارے آنسو ہیں جنھوں نے تمہیں اس طرح بے جان بنا ڈالا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو ٹھیک ٹھیک سمجھ پا رہے ہیں نا؟''

پری خاموش تھی۔ مگر اس کے سر سے سر ٹکرا کر اسے ایک ایسے سرور کا احساس ہو رہا تھا جسے اس نے آج تک محسوس نہیں کیا تھا جب کہ یہ اس کی زندگی کا ایک بہت ہی تاریک لمحہ تھا۔ وہ ساری رات پری کے ساتھ گفتگو کرتا رہا یہاں تک کہ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب وہ پری کے شانے پر بیٹھا اس کی گردن کو باہوں سے تھامے سو گیا تھا۔ پری اپنی جگہ کھڑی آسمان کی طرف تاک رہی تھی۔ سیڑھی نیچے سے کھینچ کر حضرتِ خضر کب کے غائب ہو چکے تھے۔

دوسری صبح جب عمارت کے پہرے داروں نے اسے دیکھا تو وہ پری کے شانے پر اسی طرح بیٹھا اس کی گردن کو باہوں سے تھامے سو رہا تھا۔ لوگ حیران تھے۔ وہ اتنی اونچائی پر بغیر کسی سہارے کے کیسے پہنچ پایا۔ لوگوں کے شور سے اس کی نیند کھل گئی۔ اس کی نظر سب سے پہلے پری کی آنکھوں پر پڑی جو پیتل کی تھیں۔ گرچہ ان آنکھوں سے کچھ سمجھنا مشکل تھا مگر پری کے ہونٹوں پر ٹھہری ہوئی خفیف سی مسکراہٹ سے ایسا لگ رہا تھا جیسے رات کی ساری باتیں اسے بخوبی یاد ہوں۔

جب فائر بریگیڈ والوں نے اسے نیچے اتارا تو اس نے بھرپور تعاون دیا۔ نیچے اترتے ہی اسے حراست میں لے لیا گیا۔ عمارت کا افسر اسے فوراً پہچان گیا۔ پولس نے کچھ دنوں تک اسے حراست میں رکھ کر چھان بین کی پھر اس کی رپورٹ پر عدالت نے اسے دماغی طور پر غیر متوازن قرار دے کر بری کر دیا۔ گرچہ آخر تک وہ یہ گتھی سلجھا نہ پائے کہ وہ اتنی اونچائی پر بغیر کسی سیڑھی کا سہارا لئے پری تک کیسے پہنچ پایا تھا۔

دو ماہ بعد جب وہ آفس میں نظر آیا تو اس نے ایک گلاب کا پھول تھام رکھا تھا اور کافی خوش نظر آ رہا تھا۔ اس دن اس نے دن بھر اپنے کمرے کی صفائی کی، کھڑکیوں کو کھول کر ان کے کونوں سے مکڑی کے جالے صاف کیے اور بیٹ کی لکیروں کو رگڑ رگڑ کر ہٹایا اور جب اسے اپنے کام سے چھٹکارا ملا تو ایک کرسی پر بیٹھا بیٹھا گلاب کی پنکھڑیوں پر اپنی انگلیاں پھیرتا رہا۔

شام کو اس کی ماں اس کے لئے میز پر چائے لگا رہی تھی جب اس نے اعلان کیا کہ وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کا باپ بالکنی میں اپنے پڑھے ہوئے اخبار پر سر جھکائے اونگھ رہا تھا۔

گذشتہ دو مہینوں سے اسے عدالت اور پولس کا چکّر لگاتے رہنا پڑا تھا۔ مگر وہ خوش تھا کہ اس کے لڑکے کی نوکری بچ گئی تھی۔ اس کے لئے وہ یونین والوں کا ممنون تھا جنھوں نے عدالت کی ساری کاروائی کو دبا کر اس کی سروس بک کو داغ لگنے سے بچالیا تھا۔

''سچ؟'' اس کی ماں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں اور میں نے لڑکی بھی دیکھ رکھی ہے۔'' اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ ایک ڈاکٹر کے مطب میں کام کرتی ہے۔''

''دیکھنے میں کیسی ہے؟''

''لڑکی کے لئے لڑکی ہونا ہی کافی نہیں کیا؟''

''میں نے تو یوں ہی پوچھ لیا تھا۔ کیا نام ہے اس کا؟''

''ابھی میں نے نام نہیں پوچھا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اس کا شوہر ایک حادثے میں مارا جاچکا ہے۔ وہ ایک لڑکے کی ماں ہے۔''

''ایک لڑکے کی ماں!'' اس کی ماں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ایک ایسے لڑکے کی ماں جو مسکراتا ہے تو لگتا ہے ابھی پری گردش کرنے لگے گی۔''

''پری؟'' اس کے باپ کی غنودگی ٹوٹ گئی تھی اور وہ اپنا سر اٹھا کر عمارتوں کے سیلاب سے پرے آسمان کی طرف تاک رہا تھا۔ ''ہاں وہ لڑکی میں نے دیکھی ہے۔ مجھے وہ لڑکی پسند ہے۔'' اسنے اپنے بیٹے کو آواز دے کر کہا۔ ''شاید اس گھر کو ایک پری کی ہی ضرورت ہے۔''

وہ اپنے کمرے میں کھڑکی کی سلاخوں کو تھام کر کھڑا تھا جب ایک عجیب وغریب بارن کی بھونڈی آواز نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ اسے نیچے گلی میں خواجہ خضر ایک پرانے زمانے کی کار ڈرائیو کرتے نظر آئے جس کی چھت کھلی ہوئی تھی۔ ان کے سر پر ایک سفید ہیٹ تھا اور آنکھوں پر سفید فریم والی عینک۔ انھوں نے شوفر کی سفید یونیفارم پہن رکھی تھی۔ کار کی پچھلی نشست پر ایک سفید فام بوڑھا اپنی چھڑی تھامے بیٹھا تھا۔ بوڑھا اندھا تھا جس نے تاریک عینک لگا رکھی تھی۔ حضرت خضر نے اسٹیرنگ سے بایاں ہات اٹھا کر انگلیوں کے ذریعے وکٹوری کی علامت بنائی، تین بار ہارن بجائے اور کار نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

*Victory Crown

قصہ ایک نیگرو اور ایک مرے ہوئے کتّے کا

سمندر کے کنارے گیلی ریت پر ایک کتا مر کر تین دن تک پھولتا رہا۔ سڑک پر لوگ اسے تاکتے ہوئے گذرا کیے۔ پھر ایک نیگرو نے جو ایک پناما کیپ پہنے ہوئے تھا اس کتے سے تھوڑا اوپر پشتے کی دیوار پر بیٹھ کر اپنا ماؤتھ آرگن چھیڑ دیا جیسے اسے اس کتے سے کوئی فرق نہ پڑا ہو۔ کیپ کے نیچے اس کے بال گھنگریالے تھے اور اس کے بڑے بڑے سرخ ہونٹوں پر مکھیاں بیٹھنے کے لئے بے چین ہو رہی تھیں۔

دوسرے دن وہ کتا اس جگہ سے غائب پایا گیا۔ نیگرو پھر کبھی وہاں دکھائی نہ دیا۔ یوں اس طرح کے واقعات ایک بڑے شہر کے لئے کسی خاص اہمیت کے حامل نہیں ہوتے۔ خود کتا کے وہاں سے غائب ہو جانے کے واقعے کو نیگرو کے ساتھ رکھ کر دیکھنا بھی کوئی دانشمندی کا کام نہ تھا۔

مگر دنیا میں اور تمام جگہوں کی طرح اس ساحل پر بھی کچھ لوگ ایسے تھے جن کے پاس ہر چیز کے لئے کافی فرصت تھی، جنھوں نے ہمیشہ کی طرح کانا پھوسی کی ایک روایت شروع کر دی۔ ان میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جو ٹھیلے پر چائے پھل بھیل پوری یا کھانے پینے کے دوسرے سامانوں کے ساتھ ساتھ افواہیں بھی بیچا کرتے، یا وہ ناریل پانی والے غبارے والے جوا کھلانے والے تھے جو پولس کی نظر بچا کر یا ان کی شہ پر منشیات کے دھندے میں بھی ملوث ہو جاتے۔

''ان لوگوں نے اس شہر کا کباڑا کر دیا۔'' حزن و ملال کے یہ پیغمبر اپنی بات ہمیشہ اسی طرح شروع کرتے۔ ''اور کچھ برسوں کے بعد اس شہر اور ایک شہد کی مکھی کے چھتے میں کیا فرق رہ جائیگا اور اسی کی طرح یہ خود بھی اپنے بوجھ سے نیچے آگرے گا۔''

یہ ان بوڑھوں کی قسمت تھی کہ ہر بوڑھے کو ایک دوسرا بوڑھا ضرور مل جاتا جو اس سے زیادہ تجربہ کار اس سے زیادہ تاریک عینک کے اندر سے دنیا کو دیکھنے کا عادی ہوتا۔

''اب تو نیگرو بھی اس شہر کے مرے ہوئے کتے اٹھانے لگے ہیں۔'' ایسے ہی ایک بوڑھے نے ایک دن کہا۔ وہ اپنے غیر فطری طور پر روشن دانتوں کے سبب کچھ زیادہ بوڑھا اور بدصورت نظر آرہا تھا۔ یہ دانت نقلی تھے جن کی صفائی پر وہ اپنا بہت سارا وقت صرف کیا کرتا۔

''یہ کتا سمندر سے بہہ کر آیا تھا۔'' قدرے توقف کے بعد اس نے اس اسرار سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''کیا واقعی؟'' دوسرا بوڑھا چلتے چلتے ٹھٹھک گیا۔ ''پھر تو اس کے اس طرح غائب ہو جانے میں کوئی نہ کوئی راز ضرور مضمر ہے۔''

''اور یہ نیگرو، تم نے اسے دیکھا تو ہوگا؟''

''سنا ہے۔''

''یہ نیگرو ایسا تھا کہ اسے سننا دیکھنے کے برابر ہے۔'' تجربہ کار بوڑھے نے کہا۔ وہ اپنی چھتری کے فیرول سے ریت پر لاشعوری طور پر لکیریں کھینچ رہا تھا جو مقدس اور فحش کے بیچ کے No Man's Land کو ظاہر کر رہی تھیں۔ ''میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اس کے گھنے بالوں کے بیچ ایک چڑیا کا گھونسلا بنا ہوا تھا اور اس کی رال ماؤتھ آرگن کے سوراخوں سے کسی لسلسے مادے کی طرح رس رہی تھی۔ وہ ایک بہت ہی بھیانک نیگرو تھا، بالکل افریقہ کی طرح تاریک اور اتنا ہی پراسرار۔''

قصہ ایک نیگرو اور ایک مرے ہوئے کتے کا

سمندر کے کنارے ساحل پر ایک دن ایک نیگرو نے ایک ماؤتھ آرگن پڑا ہوا پایا۔ نیگرو کے بال گھنگریالے تھے اور اس نے تھوڑی پی رکھی تھی۔ ماؤتھ آرگن پر جب اس کا سایہ پڑا تو اس کی چمک مفقود ہوگئی جس کے سبب وہ اس کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہوگیا۔ نیگرو نے پہلے اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ مگر کہیں سے ایک خارش زدہ کتا آنکلا جس کا پیٹ کسی اندرونی بیماری کے سبب بادبان کی طرح پھولا ہوا تھا۔ نیگرو نے خوفزدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور دفاع

کے لئے ماؤتھ آرگن کو ریت سے اٹھالیا۔ کتا پلٹ کر اسے دیکھتے ہوئے اپنی درانتی کی شکل میں اٹھی ہوئی دم کو ایک طرف جھکائے ہوئے آگے بڑھ گیا اور وہ ماؤتھ آرگن نیگرو کے ہاتھ میں رہ گیا۔

نیگرو نے ماؤتھ آرگن کو غور سے دیکھا۔ اسکے منحنی سوراخوں کے اندر ریت بھر گئی تھی بلکہ ایک قدرے بڑے سوراخ سے آئس کریم کی تیلی کا ایک ٹکڑا کسی ٹوٹے ہوئے دانت کی طرح باہر نکلا ہوا تھا۔ وہ جب اپنا ہوٹل واپس لوٹا تو ریسپسنسٹ نے اس کے کمرے کی چابی کی بورڈ سے الگ کر کے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"A beautiful sea, Mr. Smith!"

نیگرو نے حیرت سے اس کی طرف یکھا۔ اس سے پہلے اس نے اس سے کبھی بے تکلف ہونے کی کوشش تو نہیں کی تھی؟ آج ایسا کیا ہوگیا تھا؟ لفٹ میں داخل ہوتے وقت اس نے ہمیشہ کی طرح لفٹ مین کے سلام کو نظر انداز کیا اور اپنے کمرے کے باتھ روم میں بیسن کے سامنے کھڑا ماؤتھ آرگن کے سوراخوں سے ریت کو بہہ بہہ کرنل کے پانی کی تیز دھار کے ساتھ نکاسی کی جالی میں غائب ہوتے دیکھتا رہا۔ بعد میں دیر تک اسے ہوا میں لہرانے کے بعد اس نے بجانے کی کوشش کی۔ گیلا ماؤتھ آرگن پہلے تو کسی عادی مجرم کی طرح خاموش رہا پھر ایک شدید کراہ کے ساتھ بول پڑا۔ نیگرو اس واقعے سے ششدر رہ گیا۔ اس لئے نہیں کہ ماؤتھ آرگن پھر سے کام کرنے لگا تھا بلکہ اس لئے کہ وہ ایک بہت ہی باکمال ماؤتھ آرگن پلییئر تھا۔ تو اس کے توہم پرست ذہن نے سوچا سمندر کا ماؤتھ آرگن کو اس طرح کنارے لا کر اس کے قدموں پر ڈال دینا کسی بڑے واقعے کا پیش خیمہ ہوسکتا ہے۔

''جس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ بیمار کتا کوئی بلاوجہ کا واقعہ نہیں تھا۔'' نیگرو نے بستر پر پڑے پڑے ٹی وی کے اسکرین پر مچلتے رنگوں کی طرف تاکتے ہوئے سوچا۔ یہ رنگ جو کوئی بھی صورت اختیار کر سکتے تھے، وہ انھیں کبھی بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔ وہ اس کے لئے صرف آڑی ترچھی لکیریں تھیں جن کا کسی ارضی منظر یا فرنیچر یا انسانی جسم میں ڈھل جانا محض ایک اتفاقی واقعہ تھا جس کا تعلق اسکے خیال میں حقیقت سے کم اور انسانی عقیدے سے زیادہ تھا، انسان جو اس کرۂ ارض پر ہر طرح کے فریب کھانے کے لئے تیار بیٹھا ہے۔

تو اس دن لنچ کے بعد ایک بار پھر وہ ساحل کے اس گوشے کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس

نے محسوس کیا پچھلے تین ماہ کے قیام کے بعد بھی یہ شہر اس کے لئے اتنا ہی اجنبی اور گھبرا دینے والا ثابت ہو رہا تھا جتنا اسے یہ پہلا دن نظر آیا تھا۔ آخر لوگ اس ملک میں اتنے غیر محفوظ کیوں دکھائی دینے لگے ہیں جیسے ایک کنکریٹ کے آسمان کے نیچے جی رہے ہوں جو کبھی بھی زمیں بوس ہو سکتا ہے؟ یا چور زمین پر کھڑے ہوں جو اگلا قدم اٹھاتے ہی انھیں نگل لے گی۔

ساحل پر چلتے چلتے اس کی نظر کنکریٹ کے ایک چھوٹے ستون پر پڑی جو ریت پر ترچھا کھڑا تھا اور سمندر کا کھارا پانی پی پی کر کھردرا ہو رہا تھا، یہی نہیں اس پر بہت سارے سیپ اور سمندری کیڑے چپک کر فوسل کی طرح سخت ہو گئے تھے۔ وہ اس کی چوٹی پر بیٹھ گیا اور اس نے اپنے ماؤتھ آرگن پر وہ گیت بجانے کی کوشش کی جسے اس نے نیویارک میں اپنے گھیٹوز کے دنوں میں ایک ہٹ مین (Hitman) سے سیکھا تھا۔ ابھی تھوڑا ہی وقت گذرا تھا کہ اسے وہی خارش زدہ کتا پہلے کی طرح اپنی دم ایک طرف جھکائے لوٹتا نظر آیا جیسے صبح کے واقعے کے ساتھ وہ اب تک جڑا ہوا ہو۔ وہ اپنے بھاری بھرکم پیٹ کے سبب لڑکھڑا رہا تھا جیسے یہ بوجھ اب اس سے سنبھالا نہ جا رہا ہو۔

''تم مر کیوں نہیں جاتے؟'' نیگرو نے ماؤتھ آرگن کو ہونٹوں سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ ''اتنی تکلیف دہ زندگی سے موت بہتر ہے۔ میرے ملک میں تم کتوں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور تمہیں اس اذیت بھری زندگی سے نجات دلانے کے لئے کافی موثر طریقے اپنائے جاتے ہیں جو ہم انسانوں کو بھی میسّر نہیں۔''

اور گرچہ اس نے امریکن انگریزی میں یہ باتیں کہی تھیں مگر اس نے ان سارے فحش الفاظ سے احتراز کیا تھا جنھیں اپنی گھیٹوز کی زندگی کے دوران وہ سیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ مگر یہ نیگرو کا ایک نجی واقعہ تھا اور کتے کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ نیگرو سے لاپرواہ گیلی ریت پر بیٹھ گیا جس سے ایک گز کے فاصلے پر موجیں ابل رہی تھیں۔ ہر بار یہ موجیں ساحل سے ٹکرا کر واپس لوٹتے وقت ریت پر جھاگ کے دھبے چھوڑ جاتیں جو تیزی سے مرنا شروع کر دیتے۔ کتے کا نچلا جبڑا مشینی انداز سے لٹک گیا تھا اور اس کی گیلی زبان غیر معمولی طور پر باہر نکل آئی تھی۔ اس کی دھندلی آنکھوں میں موتیا بند کے حملے صاف نظر آ رہے تھے۔

نیگرو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا آگے اسے کیا کرنا چاہئے اور گرچہ اس نے ماؤتھ آرگن

بجانے کا ارادہ ترک کر دیا مگر وہ اب تک اسے اسی طرح تھامے بیٹھا تھا جیسے کسی بھی وقت ہونٹوں سے لگا لے گا۔

کتا تھوڑی دیر تک اپنی دھندلی انسانی آنکھوں سے اس کی طرف تاکتا رہا پھر اس کی زبان تھوڑی اور باہر نکل آئی، اس نے اپنے نچلے جبڑے کو ریت پر رکھ دیا اور اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ ابھی تھوڑا سا ہی وقت گذرا ہوگا مگر دیکھتے دیکھتے چھوٹی چھوٹی مکھیاں جانے کہاں سے نکل آئیں اور اس کی آنکھوں کے کونوں پر بیٹھنے لگیں۔ نیگرو کو اس کی موت کا پتہ بہت دیر بعد چلا جب جزر و مد میں تبدیلی کے آثار پیدا ہوئے اور سمندر کی روشنائی نے پھیلتے پھیلتے کتے کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ اس کے بعد بھی دیر تک وہ ترچھے ستون پر بیٹھا کتے کے بے حس جسم کو تاکتا رہا جو پانی کے اندر تھوتھنی کے راستے ڈوب رہا تھا، مقعد کے راستے ابھر رہا تھا۔ پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور وہاں سے واپس چل دیا۔

زیادہ وقت نہیں گذرا تھا جب ستون سمندر میں نصف ڈوب گیا۔ ایک پہاڑی کوا کہیں سے اڑتا ہوا آیا اور اس پر پنجے ڈبو کر بیٹھ گیا۔ وہ غروب آفتاب کی روشنی میں کچھ زیادہ ہی کالا نظر آرہا تھا۔ عام کووں کے خلاف، جو بلاوجہ شور مچانے کے عادی ہوتے ہیں، اس نے کوئی آواز نہیں لگائی۔

تھوڑی دیر بعد بجلی کے کھمبوں پر روشنیاں جل اٹھیں اور سمندر کے مچلتے پانی پر دو جوان آدمی کے سائے آکر گرے۔ یہ دونوں اس شہر کے کامیاب بیوپاری تھے جو پاس کے کسی ڈانس بار میں پیسے لٹایا کرتے اور گذشتہ کئی مہینوں سے لگاتار اس ساحل کی طرف آرہے تھے کیونکہ ان میں سے ایک کو اس کے نجومی نے کہا تھا کہ اسے ہر طرح کے پانی کے قریب رہنا چاہئے کیونکہ اس آبی قربت کے سبب اس کے ستاروں پر بہت اچھا اثر پڑنے والا تھا جب کہ دسرے کو اس کی نجومی نے کہا تھا چونکہ پانی اس کے لئے منحوس ثابت ہوگا اس کے لئے یہ بہتر ہے کہ وہ اس سے دور رہے یا یہ اگر ممکن نہ ہو تو ہمیشہ اس پر کڑی نظر رکھے۔

''تمہیں یقین ہے اس کتے کو وہ نیگرو یہاں ڈال گیا ہے؟'' پہلے شخص نے کہا۔

''ہاں، ان لوگوں کی عجیب و غریب رسمیں ہوتی ہیں۔ تم نے سفلی جادو Voodoo کے بارے میں تو سنا ہوگا؟''

'ان لوگوں کے بارے میں تم جو بھی کہو گے میں اس سے اتفاق کرنے کے لئے تیار

ہوں۔'' دوسرے شخص نے کہا۔'' اور تم جو کہہ رہے ہو اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس کتے سے ہمیں گریز کرنا چاہئے۔ تمہاری کیا رائے ہے؟ تم ایک الگ نجومی کے پاس جاتے ہو۔''

''میری رائے بھی کم وبیش وہی ہے جو تمہاری ہے۔'' پہلے شخص نے کہا۔'' بلکہ میں یہ پیشن گوئی تک کر سکتا ہوں کہ یہ کتا پھر سے زندہ ہونے والا ہے۔''

اور گرچہ اس آدمی نے یہ بات زیرِ لب کہی تھی مگر اس کی پیشن گوئی کا ایک ایک لفظ ساحل پر دور دور تک سنائی دیا اور ہمیشہ کی طرح غلیظ پانی کے پاس کھڑے لوگ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ وہ اس واقعے کا ذکر کر رہے تھے کہ کس طرح ایک نیگرو اس ساحل پر ایک ایسے کتے کو زندہ کرنے والا تھا جو دو روز تک پانی میں سڑتا رہا تھا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ایک قصہ گو کو اس بات سے احتراز کرنا چاہئے کہ یہ افواہ کن کن لوگوں کے کانوں سے ہوتے ہوئے ایک بڑے انسانی ہجوم تک پہنچی تھی اور کس طرح وہ انسانی ہجوم اس افواہ کے جال میں پھنس گیا تھا اور اس سے باہر آنے کی جدوجہد میں کلبلا رہا تھا۔ میں تسلیم کرتا ہوں ایک قصہ گو سے اس بات کی امید کی جاسکتی ہے کہ وہ جزئیات سے گریز کرتے ہوئے سیدھے Bull's Eye میں اتر جائے۔ مگر ہر قصہ گو کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں اور وہ ایک قصہ کو کسی ایسے طریقے سے بیان کر ہی نہیں سکتا جس کا وہ عادی نہ ہو۔ مگر ہمارے کچھ حزن وملال کے پیغمبروں کی گفتگو سننے کے بعد اس نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا ہے اور اب وہ اس گفتگو کو من وعن پیش کرنے پر مجبور ہے جو ایک چٹان پر بیٹھے دو عینک پوش بوڑھوں کے درمیان ڈوبتے سورج کی سیندوری تھالی کے عین نیچے پیش آئی۔

قصہ دو جہاں دیدہ بوڑھوں کی گفتگو کا

''ذرا سوچو، اب اس طرح کے واقعات بمبئی جیسے شہر میں کھلے عام پیش آنے لگے ہیں۔'' دھوتی پوش بوڑھا کہہ رہا تھا جو اپنے جنیو کو طالب علمی کے دنوں میں ہاسٹل میں مچھر دانی لٹکانے کے کام میں استعمال کر چکا تھا اور اسے وہاں پر جان بوجھ کر بھول آیا تھا، مگر گزشتہ کئی سالوں سے وہ دن بدن مذہبی جنونیوں کے رواں قافلوں سے ہراساں نظر آنے لگا تھا۔'' ہمارے رشیوں نے علم تشکیک کی جو مشعل ہزاروں سال قبل روشن کی تھی وہ ان توہم پرستوں کی بدبودار پھونک سے بجھ چکی ہے۔ شک کرنا اب ایک گناہِ عظیم بنتا جا رہا ہے جب کہ اسی نے انسانوں

کے لئے ہمیشہ علم وعمل کے نئے راستے کھولے ہیں۔"

"تم انسانوں سے آنکھیں بند کر کے جینے کی آزادی نہیں چھین سکتے۔" دوسرے بوڑھے نے کہا جو ہر معاملے میں ایک غیر جانبدارانہ رول نبھانے میں ماہر تھا۔"خاص طور پر جب علم کی روشنی اتنی تیز ہو کہ انسانی آنکھیں چندھیا جائیں۔ مگر تم نے نہیں بتایا ہمیں اس نیگرو کا کیا کرنا چاہیے؟"

"پہلے یہ تو پتہ چلے کہ ایسے کسی نیگرو کا وجود بھی ہے؟ رہا وہ کتا، تو ہمارے ملک میں آوارہ کتے اتنی بڑی تعداد میں گھومتے نظر آتے ہیں کہ ہر کتا کسی نہ کسی پچھلے کتے کی کاربن کاپی دکھائی دیتا ہے۔ جس سے افواہوں کا سچ میں بدل جانا لازمی ہے۔"

"یہی بات تم ایک نیگرو کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہو۔" غیر جانبدار بوڑھے نے کہا۔" بلکہ مجھے تو لگتا ہے ہم بھی ایک ہارڈ ڈسک میں محفوظ کسی فائل کی کاپیاں ہیں۔ ہم انسان پیدا نہیں ہوتے صرف ایک پرنٹر سے باہر نکل آتے ہیں۔"

دھوتی پوش بوڑھا لاجواب ہو کر سورج کی گیند کو پانی کی سطح پر ڈولتے دیکھتا رہا۔ اس نے زندگی کو ہر طریقے سے جی کر دیکھا تھا اور اب وہ اپنے سارے ایقان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا جب کہ دوسرا بوڑھا غیر جانبداری کے ان علاقوں میں جینے کا عادی تھا جہاں طرفین کے نقاب ریزہ ریزہ گرتے رہتے۔ بقول اس کے، اب انسان اجتماعیت کے نشے میں چور سچائی پر اپنی اجارہ داری کا اعلان اتنے جارحانہ طریقے پر کرنے کا عادی ہو چکا ہے کہ اب سچائی صرف No Man's Land کے اندر ہی پائی جا سکتی ہے۔

قصہ گو کی کہانی قصہ گو کی زبانی

تو اس ساحل پر اب کتے بڑے غور سے دیکھے جانے لگے تھے اور وہاں ایک نیگرو کا نمودار ہو جانا تو ایک بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہو سکتا تھا۔ مگر اس ساحل پر عرصہ دراز تک کوئی نیگرو نمودار نہ ہوا، دونوں بوڑھے شاید مر کھپ گئے، افواہ نے خود ہی دم توڑ دیا اور قصہ گو نے پانی کے اندر ٹخنوں تک غرق کھڑے ہو کر شہر کی بلند و بالا عمارتوں کی طرف تاکتے ہوئے سوچا:

کہانی کو انجام تک لانا، ایک قصہ گو پر یہ ذمہ داری عائد تو ہوتی ہی ہے!

مگر قصہ گو مجبور تھا۔ ساحل پر نئے لوگ آ گئے تھے، آسمان سے نیا پانی گرا تھا جس سے زمین گرم ہو اٹھی تھی اور سمندر پار کے ملکوں میں بہت ساری بڑی تبدیلیاں آ گئی تھیں جنہوں نے لوگوں کو سر اٹھا کر افق تا افق تاکنے پر مجبور کر دیا تھا جیسے وہ کسی نئے سورج کے متلاشی ہوں۔ پھر ایک دن قصہ گو نے اس ستون کا رخ کیا جو ریت پر ترچھا کھڑا تھا اور اس نے دیکھا ایک نیگرو جو کسی پہاڑی کوے کی طرح ہی سیاہ تھا اس پر بیٹھا اپنی کیپ کے نیچے اپنی سرخ آنکھیں وا کئے ہوئے سمندر کی طرف تاک رہا تھا، سمندر جو کسی حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح ابھرا ہوا تھا اور ہیبتناک انداز میں اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ شاید چاند پر آج کچھ زیادہ ہی جنون طاری تھا۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر ایک کتا مرا پڑا تھا جس تک ابھی سمندر کا پانی پہنچ نہیں پایا تھا۔

''تو واقعی تم ایک حقیقت ہو؟'' قصہ گو نے اس سے دریافت کیا۔

''بالکل!'' نیگرو نے خالص اردو میں کہا۔ ''اور جناب کی تعریف؟''

''میں ایک قصہ گو ہوں۔''

''پھر تو تم میرے کسی کام کے نہیں۔'' نیگرو ستون سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کتا تک گیا، اس نے اسے گود میں اٹھا لیا اور چلتا ہوا ساحل کی دھند میں غائب ہو گیا۔

☆☆

شادی کا رجسٹر

میرے کمرے میں آپ کو پرانی کتابوں کاپیوں کا انبار دکھائی دے گا۔ ایک آدھ غلط سلط چیزیں بھی، مثلاً پنکی سلمان کا شادی کا رجسٹر۔ اسے میں نے ایک ردی کی دکان سے خریدا ہے۔ پنکی سلمان کون؟ اگر اس رجسٹر کی مانیں تو وہ زیادہ سے زیادہ شہر کی کسی مسجد کا پیش امام ہوسکتا تھا یا شہر کا قاضی یا قاضی کے نیچے کام کرنے والے ان ان گنت مولیوں میں سے ایک جو نکاح کی جائز فی کے علاوہ بھی ایک اچھی خاصی رقم کی مانگ کرنے سے نہیں چوکتے۔ رجسٹر میں جتنے نکاح پڑھائے گئے ان میں وکیلوں اور گواہوں کے نیچے زیادہ تر دستخط پنکی سلمان کے ہی تھے۔ سب سے پہلا دستخط ۱۶ فروری ۱۹۵۶ کا ہے اور آخری دستخط ۳ جون ۱۹۷۳ کو کیا گیا۔ ان سترہ برسوں میں پنکی سلمان نے کل ایک ہزار تین سو ترپن نکاح پڑھوائے۔

پنکی سلمان کیا وہ زندہ ہے؟ یا قبرستان میں کسی بغیر کتبے کی قبر میں اپنا دائمی ٹھکانہ بنا چکا ہے! جانے یہ رجسٹر مجھ پر اتنا حاوی کیوں ہے کہ میں پنکی سلمان کی تلاش میں مجبور ہو گیا ہوں۔

//////////

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب میں پنکی سلمان کی تلاش میں نکل ہی پڑوں گا۔ کیا میں نے ایسا کہہ کر آپ کی امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے؟ یا یہ آپ کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ میں پنکی سلمان کی تلاش میں نکلوں یا اپنا ارادہ ترک کردوں۔ اگر میں یہ کہوں کہ پنکی سلمان ایک خالص النسل چینی تھا، ایک مرنجان مرنج انسان، جو کڈر پور کی بندرگاہ میں ایک چینی جہاز سے بھاگ کر مسلمانوں کے محلے میں چلا آیا تھا اور ایک مولوی کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوکر اس نے خود کو ساری زندگی اپنے نئے مذہب کی تبلیغ واشاعت کے لئے وقف کرلیا تھا تو شاید آپ یہ سوال

اٹھائیں گے کہ ایک چینی کے لئے زبان کا مسئلہ تو تھا ہی۔ مگر آپ کے ذہن میں یہ خیال بھی آسکتا ہے کہ اس وقت اس کی عمر کیا تھی جب وہ مشرف بہ اسلام ہوا؟ کیا اس کی سنت کی رسم ادا کی گئی؟ اس سے قبل کیا اس کا کوئی مذہب تھا یا وہ اپنے دخانی جہاز کے طوفانی دنوں میں اپنے سارے ایقان سے دستبردار ہو چکا تھا؟ جس طرح اس کے چینی نژاد ہونے پر بھی سوالیہ نشان کھڑا کیا جا سکتا ہے اس طرح یہ سوالیہ نشان آپ اس کے سلسلے میں ہر بات پر لگا سکتے ہیں، کیونکہ تادم تحریر شہادت کے طور پر ان چند اڑتی پڑتی باتوں کے علاوہ اوپر میں نے جن کا ذکر کیا ہے ایسا کچھ بھی نہیں جو پنکی سلمان پر کسی قسم کی روشنی ڈال سکے یا اس کے وجود کو ثابت کر سکے یا اسے ایک فکشن میں بدل دے۔ تو آپ دیکھ رہے ہیں میرے ساتھ ایک بڑا مسئلہ خود پنکی سلمان کا ہونا یا نہ ہونا ہے۔ میرے پاس ان دونوں کے سلسلے میں ٹھوس شواہد موجود نہیں، اور ایک ایسے شہر میں جہاں شطرنج کے مہروں کی طرح لوگ گھر بدلتے رہتے ہوں یا جہاں عام اطلاعات کے سلسلے میں کوئی منظم صورتِ حال موجود نہ ہو، جہاں لوگوں کی ایک جمِ غفیر کی حیثیت ان کے نام سے زیادہ کی حامل نہ ہو، یہ کہنا کہ پنکی سلمان کی تائید میں یا اس کے خلاف آپ نے آخری بات کہہ دی ہے غالباً ایسا ہی ہے جیسے آپ نے سچ مچ وقت اور تاریخ کو کھنگال لیا ہو اور آپ کی مٹھی میں سچ کی کلید آ گئی ہو۔

//////

جہاں پرانی حویلیوں کے درمیان پتھر کی سڑک دن بدن ناقابلِ عبور ہوتی جا رہی تھی اور میخوں سے چھلنی درخت جن سے بھکاری اور دکاندار اپنے ترپال ٹانگا کرتے یہاں وہاں کھڑے تھے ایک تاریخی مسجد سے اپنی چپلیں اٹھا کر میں باہر آیا اور ان صحنوں سے گذرنے لگا جو دراصل حویلیوں کی پیشگاہیں تھیں جہاں فٹن اور ٹانگوں کا دور گذر چکا تھا بلکہ کل تک جہاں فورڈ، ہمبر، بیک سے لے کر بے بی آسٹن اسٹوڈی بیکر اور طرح طرح کی غیر ملکی کمپنیوں کی گاڑیاں کھڑی رہا کرتی تھیں اب ایک آدھ جگہ ان کے ڈھانچے ہی نظر آرہے تھے جن کے پہیے گھاس اور مٹی میں دفن تھے۔ حویلیوں کے اندر چمگادڑوں اور ویرانیوں نے مسکن بنا رکھا تھا اور ان کے باہر کا زیادہ تر حصہ دائمی طور پر تارک الوطنوں گردخوروں اور تکیہ داروں کے غیر قانونی قبضے میں جا چکا تھا۔ وہ میری زندگی کا کوئی خاص دن نہ تھا مگر جانے کیوں میں نے سوچا، اگر زندگی کے بچے کھچے کچھ سال مجھے بامعنی ڈھنگ سے گزارنے ہیں تو مجھے اس لیک سے ہٹنے کی ضرورت ہے۔ جس میں چلنے پر میں

حالات کے ہاتھوں مجبور کر دیا گیا ہوں۔ اور وہ لیک کیا ہے؟ وہ لیک یہ ہے کہ صرف منہ سے مقعد تک زندہ رہنا اس سے لاتعلق کہ میرے سر کے اوپر کوئی آسمان بھی ہے یا میرے پیروں کے نیچے کوئی زمین۔ اور یہ ان دنوں میں سے ایک تھا جب میں پرانی کتاب اور ردی کاغذات کی ایک مخصوص دکان کی طرف جانے کا عادی ہو گیا تھا۔ دراصل اب میرے ساتھ ہونے یہ لگا تھا کہ نئی کتابیں پرانی ہوتی جا رہی تھیں جن کے ثقیل الفاظ کو گرفت میں لینا میرے لئے مشکل ہوتا جا رہا تھا جب کہ ردی کاغذات اچانک اب ردی نہیں رہ گئے تھے، وہ نئے ہوتے جا رہے تھے جس طرح رد کئے گئے خیالات وقت کے پہیوں سے روندے جانے کے باوجود ایک دن انھیں پہیوں کے ساتھ چپک کر، چہرا بدل کر بالکل نئے ہو کر پھر سے سامنے آجاتے ہیں۔

تو میں نے گھر لوٹ کر اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور شادی کا رجسٹر کھڑکی کی سلاخوں کے سہارے کھڑا کر دیا اس طرح کہ اس کے صفحات کتاب کی ریڑھ کے دونوں طرف کھلے ہوئے تھے۔ یہ رجسٹر اتنا ضخیم اور اس کی جسامت ایسی کڈھب تھی کہ اگر آپ اسے لے کر چلنے کی کوشش کریں تو آپ گردن سے کمر تک چھپ جائیں گے۔ دوسری طرف رجسٹر نے کھڑکی کی پوری چوڑائی پر قبضہ جما لیا تھا اور یقیناً اپنی عجیب چرمی جلد کے سبب باہر سے کسی جانور کی پشت کی مانند نظر آ رہا ہوگا۔ مگر دریچے کی بلندی کتاب کی لمبائی کے مقابلے دوگنی ہونے کے سبب اس کے بالائی حصے سے ابھری ہوئی سلاخوں کے پیچھے سے ایک شہر قدیم کا خاکستری مائل نیلا آسمان ابھر رہا تھا جس میں پتنگ اور کوے اس طرح اڑ رہے تھے جیسے کسی سنگ تراش نے ہتھوڑی اور چھینی سے کھرچ کھرچ کر انھیں وہاں بنا ڈالا ہو گرچہ دوری کے سبب وہ سارے بے رنگ نظر آ رہے تھے اور یہ منظر میرے لئے بڑا ہی مسحور کن تھا۔ ظاہر ہے، کچھ دیر کے لئے میں رجسٹر کو سرے سے بھول گیا۔ پھر آسمان پر کوے اور پتنگ کم ہونے لگے اور اس کی پرت پر ایک عجیب سی مٹیالی سفیدی باقی رہ گئی، ایک ایسی سفیدی جو موت کے بعد انسان کے جسم پر دھیرے دھیرے اترنے لگتی ہے۔ تو جب اس مردہ آسمان میں میرے لائق کچھ بھی نہیں رہ گیا تو میں نے اسے نظر انداز کیا اور میری نظر نیچے سرکتے ہوئے رجسٹر کے صفحات پر ٹھہر گئی جہاں چمکتے ہوئے ذرات الفاظ اور بیضوی سیل سے اس طرح ابھر رہے تھے جیسے پانی میں ڈوبے ہونے کے سبب ان کی روشنائی گھل رہی ہو۔ یہ دھبہ دیکھتے دیکھتے ایک دھند میں تبدیل ہو گیا، ایک ایسی دھند جو سمندر کے اوپر برے موسم میں

دکھائی دیتی ہے جب اسٹیمروں کی کمزور روشنیاں خود سمندر کے گدلے پانی کا حصہ نظر آتی ہیں جیسے سطحِ زمین پر بسے ہوئے شہر کی طرح اس آبی مملکت کے اندر بھی ایک شہر آباد ہو۔ ابھی میں اس دھند کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے دھیرے دھیرے ہلنا شروع کر دیا اور زیادہ وقت نہ لگا ہوگا کہ مرغولے کی شکل اختیار کر لی جس میں لکیریں، الفاظ اور بیضووی سیل چکر لگاتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے تھے۔ میں اس عجیب وغریب بھنور کی طرف حیرانی سے تاک رہا تھا کہ مجھے ایک سنگلاخ سیڑھی دکھائی دی جو تیزی سے اس بھنور کو چیرتی ہوئی کسی فائر بریگیڈ کے زینے کی طرح اوپر کی طرف آ رہی تھی۔

ابھی میں اس طلسم سے جاگ بھی نہ پایا تھا کہ میں نے دیکھا، شادی کا رجسٹر میری نظروں کے سامنے سے اوجھل ہو چکا تھا اور میں اس سیڑھی کے بالائی چبوترے پر کھڑا تھا۔

پہلی سیڑھی

اس سیڑھی میں بیس پائدان تھے جو دیوار تا دیوار ایک سطح پر قائم ہوتے ہوئے بھی ان پر قدم رکھتے ہی ناتراشیدہ پتھروں کی ناہمواری کا احساس تلووں پر جاگ اٹھتا تھا۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ پنگی سلمان سے میری ملاقات اس پہلی سیڑھی کے خاتمے پر ہو گئی تھی جہاں وہ میرا منتظر تھا۔ میں نے دیکھا، حیرت انگیز طور پر اس کی کوئی داڑھی نہ تھی جو ایک چینی کے لئے کوئی عجیب بات تو نہ تھی مگر اس سے اہم بات یہ تھی کہ اس کا چہرا ایک عام انسان کا چہرا بھی نہ تھا۔ یعنی اس چہرے کے سلسلے میں آپ کوئی ٹھوس نتیجہ نکال نہیں سکتے تھے۔ یوں بھی کسی کی تاریخ کا پوری طرح جائزہ لیے بغیر آپ کسی انسان کے بارے میں کوئی فیصلہ کیسے دے سکتے ہیں کہ وہ چینی ہے یا حبشی، ترک ہے یا ولندیزی؟ دوسری طرف کسی ٹھوس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ایک بھرپور روشنی کا ہونا کافی نہیں ہوتا بلکہ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ روشنیاں چیزوں کی سچائیوں کو سامنے لانے کی بجائے خود انھیں بدل ڈالتی ہیں۔ ہماری روز مرہ کی زندگی میں کسی کے چہرے مہرے سے جو کچھ اخذ کیا جا سکتا ہے وہ بس اتنا ہے کہ وہ لمبے عرصے تک کسی جغرافیائی دباؤ میں آ کر ایک خاص شکل اور سانچے میں ڈھل گیا ہوگا اور بس، اور اسی کی مناسبت سے ہمیں اپنا ردِ عمل طئے کر لینا چاہئے۔

تو پنگی سلمان سیڑھی کے خاتمے پر کھڑا تھا، ایک ایسا چینی جسے خطِ استوا کی مرطوب ہوا

نے بدلنے کی بھرپور کوشش تو کی ہوگی مگر اس کا بہت کچھ اپنا اب بھی اس کی کھال کے اندر بچ گیا تھا جن سے مجھے کام نکالنا تھا اس سے پہلے کہ وہ پوری طرح موسم اور مٹی کے تابع ہو کر میرے کسی کام کے لائق نہ رہ جائے۔ ہم دونوں جب نیم تاریک دالان سے اتر کر کھلے میں آئے تو وہاں قدیم زمانے کے بے روک ستون کھڑے تھے جن پر ننگی محرابوں کے اوپر زیادہ تر گنبد ڈھ جانے کے سبب ان کے رخنوں میں جگہ جگہ آسمان نیلم کے ٹکڑوں کی طرح نظر آ رہا تھا۔ ہمارے راستے پر سوکھے پتے اپنی نوکوں پر دوڑ رہے تھے اور نہ نظر آنے والے درختوں کے سائے دیواروں اور کھلی جگہوں پر سرسرا رہے تھے۔ تو ہمیں یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ ہوئی کہ نیچے بھی اوپر کی طرح ایک متروک دنیا آباد تھی۔ شاید یہ کہنا بہتر ہوگا کہ ہم ان ہی قدیم و شکستہ عمارتوں کے بیچ چل رہے تھے جنھیں ہم اوپر کی دنیا میں چھوڑ آئے تھے اور اوپر کی دنیا کی طرح ہی شاید ہمارا ان ویران عمارتوں کے بیچ چلنا ان کے وجود کے لئے جواز فراہم کر رہا تھا۔ کچھ دور چل کر ہمیں نیلے پانی کا ایک حوض دکھائی دیا جس کے کنارے کی حفاظتی دیوار جگہ جگہ سے ڈھ گئی تھی۔ میں نے دیکھا پانی کا رنگ تو قدرتی تھا مگر حوض کے پیندے کے ٹائل نیلے ہونے کے سبب پانی نیلا نظر آ رہا تھا۔ پنکی سلمان حوض کی دیوار پر بیٹھ گیا اور اس نے ہات پانی کے اندر ڈال کر اس سے کھیلتے ہوئے میری خیریت دریافت کی۔ گرچہ اس نے جملہ اردو میں ادا کیا تھا مگر اس کے جملے کے ہر لفظ سے اس کے چینی نژاد ہونے کا ثبوت ٹپک رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ دراصل اس پہلی سیڑھی پر ہی میں اپنا سارا ماضی کھو چکا ہوں جس کے بغیر کسی بھی انسان کا وجود صفر کے برابر ہوتا ہے کیونکہ ہم کسی کے بارے میں جو کچھ جاننا چاہتے ہیں وہ اور کچھ نہیں صرف اس کا ماضی ہوتا ہے، یعنی اس کی زندگی کا وہ حصہ جو مر چکا ہے۔ ظاہر ہے اپنے ماضی کی بازیافت کے لئے میرے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اس کی تلاش کروں۔

پنکی سلمان نے ہنسنے کی کوشش کی اور کہا کہ ضرور شادی کا وہ متروک رجسٹر میرے ہاتھ لگ گیا ہوگا۔ ایک پل کے لئے اس کے کمزور دانت دکھائی دیے جنھیں دیکھ کر مجھے چینی دندان سازوں کا خیال آ گیا جو اب دن بدن ناپید ہوتے جا رہے تھے۔ پھر اس نے مجھے اطلاع دی کہ اس تک پہنچنے کے لئے میں نے جس سیڑھی کا انتخاب کیا تھا اس کا مقصد اور کچھ نہیں صرف یہ تھا کہ میرے راستے کو اور طویل کر دیا جائے۔ میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ تو کیا یہ عمارتوں کا

جال جس میں ایک خاص جگہ ہم دونوں کھڑے اور بیٹھے ہوئے ہیں محض وہ بھول بھلیاں ہیں جن کا مقصد اس کے وجود کی حقیقت کو فکشن میں بدل دینا ہے۔ کیا اس طلسمی دنیا کی آخری کنجی پنگی سلمان کے پاس بھی نہیں اور وہ خود ایک بھول بھلیاں بنا میرے اور سچ کے بیچ کھڑا ہے۔ تو پھر وہ بجائے خود میری رہنمائی کے لئے کیوں نکل آیا تھا؟ اس وقت پنگی سلمان نے آسمان کی طرف اشارا کیا جس کے ایک حصے پر اب بھی روشنی قائم تھی جیسے کوئی پھوڑا ایک کر پھٹ پڑا ہو اور اس کا مواد باہر نکل آیا ہو۔ کچھ سوچ کر اس نے نفی میں سر ہلا کر اپنے کمزور دانت ننگے کر دیے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ پنگی سلمان کی اس مسکراہٹ کا مقصد کچھ بھی نہ تھا، جب کہ دوسری طرف آسمان اور زمین کے بیچ جو کچھ بھی ہے اس کے آغاز اور اختتام کے تمام کلیے غلط ثابت ہو رہے ہیں۔ تب پنگی سلمان نے اپنی جیبیں ٹٹولیں اور کچھ چینی سکے برامد کیے۔ اس نے مجھے بتایا کہ ان سکوں نے برے دنوں میں ہمیشہ اس کا ساتھ دیا ہے۔ یہاں تک کہ جب اس کا جہاز سمندری ڈریگن کے جبڑے میں جا پھنسا تھا تو وہ اپنا سب کچھ کھو کر صرف ان سکوں کے بل پر زندہ نکل آیا تھا۔

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ مجھے مسلمان ہونے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس نے اس انداز میں یہ جملہ ادا کیا جیسے وہ چاہتا ہو کہ میں یہ تسلیم کرلوں کہ یہ سوال دراصل مجھے اس سے کرنا چاہئے تھا۔ مگر میرے اندر اس سوال میں کسی قسم کی دلچسپی نہ دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا۔

دراصل میں ایک انتہائی اہم کام میں مصروف تھا۔ میں اپنے چاروں طرف کی ویرانی کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے مجھے جو کچھ دکھائی دے رہا تھا، یہاں تک کہ پنگی سلمان کی ہتھیلی پر رکھے ہوئے سکے بھی جن کی اہمیت اب صرف اتنی بھر رہ گئی تھی کہ ان کا تعلق علمِ مسکوتات سے تھا، باقی تمام کی تمام چیزیں فریب نظر تھیں۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ پنگی سلمان کا کام اطلاعات فراہم کرنا نہیں بلکہ ان کے راستے میں روڑے ڈالنا تھا۔ شاید پنگی سلمان نے میری سوچ کو پڑھ لیا تھا اور اسے اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ میرے پاس صرف ایک خالی کھوپڑی تھی جسے میں اپنے کندھوں کے اوپر ڈھونے پر مجبور تھا۔ اس نے سکے واپس جیب کے اندر ڈال لئے اور اپنے اسی ہات سے ایک ٹوپی برامد کی جسے سر پر رکھ کر اس نے کہا سورج کسی بھی وقت ڈوب سکتا ہے اور خدا آسمان پر بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا ہے، خدا جس نے انسان کو بنانے میں یا تو بہت دیر کر دی ہے یا پھر اسے قبل از وقت بنا کر کسی بھی کام کے لائق نہیں چھوڑا ہے۔ میں حیرت

سے پنکی سلمان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مجھ سے ہاتھ ملائے بغیر حوض کے پانی میں داخل ہو گیا اور اسی طرح ٹخنوں تک پانی میں غرق چلتا ہوا تاریکی میں گم ہو گیا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ میں نے اس کا تعاقب کیوں نہ کیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھے اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ پنکی سلمان تک پہنچنے کا یہ صحیح وقت نہ تھا، کہ انسان، کائنات اور خدا کے سلسلے میں اسے ابھی اور بھی کچھ فاصلے طئے کرنے تھے اور یہ تعاقب میرے لئے قبل از وقت قسم کی چیز ہوتی؟

میں جب اوپر واپس لوٹنے کے لئے سیڑھی کے پاس آیا تو مجھے ٹھٹھک جانا پڑا کیونکہ سینکڑوں مادر زاد برہنہ مرد اس سیڑھی سے نیچے اترتے ہوئے منہدم شدہ عمارتوں کے اندر غائب ہو رہے تھے۔ مجھے ان کے ننگے پن پر کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ یہی وہ صحیح تصویر تھی جسے شادی کے رجسٹر کے صفحات بیان کر رہے تھے نہ کہ وہ مقدس کلمات جن سے اس ننگے پن کو ڈھکنے کی کوشش کی گئی تھی۔ میرے دل نے کہا ان لوگوں کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں، کہ دراصل یہ وہ لوگ تھے جن کا تعلق پنکی سلمان کے شادی کے رجسٹر سے تھا اور اب ان کی نسلیں قائم ہو چکی تھیں، اور یقیناً پنکی سلمان کہیں کھڑا یہ کھیل اس وقت تک کھیلتا رہے گا جب تک میں ہتھیار نہ ڈال دوں۔ میرے دل نے یہ بھی کہا کہ شاید یہ میرے لوٹنے کا وقت نہ تھا۔ اس لئے نہیں کہ میں لوٹنا نہیں چاہتا تھا، بلکہ اس لئے کہ یہ سیڑھی جس کے پائدانوں سے اترتے لوگوں کا تانتا کبھی ختم ہونے والا نہیں، واپس لوٹنے کے لئے نہیں بنائی گئی تھی، کہ مجھے ان شکستہ عمارتوں کی طرف لوٹ جانا چاہئے یہ جاننے کے لئے کہ کیا واقعی یہ لوگ ان عمارتوں میں یقین رکھتے ہیں جن میں وہ داخل ہو رہے تھے اور کیا واقعی وہ وہی زندگی جی رہے تھے جس کا انھوں نے عہد لیا تھا۔ اور یہ بھی کہ میری خالی کھوپڑی کس کام کی رہ گئی ہے؟

دوسری سیڑھی

اس دوسری سیڑھی کی دریافت کے پیچھے، جس کے ذریعے میں اپنی رسائی کو ان گھروں میں ممکن بنانا چاہتا تھا جہاں یہ لوگ جا رہے تھے، ایک چھوٹا سا قصہ ہے۔ میرا ایک دوست جو فڈل کسترو کی عمر کا تھا، اس نے ایک دن چیلینج کیا کہ ہم جسے اوپر یا نیچے کہتے ہیں وہ ایک غلط مفروضہ ہے، کہ چاروں طرف کائنات کی وسعت کو دماغ میں رکھی جائے تو اوپر اور نیچے کا تصور بالکل بے

بنیاد ہے۔لوگوں کا خیال تھا کہ اب وہ اس لائق نہیں رہ گیا تھا کہ اس بالکل ہی سامنے کی بات کے علاوہ کسی نئی دریافت کا اہل ہو سکے۔تو اس افسوس کے ساتھ کہ لوگ اسے سنجیدگی سے نہیں لیتے میرے کستروکی عمر کے دوست نے اپنے تمام کاغذات جلاڈالے جن پر وہ اتنے دنوں سے کام کرتا آرہا تھا۔اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس کا سارا گھر جل کر راکھ ہو گیا۔یہی نہیں، اس آگ میں وہ اپنا حافظہ اوردونوں آنکھیں کھوبیٹھا۔مگر اس آتش زنی کے واقعے سے لوگ اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہو گئے کہ اگر آپ کی آنکھیں نہ ہوں اور آپ اپنے حافظے سے پوری طرح محروم ہو چکے ہوں تو ایسا کچھ بھی نہیں جسے غلط یا صحیح ثابت کیا جا سکے یعنی یہ دنیا وہی ہے جو انسان کی آنکھیں طئے کرتی ہیں یا اس کا حافظہ شکل دے پاتا ہے۔اس طرح میرے کستروکی عمر کے دوست نے ایک ایسا عقدہ سلجھا دیا تھا جس نے لوگوں کی نظروں میں اس کی وقعت بڑھادی۔تو دوسری سیڑھی کی تلاش میں میں نے اپنے کستروکی عمر کے دوست کو یاد کیا اور میری دونوں آنکھیں گویا اور بھی زیادہ دیکھنے کے قابل ہوگئیں کیونکہ مجھے ایک عجیب وغریب زینہ دکھائی دے گیا جو بیک وقت اوپر اور نیچے، دونوں سمت جارہا تھا۔یعنی اس کے ہر پائدان کے ساتھ آپ کو اس چیلینج کا سامنا کرنا پڑتا تھا کہ آپ سمندری سطح سے بیک وقت کچھ انچ اوپر ہو گئے تھے یا کچھ انچ نیچے۔یعنی آپ جو بھی فاصلہ طئے کر رہے تھے اسے اسی تناسب سے کھوتے بھی جارہے تھے۔تو ایسے ہی ایک زینے پر کھڑے میں نے دیکھا اوپر جہاں پر اس کے پائدان ختم ہورہے تھے وہاں بھی آسمان موجود تھا اور نیچے جہاں پر اس کا آخری پائدان تھا وہاں بھی آسمان موجود تھا جیسے دونوں قطبین نے کسی طرح کی سازش رچا رکھی ہو یہاں تک کہ اپنے برجوں پر چمکنے والے ستارے بھی اس سازش کا حصہ نظر آرہے تھے۔یعنی دو سیڑھیوں کے بیچ کا چبوترا ہی اصلی حقیقت تھی۔تو میں نے پنکی سلمان کو یاد کیا۔آخر کوئی تو ہو جو میرے کستروکی عمر کے دوست کا یہ عقدہ حل کرے ورنہ میں تو پنکی سلمان تک کبھی پہنچ نہ پاؤں گا۔

اور یہی وقت تھا جب میں نے پنکی سلمان کو دیکھا جو بیک وقت اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر آرہا تھا۔وہ جب میرے اتنے قریب آگیا کہ مجھ سے ہاتھ ملا سکے تو میں نے مڑ کر اپنے پیچھے کے پنکی سلمان کی طرف دیکھا۔پنکی سلمان میرے اوپر اور نیچے دونوں طرف موجود تو تھا مگر اسے ایک اکائی کی شکل دینا مشکل تھا۔یہ جاننے کے لئے کہ وہ بیک وقت دو پنکی سلمان تھے یا ایک، میں نے زاویہ بدل بدل کر دیکھنے کی کوشش کی، مگر ہر بار مجھے ایک ہی پنکی سلمان نظر آرہا

تھا۔ کیا اس زیرِ زمین دنیا کے سارے ابعاد بالکل بدل چکے تھے؟

سفر کے لئے سمت کا ہونا ضروری نہیں، پنکی سلمان اب اتنا قریب آ چکا تھا کہ ہنس کر میرا ہاتھ تھام سکے۔ ہم لوگ اسی جگہ بیٹھ گئے کیونکہ چلنا اور رکنا اب ہمارے لئے بے معنی ہو چکے تھے۔ جب میں نے اس کا جائزہ لیا تو وہ مجھے پہلے کے مقابلے کچھ کم عمر کا دکھائی دیا۔ کیا یہ دوسری ملاقات ہماری پہلی ملاقات کے پہلے کا واقعہ ہے؟ یا یہاں بھی معاملہ کچھ اور تھا۔ میں سوچنے لگا، اس تک پہنچنے کے راستے میں وہ خود کیوں رکاوٹ بن رہا تھا؟ یہ ٹھیک ہے کہ یہ دنیا اس کی بنائی ہوئی نہیں ہے، مگر اس نے ایک لمبی عمر پائی تھی، اسے کچھ تو پتہ ہونا چاہئے تھا، میرے کستروکی عمر کے دوست کی طرح جس نے اپنی بینائی اور حافظہ کھو کر آخر کار ایک سچائی تک رسائی تو حاصل کر ہی لی تھی جسے آپ تسلیم کریں یا نہ کریں وہ بحث کے لائق تو تھی۔

ہم جس فرش پر بیٹھے تھے وہ فائر برکس کے بنے ہونے کے سبب بالکل سیاہ تھا اور ہمارے پیروں کے آس پاس بڑی تعداد میں چوہے دوڑ لگا رہے تھے۔ مگر ان کی دوڑ میں ایک عجیب یکسانیت، ایک عجیب بوریت تھی جیسے ان کی دوڑ متیعن کر دی گئی ہو۔ پنکی سلمان نے بتایا کہ ان چوہوں کے ساتھ برا یہ ہوا ہے کہ ان کے لئے کسی بلی کی تخلیق نہیں کی گئی ہے۔

یہ کیسے ممکن ہے؟ میں نے سوچا، اور پنکی سلمان کو ہی ہر اس بات کا کیوں پتہ ہے، جس کی مجھے کوئی ضرورت نہیں؟ میں نے دیکھا، پنکی سلمان کے ایک کافی بڑی توند پر اپنی انگلیاں باندھے بیٹھا تھا۔ یعنی وہ اسی دنیا کا باشندہ تھا جس میں بیت الخلائیں ایجاد کئے گئے تھے۔ لیکن جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا، پنکی سلمان کا منہ کھلوانے کی میری ساری کوشش بیکار جانے والی تھی، کہ وہ جو کچھ کہنے والا تھا اس کا تعلق میرے دماغ سے صرف اس حد تک تھا کہ شک وشبہ کی دیوار کو تھوڑی اور اونچی کی جا سکے۔

پنکی سلمان کی آنکھوں کے ڈھیلے کانچ کی طرح سخت مگر دھندلے نظر آ رہے تھے۔ اس نے میری آنکھوں کے اندر گھورتے ہوئے کہا، شاید تم سوچ رہے ہو گے کہ میرے جیسے مرنجامرن انسان نے کوئی عورت دیکھی بھی ہے یا نہیں۔

جب کہ میرے دماغ میں یہ خیال آیا ہی نہیں تھا۔ مگر اچانک مجھے ایسا لگا جیسے یہ خیال پنکی سلمان کے رجسٹر کی دریافت کے پہلے دن سے ہی میرے ذہن میں آ گیا تھا، صرف اپنے کسی

احساسِ برتری کے جذبے کے تحت میں نے اس رجسٹر کو بھی مردوں کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی غلطی کی تھی جس میں عورت صرف اتنی ہی دکھائی دیتی ہے جتنی بھر ہم اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔آہ، یہ پنگی سلمان، یہ کم گو انسان، اس کی خاموشی میں لفظوں کے انبار بھرے پڑے ہیں، اور دوسری طرف ہم جیسے سر پھرے لوگ ہیں جو الفاظ کے گلیشئر پگھلانے کی کوششوں میں مصرف ہیں، اس بات سے بے خبر کہ ہم شور کے علاوہ کچھ بھی پیدا نہیں کرتے۔

اور تب پنگی سلمان نے سیڑھی پر اوپر اور نیچے (مجھے ان اصطلاحات کے لئے معاف کر دیا جائے) کی طرف اشارا کیا جن میں عورتیں قطار در قطار چڑھ رہی تھیں، اتر رہی تھیں مگر ان کے پاس کوئی چہرا نہیں تھا، نہ آنکھیں، نہ ناک، نہ منہ۔ یہ ایک حیرت انگیز واقعہ تھا کہ ہر عورت بیک وقت اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر جاتی نظر آ رہی تھی اور جہاں ان کا تصادم ہو رہا تھا وہ ایک دوسرے کے اندر ضم ہو کر نظروں سے اوجھل بھی ہوتی جا رہی تھی۔

پنگی سلمان میری آنکھوں کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس نے کہا، رجسٹر میں اس نے جتنی عورتوں کے نام درج کیے تھے ان کا وجود اسی دن فنا ہو گیا تھا۔ بعد میں اس نے ان عورتوں کی تلاش کی تو اسے پتہ چلا اس رجسٹر میں اندراج کی تاریخ ان کی زندگی کا آخری دن تھا۔ اس کے بعد وہ عورتیں جانے کہاں کھو گئیں، جانے کیسے ان کے وجود پر سیاہی پھیر دی گئی۔

پنگی سلمان اٹھ کر سیڑھی سے اوپر جانے لگا تو میں نے کسی تجسس کے بغیر نیچے کی طرف بھی دیکھا جہاں وہ زینہ اتر رہا تھا۔ پنگی سلمان جس کی داڑھی نہ تھی، ان عورتوں کی طرح خود بھی اپنی شناخت کھو بیٹھا تھا۔ اور میں نے سوچا کیا پنگی سلمان ان عورتوں کے بیچ گم ہوتے ہوئے اس بات کی تقویت کر رہا تھا کہ چونکہ ہم مرد عورتوں کے اندر سے باہر آتے ہیں ہمیں واپسی کے لئے کسی دوسرے راستے کا علم نہیں ہوتا۔ ہم ساری زندگی واپس عورت کے اندر جانے کا راستہ تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اس شادی کے رجسٹر کا اس کے علاوہ دوسرا کیا جواز ہو سکتا ہے؟

تیسری سیڑھی

اگر ہم ایک چیز کی حقیقت کو دیکھنا چاہیں تو یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم کھڑے ہونے کے لئے کسی دوسری چیز کا سہارا نہ لیں کیونکہ یہ دوسری چیز ہماری ذات کا حصہ بن کر ہمارے نقطۂ

نظر کو سرے سے بدل ڈالتی ہے، نتیجے کے طور پر ہم اس چیز کی حقیقت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ اس کا احساس مجھے ان ان گنت سیڑھیوں کے بیچ کھڑے ہو کر ہوا جو یا تو ایک ہی سیڑھی تھیں جسے مختلف زاویوں نے سینکڑوں ہزاروں سیڑھیوں میں بدل دیا تھا یا وہ سینکڑوں ہزاروں سیڑھیاں تھیں جنھیں میں اپنی ایک اکائی کے ساتھ کسی خاص جگہ کھڑے ہونے کے سبب ایک ہی سیڑھی کے طور پر دیکھ پا رہا تھا۔ مگر اب کہ میں اتنی دور یا پھر یوں کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ اتنا قریب آنکلا ہوں، کیا پنکی سلمان کو میں اتنی ساری سیڑھیوں کے اندر تلاش کر پاؤں گا؟ جب کہ عین ممکن ہے کہ اس بار وہ اپنا چہرا پورے کا پورا بدل چکا ہو اور اس کے پاس اپنا جو بھی باقی بچا ہو وہ اسے چھپانے کے لائق ہو چکا ہو۔ آخر آپ ہوا، مٹی اور افراد کے اثرات سے کب تک مفر پا سکتے ہیں۔

تو پنکی سلمان نے اس مسئلے کا حل یوں ڈھونڈ نکالا کہ اس نے مجھے ڈھونڈ لیا۔ اب میں اس کی آواز تو سن رہا تھا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ کیا وہ شروع سے میرے ساتھ کسی قسم کا کھیل کھیل رہا تھا؟

ایسا نہیں کہ میں خدا کی طرح ہر جگہ موجود ہوں اور مجھے گرفت میں لینا ناممکن ہو، وہ کہہ رہا تھا۔ اور تمہیں مجھے اپنی گرفت میں لینے کے لئے پوری مٹھی کھولنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ پانی کے جہاز میں میں نے اسے ڈریگن کی آنکھوں میں دیکھا تو تھا مگر یہ اس لئے ممکن ہو سکا کیونکہ میں بس اتنا بھر دیکھ سکتا تھا۔ اس طرح میری تخلیق کی پوری کہانی کو تم چند لفظوں میں بیان کر سکتے ہو۔

مجھے پنکی سلمان پر غصہ آنے لگا۔ آخر اس کی کیا ضرورت تھی؟ میں اسے کب اس سے چرانے والا تھا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ میں پنکی سلمان کو تھوڑا تھوڑا کر کے ضائع کرتا جا رہا تھا جس سے بچنے کے لئے اسے یہ راستہ اختیار کرنا پڑا۔ اور جہاں تک خدا کا تعلق ہے، میں نے کب اسے کسی مسئلے کی صورت میں دیکھا ہے۔ مجھے تو یہ تک نہیں معلوم کہ میری تخلیق واقعی کی گئی ہے یا کوئی دوسری شخصیت ہے جو مجھے سوچ رہی ہے۔

میں نے سامنے کی سیڑھی کے پہلے پائدان پر پیر رکھنے کی کوشش کی یہ سوچ کر کہ شاید جب تک میں پائدان طئے کرنا شروع نہ کر دوں میں پنکی سلمان تک پہنچ نہ پاؤں۔ مگر کسی ٹھوس چیز کی جگہ میرا پیر خلاء میں داخل ہو کر رہ گیا اور میں گرتے گرتے بچا۔ تو مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ میں جو دیکھ رہا تھا وہ کوئی سیڑھی تھی ہی نہیں۔ مجھے پنکی سلمان کی ہنسی سنائی دی۔ مجھے لگا اس

ہنسی کا مقصد میرے ارادے پر پانی پھیرنے کا تھا۔ پھر میں نے سوچا، کہیں میں بیکار ہی پنکی سلمان سے ناراض تو نہ تھا، کہیں ایسا تو نہ تھا کہ یہ طلسم خانہ اس کا رچا ہوا نہ ہو۔ آخر ایک قاضی کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے کہ اس پورے معاملے کے سرچشمے کو طور پر ہم اسے دیکھنے کی غلطی کریں۔ پھر میں نے سوچا، اگر یہ ہنسی واقعی پنکی سلمان کی ہے، تو یہ طے ہے کہ وہ آس پاس ہی کہیں پر موجود ہے۔ تو میں نے ان ان گنت سیڑھیوں سے الگ ہونے کی کوشش کی جو ہر طرف نظر آ رہی تھیں مگر ان کے دونوں سرے دھند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ عجیب واقعہ تھا، میں جدھر بھی جا رہا تھا خود کو ان سیڑھیوں کے بیچ پا رہا تھا، جیسے میں ایک طلسمی چبوترے پر گھوم رہا تھا۔ آخر کار میں نے رک کر اپنے کان کھڑے کر لئے کیونکہ دور سے کچھ بچوں کے چلانے اور ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے سوچا میرے لئے پنکی سلمان کو نظر انداز کر دینا آسان ہے مگر شاید اب کھیل پلٹ چکا ہے۔ اب میں اس کے لئے ایک ضروری شئے بن گیا ہوں۔ جس طرح ایک چوہا بلی کے لئے اہم ہو جاتا ہے جسے منہ میں رکھنے سے قبل اسے اس کے ساتھ کھیلنا پسند ہو۔

تم جنھیں سیڑھیاں سمجھ رہے ہو وہ دراصل تم ہو۔ پنکی سلمان کی آواز آئی۔ ایک بچہ جو پیدا ہونے کے لئے صحیح وقت اور جگہ کا انتخاب کرنا چاہتا ہے جسے ان چیزوں کی اجازت نہیں ہے۔ یا ایک لڑکا جسے وہ زندگی جینے سے انکار ہے جو اس کے لئے طے کر دی گئی ہے۔

تو کیا پنکی سلمان کا معاملہ شادی کے رجسٹر تک محدود نہ تھا۔ کہیں پنکی سلمان کے وجود پر پڑے ہوئے پردے کا تعلق کسی دوسری بات سے تو نہیں ہے، وہ جس نے بحری ڈریگن کا سامنا کیا تھا، کیا اس کے لئے ممکن تھا کہ رجسٹر کی خانہ پری اور تھوڑی سی غیر قانونی رقم اور چند مٹھائیوں تک محدود رہتا؟ اور میں نے نئی امیدوں کے ساتھ پھر سے سیڑھیوں پر نظر ڈالی اور دیکھا میں ہر سیڑھی پر موجود تھا، ایک سات سال کا بچہ جس کی آنکھوں میں تجسس کا سمندر موجزن تھا اور دل میں ان دیکھی دنیاؤں کا خوف۔ دوسرے ہی پل میں ایک سترا سالہ چینی لڑکے میں تبدیل ہو چکا تھا جو ہر سیڑھی پر اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک موجود تھا یہاں تک کہ دونوں سرے کی دھند کے اندر بھی وہی کھڑا اپنی منحنی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

تم دیکھ لو، پیدا ہو کر تم نے کیا کچھ کھو دیا ہے، پنکی سلمان کی آواز آ رہی تھی۔ مگر یہ آواز عجیب تھی جیسے بیک وقت ایک سات سال کا بچہ، ایک سترہ سال کا لڑکا اور ایک ستر سال کا بوڑھا

بول رہا ہو۔ تم آنکھیں کھول کر وہی دیکھتے ہو جو تم دیکھنا چاہتے ہو اور اسی طرح بائسکوپ کے ایک بند ڈبے کی طرح اندر ہی اندر تمہاری تصویریں دھندلی پڑتی جاتی ہیں، انھیں دیمک کے کیڑے کھا جاتے ہیں اور ان میں کچھ بھی باقی نہیں بچتا۔ روزِ حشر مجھے اس کے لئے لاکھوں لوگوں کو جواب دینا ہوگا کیونکہ یہ بات نسل در نسل چلتی رہے گی اور میرے گناہ قیامت تک قائم رہیں گے۔ شاید مجھے اس سمندری جہاز سے کبھی باہر آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ شاید اس سمندری ڈریگن کے جبڑوں سے نکل بھاگنا میرے زوال کا پیش خیمہ تھا۔

اس کے بعد پنکی سلمان کی آواز دوبارا سنائی نہ دی۔ عین ممکن ہے کہ وہ میرے بالکل سامنے کھڑا ہوا اور اندر سے خالی ہو چکا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پنکی سلمان کی موجودگی اور عدم موجودگی میں کوئی فرق نہ ہو ان پورانک کہانیوں کی طرح جن میں غیاب اور وجود ایک ہی واقعہ ٹھہرتا ہے۔

//////////

شادی کا رجسٹر کھڑکی کی سلاخوں سے ٹیک لگائے کھڑا ہے اور میں اس کے اندر سے باہر آنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں اپنے دونوں ہات رجسٹر سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو تو چکا ہوں مگر پکڑنے کے لئے میرے پاس ہوا کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ میرا سر پیشانی تک رجسٹر سے باہر آ گیا ہے اور اڑتے ہوئے صفحوں کے تھپیڑے کھا رہا ہے۔ میری آنکھیں رجسٹر کی منحنی سرنگوں کے اندر روپا مچھلیوں کو کلبلاتے دیکھ رہی ہیں جو صفحات سے نکل نکل کر میری پپوٹوں، نتھنوں اور کانوں پر رینگ رہی ہیں، ان کے اندر داخل ہو رہی ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں روشنائی سے بجھے ہوئے کاغذات تیزی سے مٹی میں بدلتے جا رہے ہیں جن سے ابھرتی سڑاندھ میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہے۔ میں رجسٹر سے باہر نکلنے کے لئے اپنی کوشش تیز کر دیتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ یہ رجسٹر مٹی کے ایک ڈھیر میں بدل جائے اور میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کے اندر دفن ہو جاؤں مجھے اس رجسٹر سے باہر آنا ہے۔

مجھے اس رجسٹر سے باہر آنا ہے!

مجھے اس رجسٹر سے باہر آنا ہے!

مجھے اس رجسٹر سے باہر آنا ہے!

☆☆

مرے ہوئے آدمی کی لالٹین

ہر کوئی چننے پر مجبور تھا
مگر وہ کون تھا جو دہشت کا انتخاب کرتا؟
جیمس بلمن (خواب اور پاتال)

وہ اپنا گاؤں جا رہا تھا۔ اسے ٹرین میں اچھی سیٹ ملی تھی جس کے لئے اسے قلی کو دس روپئے الگ سے دینے پڑے تھے۔ اس کے اور کھڑکی کے بیچ صرف ایک آدمی حائل تھا مگر وہ آسانی سے باہر بھاگتے مناظر کا لطف لے سکتا تھا۔ اسے گاؤں چھوڑے تقریباً دو برس ہو گئے تھے اور وہ خوش تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ ایک لمبے عرصے کے بعد چھٹی پر گاؤں لوٹ رہا تھا بلکہ اس لئے بھی کہ اس نے اپنی شادی کے لئے مناسب رقم اکٹھی کر لی تھی اور اسے امید تھی کہ گاؤں پہنچتے ہی ایک ہفتے کے اندر اندر اس کی شادی ہو جائے گی۔

"تم بہت خوش دکھائی دے رہے ہو۔" کھڑکی والے مسافر نے کہا۔ وہ درمیانے قد کا ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اس کا چہرا لمبوترا تھا، پیشانی پر گہری سلوٹیں تھیں اور ٹھوری کے نیچے کنٹھ کی ہڈی غیر معمولی طور پر ابھری ہوئی تھی۔ گھنے خاکستری بالوں کے نیچے اس کی تھکی ہوئی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ایک ذہین انسان تھا۔ اس نے معمولی قیمت کے کرتے پاجامے پہن رکھے تھے اور اس کی گردن سے لپٹا ہوا دھاری دار مفلر کافی پرانا تھا۔ اس کی کینوس کی تھیلی جو اندر کے سامان کے سبب کسی حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح پھولی ہوئی تھی دونوں کھڑکیوں کے بیچ ہُک سے لٹک رہی

تھی۔ ''مگر میں دیکھ رہا ہوں یہ خوشی صرف گاؤں لوٹنے کی نہیں ہے۔ کہیں تم شادی کے بارے میں تو نہیں سوچ رہے ہو؟''

اسے حامی بھرنے میں شروع شروع میں ہچکچاہٹ کا احساس ہوا۔ آخر وہ دونوں کمپارٹمنٹ میں اکیلے مسافر تو نہیں تھے! پھر اس نے سوچا یہ آدمی بلا کا ذہین ہے۔ اگر میں جھوٹ بولا تو پکڑا جاؤں گا۔ تو اس نے اثبات میں سر ہلایا اور معاملے کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

''گرچہ تمہاری شادی کی عمر ہو چکی ہے بلکہ کچھ برس پہلے ہی تمہیں یہ کام کر لینا چاہئے تھا مگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو ہرگز یہ کام نہ کرتا۔'' مسافر نے کہا اور اس نے اپنی تھیلی اتار کر اس سے المونیم کی ایک لالٹین برآمد کی۔ ''اسے دیکھ رہے ہو۔'' اس نے لالٹین کو اوپر اٹھا کر اس کی چمنی کی طرف اشارا کیا جس پر دھویں کا نشان تھا۔ ''یہ میرے ایک رشتے دار کی ہے۔ اس نے شادی کی اور بلا وجہ مارا گیا۔ اب یہ لالٹین ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہے تاکہ مجھے یاد دلاتی رہے کہ شادی انسان کی کتنی بڑی بے وقوفی ہے۔''

ڈبے میں زیادہ تر دیہات کے لوگ بیٹھے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ آدمی کہنا کیا چاہ رہا تھا۔ ایک آدھ کے ذہن میں کچھ سوالات کلبلائے تو تھے مگر اس آدمی کی آنکھوں سے جھلکتی ذہانت سے مرعوب ہو کر انھوں نے خاموشی سادھ لی تھی۔ تو چونکہ یہ باتیں اس سے کہی جا رہی تھیں گاؤں لوٹنے والے شخص پر یہ ذمہ داری آن پڑی کہ وہ دوسرے مسافروں کی خاموشی کے پیچھے کے سوال کی نمائندگی کرے۔

''آپ کے رشتے دار کی کوئی کہانی ہے جس کا سمبندھ اس لالٹین سے ہے؟''

''نہیں نہیں۔ ایک سیدھے سادے آدمی کی کیا کہانی ہو سکتی ہے بھلا؟'' اجنبی ہنسا۔ ''وہ تو پیدائشی بدنصیب تھا۔ لیکن یہ میرا دعویٰ ہے کہ جو کوئی اس لالٹین کا مالک ہوگا یہ اسے شادی جیسی آفت سے دور رکھے گی۔''

اب گاؤں لوٹنے والے کے دل میں گھبراہٹ پیدا ہو گئی۔ کیا واقعی وہ ایسی کوئی غلطی کرنے جا رہا ہے۔ مگر ایک لالٹین کی اتنی بساط کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ انسان کو شادی سے روک سکے۔ اس نے لالٹین کی طرف غور سے دیکھا جسے دوسرے مسافر نے اپنی گود پر رکھ لیا تھا اور اس کی طرف عجیب نظروں سے تاک رہا تھا۔ یہ ایک کم قیمت کی پرانی لالٹین تھی جس کے تیل کے ڈھکن

پر زنگ کا نشان تھا مگر برنر سے نکلے ہوئے فیتلے کی زبان کچھ اس طرح مڑی ہوئی تھی کہ پتہ چلانا مشکل تھا وہ وقتاً فوقتاً استعمال میں رہتی بھی ہوگی یا نہیں۔ پھر اچانک اسے یاد آیا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ شادی کے ارادے سے گاؤں جارہا ہو اور عین ایک ایسے آدمی سے اس کا واسطہ پڑ جائے جس کے پاس شادی کے خلاف ایک ٹھوس کہانی ہو! اس نے شک بھری نظروں سے اجنبی کی طرف دیکھا جس نے جواباً مسکرا کر اس کا کندھا تھپتھپایا۔ ''گھبراؤ مت۔ تم شوق سے شادی کر سکتے ہو۔ میں تمھیں یہ لالٹین یوں بھی دینے والا نہیں۔ تم ابھی اس کے لئے تیار نہیں ہو۔ شاید تمہارے لئے یہی بہتر ہوگا کہ تم اپنے تجربے کے راستے دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرو۔''

چند اسٹیشن بعد اجنبی اپنی تھیلی کے ساتھ ٹرین سے اتر گیا۔ بینچ پر بیٹھے مسافروں نے دیکھا، یہ ایک ویران پلیٹ فارم تھا جس پر بیر کا ایک واحد پیڑ کھڑا تھا جو نہ صرف سرخ و زرد بیروں سے لدا ہوا تھا بلکہ اس کی ایک شاخ سے تار کا ایک پیچ گونی پنجڑا بھی لٹک رہا تھا جس کے اندر ایک سبز رنگ کا طوطا اپنی ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ اس کے سبز پنکھ اور سرخ چونچ پکے ہوئے بیروں کے ساتھ ایک عجیب ہم آہنگی پیدا کر رہے تھے۔

گھر لوٹ کر وہ اس واقعہ کو بھول گیا۔ اس کے گھر والے اسے دیکھ کر بہت خوش تھے۔ انھوں نے اس کے لئے دور کے ایک گاؤں میں ایک لڑکی دیکھ رکھی تھی۔ وہ بہت ہی غریب لوگ تھے مگر لڑکی بلا کی خوبصورت تھی۔ وقت ضائع کئے بغیر ان کی شادی کر دی گئی۔ یہ لڑکی کافی خوش مزاج اور کم گو نکلی۔ اس نے اس کے جسم کا بھرپور لطف اٹھایا۔ دیکھتے دیکھتے ایک ماہ کا عرصہ گذر گیا اور وہ دن آ گیا جب اسے شہر لوٹنا تھا کیونکہ اس کی چھٹی ختم ہو رہی تھی۔ شاید وہ شہر نہ لوٹتا مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اس کے سارے پیسے ختم ہو گئے تھے اور جس غریبی سے تنگ آ کر اس نے شہر کا رخ کیا تھا وہ پھر سے اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا خاص طور پر جب اس پر ایک نئی ذمہ داری آ گئی ہو۔ اس کی بیوی دوسرے لوگوں کے ساتھ اسے اسٹیشن چھوڑنے آئی۔ وہ بہت اداس تھی اور لگاتار روتے رہنے کے سبب اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں گرچہ اب اس نے خود پر قابو پالیا تھا۔

''تم گھبراؤ مت۔'' اس نے اپنی بیوی کو دلاسا دیا۔ ''میں ہر ماہ کم از کم ایک بار آنے کی ضرور کوشش کروں گا۔''

واپسی پر اسے کھڑکی کے پاس جگہ مل گئی۔ وہ راستہ بھر اداس نظروں سے درختوں کو پیچھے

کی طرف بھاگتے دیکھتا رہا۔ اسے یہ سوچ کر حیرت ہو رہی تھی کہ یہ وہی پیڑ تھے جو گاؤں آتے وقت پھولوں اور چڑیوں سے لدے ہوئے تھے۔ پھر ان تیں دنوں میں ایسا کیا ہو گیا تھا کہ وہ ساری چڑیاں غائب ہو گئی تھیں، سارے پھل پھول عنقا ہو گئے تھے؟ ایسا لگ رہا تھا جیسے ٹرین کسی دوسرے راستے سے شہر واپس لوٹ رہی ہو۔

وہ شہر آ تو گیا تھا مگر اب شہر میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ وہ صبح شام اور کبھی کبھی دن میں بھی اپنی بیوی سے موبائل پر ایک آدھ بار بات کر لیا کرتا۔ یہ موبائل چوری کی تھی جسے اس نے بہت سستی قیمت پر اپنی بیوی کو خرید کر دی تھی۔ اس کی بیوی نے کبھی اس سے گھر آنے کی فرمائش نہیں کی۔ صرف ایک بار اس نے کچھ کہنا چاہا مگر کچھ سوچ کر چپ ہو رہی۔ اس نے بار بار کریدنے کی کوشش کی مگر وہ ٹال گئی۔ پھر ایک دن اسے اپنی بیوی کی موبائل بند ملی۔ اس نے بار بار کوشش کی مگر اس سے رابطہ قائم نہ کر پایا۔ اس کے اپنے گھر میں کوئی موبائل نہ تھی۔ اس نے اپنے گاؤں کے ایک پہچان والے کو فون کیا۔ اس نے اس کا گھر جا کر موبائل پر اس کے باپ سے اس کی بات کروائی جس سے اسے پتہ چلا کہ اس کی بیوی میکے گئی ہوئی ہے۔ اسے اپنے سسرال میں کسی دوسرے فون کا علم نہ تھا۔ یوں بھی اس کے سسرال والے بہت ہی غریب اور ان پڑھ لوگ تھے۔ ایک ماہ تک جب اس کی بیوی کا فون نہیں آیا تو اس نے منیجر سے ایک ہفتہ کی چھٹی مانگی۔ منیجر کے پاس اس کی جگہ کوئی دوسرا آدمی نہ تھا۔ اسے چھٹی ملنے میں ایک ماہ کا عرصہ لگ گیا۔ مگر عین گاؤں جانے سے ایک ہفتہ قبل اس پر ڈینگو کا حملہ ہوا اور اسے سرکاری اسپتال میں داخلہ لینا پڑا۔ وہ اس حملے سے مرتے مرتے بچا۔ اسپتال سے برخاست ہونے پر وہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ سفر کے قابل نہ تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور مصیبت بھی آن پڑی تھی۔ اس کی بچت کا ایک بڑا حصہ نہ صرف ختم ہو گیا تھا بلکہ اسے اپنی نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ اس کی طبیعت تھوڑی درست ہوئی تو اس نے ایک دوسری نوکری ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اسے ایک نوکری مل تو گئی مگر اس میں پیسہ برائے نام تھا اور نوکری نئی ہونے کے سبب اسے چھٹی ملنا بھی دشوار تھا۔ مجبوراً اس نے گاؤں لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سوچا، شاید یہ انتظام قدرت کی طرف سے ہو۔ اب اسے گاؤں میں ہی گذارا کرنا ہوگا۔ اسے اپنی بیوی کی فکر بھی ستا رہی تھی۔

اس بار اس کا سفر کافی ویران تھا۔ جاڑا ختم ہو چکا تھا مگر ہوا میں اب بھی خنکی تھی جس کے

جھونکے خزاں کی آمد کا پتہ دے رہے تھے۔ مگر ٹرین کے اسٹیشن سے چھوٹتے ہی اچانک موسلا دھار بارش ہوگئی اور مسافروں کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے جاڑا پھر سے واپس آ گیا ہو۔ کھڑکی پر اپنی داہنی کہنی ٹکائے ہوئے وہ ان ننگے درختوں کی طرف دیکھ رہا تھا جن کے پتے بارش نے گرادئے تھے۔ ڈبے میں بہت کم مسافر تھے۔ ٹرین چھوٹے موٹے اسٹیشنوں میں رک تو رہی تھی مگر کسی ڈبے سے نہ کوئی مسافر اتر رہا تھا نہ کوئی چڑھ رہا تھا۔ میدان اور کھیتوں میں ساذونادر ہی کوئی دکھائی دے جاتا۔ کھڑکی کی سلاخوں سے برفیلا پانی ٹپک رہا تھا۔ اسے اپنی بیوی کی یاد آنے لگی۔ وہ جتنا گاؤں کے قریب ہوتا جارہا تھا اس کے گدرائے ہوئے بدن کے تصور سے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس کے پاس تھوڑے سے ہی پیسے بچے تھے۔ گاؤں میں کام ملنا آسان نہ تھا۔ اسے اس بات کی فکر بھی تھی۔ ٹرین ایک اسٹیشن میں کچھ زیادہ دیر تک رک گئی۔ اس نے دیکھا یہ وہی ویران اسٹیشن تھا جس میں اس نے پچھلی بار بیر کے درخت سے طوطے کا پنجڑا لٹکتے دیکھا تھا۔ مگر اس بار اس میں ایک بھی بیر نہ تھا۔ درخت کے زیادہ تر پتے جھڑ کر اس کی جڑوں پر جو انسانی انگلیوں کی طرح پلیٹ فارم کے کنکریٹ کے فرش پر پھیلی ہوئی تھیں جمع ہو گئے تھے۔ خود پنجڑا طوطے سے خالی تھا۔ اس نے اسٹیشن کا نام یاد کرلیا۔ ٹرین روانہ ہونے کے لئے سیٹی بجا چکی تھی جب ایک مسافر ہلکی ہلکی بوندا باندی سے بچتے ہوئے اپنی تھیلی کے ساتھ کمپارٹمنٹ کے اندر داخل ہوا۔ وہ اس کے روبرو بیٹھ گیا اور رومال نکال کر اپنا چہرا اور ہات پونچھتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

''میں تمہیں یاد ہوں؟''

اسے یاد آ گیا۔

''آپ وہی ہیں نا جن کے پاس مرے ہوئے آدمی کی لالٹین تھی؟ آپ اسی جگہ رہتے ہیں؟''

''وہ لالٹین اب بھی میرے پاس ہے۔ اور تم ٹھیک سمجھے۔ میرا گاؤں یہاں سے دو کوس دور ہے۔ ہم لوگ اسی اسٹیشن سے آنا جانا کرتے ہیں۔'' وہ آدمی مسکرا رہا تھا۔ ''تو تم نے شادی کرلی۔ اور تم اپنی شادی سے خوش ہو۔''

''بالکل۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اور میں اپنی بیوی سے ملنے جارہا ہوں۔'' اس نے اپنی نوکری چھوٹ جانے کی بات اجنبی کو نہیں بتائی۔

''سب ٹھیک ہے تو ٹھیک ہے۔'' اجنبی نے باہر تاکتے ہوئے کہا۔

''آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟'' اس نے اجنبی کی طرف اچنبھے سے دیکھا۔

''تم اپنی اداسی کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہو اس لئے۔ تم اپنے دل کی بات مجھ سے چھپا رہے ہو۔''

''میں نے بتایا نا سب کچھ ٹھیک ہے۔''

''سب کچھ ٹھیک ہے تو ٹھیک ہے۔''

اپنے گاؤں کا اسٹیشن پہنچنے تک اس نے اجنبی سے کوئی بات نہیں کی۔ اجنبی صرف خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے اسے ٹرین سے سامان اتارنے میں مدد دی اور ٹرین جب اسٹیشن سے روانہ ہو رہی تھی تو دروازے پر کھڑے چلا کر کہا۔ ''یاد رکھنا۔ میرے پاس ایک ایسی لالٹین ہے جو تمہارے کام آ سکتی ہے۔''

گاؤں کے راستے پر چلتے ہوئے وہ اس اجنبی کے بارے میں سوچتا رہا۔ جانے وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ اس کے گھر میں بڑی خاموشی تھی۔ اس کے والدین نے بیٹے سے بہت کم باتیں کیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ لوگ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوسری صبح وہ بس میں بیٹھ کر اپنا سسرال روانہ ہو گیا۔ بس دھول اڑاتے ہوئے چل رہی تھی۔ ایک جگہ جہاں درختوں کے ایک جھنڈ کے باہر جانوروں کا ہاٹ لگا ہوا تھا بس کچھ دیر کے لئے رک گئی۔ بس سے باہر نکل کر سڑک کے کنارے وہ اپنی کمر سیدھی کر رہا تھا کہ اسے اپنا بڑا سالہ دکھائی دیا جو ایک جوڑی بیل کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس نے بھی اسے دیکھ لیا اور کترا کر نکل جانا چاہا۔ اس نے اسے آوازیں دیں، کچھ دور تک اس کا پیچھا بھی کیا مگر وہ درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔ چونکہ بس کے اندر اس کا سامان رکھا ہوا تھا اسے واپس لوٹنا پڑا۔ اس عجیب واقعے نے اسے حیران کر دیا۔ بس اسے ایک برساتی نالا کے کنارے چھوڑ کر چلی گئی۔ نالا سوکھا پڑا تھا جس کی جھاڑیاں ہوا میں جھانجر بجا رہی تھیں۔ نالے کے کنارے اوبڑ کھابڑ راستوں پر اسے اپنے سوٹ کیس کے ساتھ ایک کوس چلنا پڑا جب اسے اپنا سسرال نظر آیا۔ یہ ایک ویران سا گاؤں تھا جہاں زیادہ تر کیچڑ کی ٹٹریاں تھیں یا پھوس کے چھپر۔ تقریباً تمام گھروں کی دیواریں مٹی کی تھیں جن کے زیادہ تر کواڑ گل چکے تھے۔ یہ ایک بہت ہی پچھڑا ہوا علاقہ تھا۔ یہاں نہ اسپتال تھا، نہ راستہ، بجلی تھی نہ پانی۔ ایک طرح سے یہ جگہ ملک کے اندر ہوتے ہوئے بھی ملک کے نقشے سے خارج تھی۔ وہاں سب کو پتہ تھا کہ وہ اس

گاؤں کا داماد ہے مگر آج ہر آدمی اس سے نظریں چرا رہا تھا۔ مٹھائی کی دکان سے وہ گڑ کی مٹھائی خرید رہا تھا جب اس نے محسوس کیا، دکاندار اس سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس سے نظریں ملتے ہی وہ چپ ہو گیا۔ اس کے سسر کی موت شادی سے کئی برس قبل سانپ کے کاٹنے سے ہو گئی تھی اور اس کا صرف ایک بڑا سالہ تھا جسے وہ جانوروں کے ہاٹ میں چھوڑ آیا تھا۔ اس کی ساس اسے دیکھ کر رونے لگی۔ اس نے بتایا کہ پچھلے چار مہینے سے اس کی بیوی کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ وہ جس دن اپنے سسرال سے آخری بار لوٹی تھی اس کے دوسرے ہفتے گھر سے غائب پائی گئی۔ تب سے لے کر آج تک اس کی کوئی خبر نہ تھی۔ انھوں نے پولس چوکی میں رپورٹ لکھوا دی تھی۔ اس نے چوکی جانے کی ٹھانی جو سات کوس دور تھی۔ وہ اپنے بڑے سالے کی سائکل چلا کر چوکی پہنچا۔ افسر کم عمر کا تھا اور نوکری پر بحال ہوئے اسے ایک سال بھی نہیں گذرا تھا۔ اسے جب پتہ چلا کہ وہ لڑکی کا شوہر ہے تو اس نے افسوس کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور چائے سے اس کی خاطر کی۔

''اب تک کی چھان بین سے ہم کسی بھی نتیجہ پر پہنچ نہیں پائے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں وہ ایسی لڑکی نہیں تھی کہ کسی کے ساتھ بھاگ جائے۔ اور یہ اغوا کا معاملہ بھی نہیں لگتا۔ اس طرف پھروتی کے واقعات نہیں ہوتے۔ تلاش جاری ہے۔ تم دونوں کے درمیان سب کچھ ٹھیک تو تھا؟''

اس نے بتایا کہ شادی کے بعد وہ صرف اکیس دن ایک ساتھ رہے تھے اور اسے اپنی بیوی میں کچھ غلط دکھائی نہیں دیا تھا۔ خود یہ مدت اتنی قلیل تھی کہ کسی جھگڑے کی شروعات بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ افسر نے اسے بتایا کہ آس پاس کے تھانوں اور چوکیوں کو لڑکی کی تصویر اور تفصیل بھیج دی گئی ہے۔ کوئی خبر ملی تو اس کے سسرال والوں کو دے دی جائے گی۔ اس کے لئے بہتر ہے کہ اپنے سسرال سے رابطے میں رہے۔ وہ چوکی سے باہر آ رہا تھا جب پھاٹک پر کھڑے سنتری نے جس کے بائیں کندھے سے رائفل لٹک رہی تھی کھینی بناتے بناتے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''باگیوں کے گاؤں ما کوئی بیاہ کرے ہے بھلا۔'' اس نے اسے کھینی دیتے ہوئے کہا۔ ''کھبصورت جورو ہی سب کچھ ہو کا؟''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

وہ اپنا سسرال واپس لوٹا تو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ صرف اسے اپنے بڑے سالے کا رویہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ چار دن تک ٹھہر گیا

مگر وہ واپس نہیں لوٹا۔ تو اس نے اپنی ساس سے اجازت لی اور اپنا گاؤں لوٹ آیا۔ وہ اپنے گھر والوں سے نظریں ملا نہیں پا رہا تھا۔

''اب تم کا کرو گے؟'' اس کے باپ نے پوچھا۔

''میرے پاس فالحال کوئی نوکری نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''تھوڑا دن دیکھ لیتے ہیں۔''

وہ اپنے باپ کو کام میں مدد دینے لگا۔ لیکن ان لوگوں کے پاس زیادہ زمینیں نہیں تھیں۔ وہ اپنے گھر کے سامنے اپنے چھوٹے سے تالاب کے کنارے سبزی اگاتے تھے۔ ان کے کھیت گاؤں سے کچھ دوری پر تھے جن کے لئے ڈیپ ٹیوب ویل سے پانی خریدنا پڑتا تھا۔ یوں بھی پانی کی قلت کے سبب علاقے کے زیادہ تر کسانوں کی زمینیں سوکھی پڑی تھیں۔ جو تھوڑا بہت پانی نکلتا وہ پردھان اور اس کے حواری اپنے کھیتوں میں لے جاتے تھے۔ ان لوگوں کے پاس جانور بھی کم تھے۔ اتنا کام نہ تھا کہ دو آدمی کی ضرورت پڑے۔ ایک دن اس نے اپنی بیوی کا ٹن کا بکس پلنگ کے نیچے سے کھینچ کر باہر نکالا اور اس کا قفل توڑ کر اس کے اندر رکھے شادی کے رنگین کپڑے باہر نکالنے لگا۔ بکس کے کھلتے ہی ہلدی اور سستے کافور کی مہک کمرے میں پھیل گئی تھی۔ وہ کپڑوں کو ترتیب سے بستر پر سجاتا جا رہا تھا کہ اس کی نظر اندر رکھے شادی کے تازہ البم پر پڑی۔ شادی کی تصویروں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ وہ کپڑوں کو واپس بکس کے اندر سجا رہا تھا کہ ایک پوسٹ کارڈ کی جسامت کی سیاہ و سفید عکسی تصویر نیچے گر پڑی جو کسی لڑکے کی تھی۔ لڑکا خوبصورت تھا۔ اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر ایک بہت ہی معصوم مسکراہٹ تھی۔ اس تصویر کو ہات میں تھام کر وہ دنگ رہ گیا۔ اس نے تصویر کی بات کسی کو نہیں بتائی اور اپنا سسرال روانہ ہو گیا۔ اس بار اس کے بڑے سالے نے اسے دیکھ کر کترانے کی کوشش نہیں کی۔ اسے معلوم ہوا وہ پرلے سرے کا بے وقوف تھا اور پچھلی بار میلے میں اسے دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ یہی نہیں، وہ چھ کوس دور دوسرے گاؤں میں اپنے ایک رشتے دار کے گھر رک گیا تھا تا کہ اس کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس نے جب اپنی ساس کو لڑکے کی تصویر دکھائی تو وہ زار و قطار رونے لگی۔ یہ اس کے چھوٹے بیٹے کی تصویر تھی جو آٹھ ماہ قبل ہیضہ کا شکار ہو کر مر گیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ شادی کے وقت یہ بات ان لوگوں سے چھپائی گئی تھی۔

وہ واپس گاؤں لوٹا تو پہلے سے زیادہ پریشان تھا۔ اس نے فیصلہ کیا وہ گاؤں میں نہیں رہ سکتا۔ اس نے گھر والوں کو اپنا موبائل نمبر دیا اور کہا کہ اگر اس کی بیوی کی کوئی اطلاع ملے تو وہ لوگ گاؤں کے پبلک بوتھ کے ذریعے اسے خبر کردیں۔

''آخر تم کب تک انتظار کرو گے۔'' اس کے باپ نے کہا۔'' وہ نہ ملی تو ساری زندگی اکیلے رہو گے کا؟''

''کچھ مہینے تو انتظار کرنا ہی ہوگا۔'' اس نے کہا۔ اس نے شہر آ کر ایک دوسری نوکری جوائن کر لی جس میں پیسہ کم تھا۔ اس کے پاس کوئی چارا بھی تو نہ تھا۔ یوں بھی وہ کسی کام میں مصروف رہنا چاہتا تھا۔

جاڑا پھر سے لوٹ آیا تھا۔ پلیٹ فارم پر کھڑا بیر کا درخت سرخ و زرد بیروں سے لدا ہوا تھا۔ اس میں لٹکتے پنجڑے میں اب ایک بلبل زرد کھڑی تھی۔ اس کا چنا اور پانی اسٹیشن ماسٹر کا اردلی ہر روز بدل دیا کرتا۔ اگر بیر کا موسم ہو تو کبھی کبھار ایک آدھ کچایا پکا بیر بھی پنجڑے کے اندر ڈال دیتا جس پر بلبلِ زرد اپنی چونچ سے نشان لگایا کرتی۔ وہ پست قد کا ایک بھاری چہرے والا آدمی تھا جس کی بھوؤں پر کثرت سے بال اگے ہوئے تھے۔ پہلے وہ گیٹ مین کے عہدے پر فائض تھا۔ مگر پندرہ سال پہلے خراب صحت کا بہانہ بنا کر اس نے اپنا تبادلہ اس اسٹین میں کروالیا تھا۔

''ہلدی رام، کبھی تو بولا کرو۔'' وہ جب بھی پنجڑے کا دروازہ کھولتا چڑیا سے بات کرتا۔ ٹرین کی روانگی کے لئے گھنٹی بجا کر وہ اس وقت تک ٹرین کو دیکھتا رہتا جب تک وہ کھیتوں کے درمیان نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی۔ بعد میں وہ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کے باہر اپنے اسٹول پر بیٹھا کھینی بنایا کرتا یا ملاقاتیوں کے لئے دروازے پر پڑی چق ہٹایا کرتا۔ پچھلے پندرہ برس سے اس کا اس اسٹیشن سے تبادلہ نہیں ہوا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا جب بھی اس کے تبادلے کا پروانہ آتا وہ ڈیڑھ سو میل دور ڈوژنل آفس جا کر رو گا کر، بابوؤں کو پیسہ کھلا کر اسے منسوخ کروالیتا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ یہ نکسلیوں کا علاقہ تھا اور کوئی بھی دوسرا آدمی اس کی جگہ آنا نہیں چاہتا تھا۔ چونکہ اس کا کوارٹر اسٹیشن کے بالکل قریب تھا جہاں وہ اپنی رکھیل کے ساتھ رہتا تھا اسے اس انتظام سے سہولت تھی۔ وہ شادی شدہ تھا یا غیر شادی شدہ کسی کو اس کا علم نہ تھا۔ وہ صرف ہر ماہ تنخواہ کے دوسرے دن

اسٹیشن کے باہر واقع ڈاک گھر میں جا کر کچھ پیسے اپنا گھر بھیج دیتا اور بس۔

اس دن وہ برابر والے کمرے میں اسٹیشن ماسٹر کے لئے اسٹوو پر چائے ابال رہا تھا کہ اس نے کھڑکی سے اس آدمی کو لالٹین کی تھیلی کے ساتھ ٹرین سے برآمد ہوتے دیکھا۔ اسٹوو بند کر کے وہ اسٹیشن ماسٹر کی ہدایت کا انتظار کرنے لگا تا کہ ٹرین کی روانگی کی گھنٹی بجا سکے۔ بہت دیر ہوگئی اور اسے کوئی اجازت نہ ملی تو اس نے سوچا وہ مال گاڑی جو اسٹیشن سے تھوڑی دیر قبل گذری تھی شاید سامنے کے اسٹیشن پر اٹکی پڑی ہو۔ وہ اسی حالت میں برامدے پر چھپر سے لٹکتے آہنی ریلنگ کے سامنے کھڑا تھا جس پر چوٹ لگا کر وہ مسافروں کو ٹرین کی آمد یا روانگی کی اطلاع دیا کرتا جب وہ آدمی تھیلی لٹکائے ہوئے اس کے پاس آیا۔ ہمیشہ کی طرح اس نے گردن سے دھاری دار مفلر لپیٹ رکھا تھا۔

''کیسے ہو تم؟'' اس نے اردلی سے کہا۔ ''وہ طوطا، تم نے اس کا خیال نہیں رکھا۔''

''میں ایک دن اس کا دروازہ بند کرنا بھول گیا۔'' اردلی نے شرمندگی کے ساتھ کہا۔

''مجھے حیرت ہے تم نے اتنی آسانی سے اسے کھو دیا۔'' اجنبی نے کہا۔ ''ایک قید چڑیا پنجڑے سے باہر آ کر بھی پنجڑے سے زیادہ دور نہیں جاتی۔''

''میں نے اس کی بہت تلاش کی۔'' اردلی نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے اسے صاحب کا بلا اٹھا کر لے گیا ہوگا۔ بڑا کمینہ بلا ہے۔ وہ پلیٹ فارم پر ہمیشہ گھوما کرتا ہے اور ان دونوں بہت خونخوار ہو گیا ہے۔''

''یہ چڑیا صرف دیکھنے میں خوبصورت ہے۔'' اجنبی نے پنجڑے کی طرف اشارا کیا جس میں بلبلِ زرد اپنا سر پروں کے اندر دفن کئے کھڑی تھی۔ ''اس میں طوطے جیسی بات نہیں۔''

''دو دن پہلے اس کا جوڑا اچانک مر گیا۔ تب سے وہ ہمیشہ اداس رہتی ہے۔ تمہیں اپنا آدمی ملا؟'' اردلی نے اس کی تھیلی کی طرف اشارا کیا۔

''مجھے میرا آدمی مل چکا ہے، صرف ابھی وہ اس کے لئے تیار نہیں ہے۔'' اجنبی نے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے، تمہارا گھنٹی بجانے کا وقت ہو گیا ہے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا، اسٹیشن ماسٹر نے اردلی کو بلانے کے لئے ٹیبل پر رکھی دستی گھنٹی بجائی تھی۔

اجنبی چلتا ہوا بیر کے درخت کے پاس گیا اور پنجڑے میں بند چڑیا کی طرف غور سے

دیکھنے لگا۔ کھانے اور پینے کے خانوں میں رکھے المونیم کے کٹورے لبالب بھرے ہوئے تھے مگر چڑیا کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے ان دنوں کی یاد آئی جب گاؤں دیہات اور اس کے آس پاس کے جنگلوں میں امن تھا اور وہ ندی نالوں کو پھلانگتے ہوئے اونچی نیچی چٹانوں کے درمیان اپنے دوستوں کے ساتھ گھوما کرتا۔ انھیں ایسا لگتا جیسے یہ آسمان اور اس کے نیچے کی زمین اور کھیت زندہ رہنے کے لئے کافی تھے۔ بھوک ان دنوں بھی تھی، گاہے بگاہے قتل اور رہزنی کے واقعات بھی پیش آتے، میلوں ٹھیلوں میں ایک آدھ فساد بھی ہو جایا کرتے، مگر خوف کا یہ ماحول نہ تھا۔ اب لوگ جنگلوں سے کتراتے ہیں، اسٹیشن پر مسافروں کی بھیڑ کم ہوگئی ہے۔ زیادہ تر ہاٹ اور میلے سنسان ہوگئے ہیں۔ سورج ڈوبتے ہی لوگ اپنے گھروں کو لوٹ جانا چاہتے ہیں۔ صرف وہ مرے ہوئے آدمی کی لالٹین اٹھائے اپنے آدمی کی تلاش میں بے خوف وہ خطر آزادی سے گھوما کرتا ہے۔ اسے جنگل میں گھومتے ان نہ نظر آنے والے ہتھیار بند لوگوں کا پتہ تھا جو اس پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ ان کا سامنا کرنے کے لئے بے چین تھا۔ گرچہ اس کے پاس پوچھنے کے لئے کوئی سوال نہ تھا مگر اسے اس بات کا احساس بھی تھا کہ وہ ایسے لوگ نہ تھے جن سے سوال پوچھے جا سکتے تھے۔ اس کی ملاقات نیم فوجی دستوں سے بھی ہو جاتی جو اسے شبہ کی نظر سے دیکھا کرتے۔ وہ ان کی چھاونی کے سامنے سے بلا خوف گذرا کرتا جہاں خاردار تاروں کے اندر ریت کے بنکروں میں فوجی جوان کمانڈو لباس میں گھوما کرتے۔ جانے کیوں اسے گھونسلوں میں بیٹھے بندوق دھاری جوانوں کے چہرے کافی افسردہ نظر آتے۔ ان تمام چیزوں سے کہیں پر کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا، وہ خود سے کہتا۔ جینا آج بھی انسان کی مجبوری ہے اور مرنا تو ایک معمولی سی بات ہے۔ صرف ہم اس لئے مر نہیں جاتے کیونکہ اس سے کہیں پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس نے اردلی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ ٹرین پلیٹ فارم چھوڑ چکی تھی مگر ابھی اس نے رفتار نہیں پکڑی تھی۔

''ایک دن وہ میری تلاش میں آئے گا۔'' اجنبی نے کہا۔ ''تمہیں پتہ ہے تمہیں کیا کرنا ہے؟''

''اچھی طرح۔'' اردلی نے اسے کھینی دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اچھی چائے بنائی ہے۔ تم پینا چاہو گے؟''

''نہیں رہنے دو۔'' اس نے تھیلی پیٹھ سے لٹکالی۔ ''تمہارے اسٹیشن ماسٹر کو یہ اچھا نہ لگے گا۔''

''تم غلط سمجھتے ہو۔'' اردلی نے کہا۔ ''اسے تمہارا آنا برا نہیں لگتا۔ تم جانتے ہو جیسا دن کال پڑا ہے۔ وہ تم سے بات کرنے کی مصیبت مول لینا نہیں چاہتا۔ مگر وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔''

''یہ نئی بات بتائی ہے تم نے۔ اور تم جو میرے ساتھ بات کرتے ہو؟''

''میرا معاملہ الگ ہے۔'' اردلی ہنسا۔ ''میں ایک اردلی ہوں جو لوگوں کو نظر نہیں آتا۔''

''تم ان دنوں کو کیسے بھول سکتے ہو جب تم گیٹ مین تھے اور ڈاکو آئے دن تمہیں اغوا کرنے کی کوشش کرتے؟''

''برے دن گذر جاتے ہیں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ خیر اب مجھے جانا چاہیے۔''

وہ پلیٹ فارم سے اتر کر پٹریاں پھلانگتے ہوئے ڈھال چڑھنے لگا۔ تھیلی پیٹھ پر لٹکائے وہ پتلی پگ ڈنڈی پر احتیاط سے چل رہا تھا۔ اردلی اپنی جگہ کھڑا اسے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے دیکھتا رہا جہاں سے وہ ہمیشہ نمودار ہوا کرتا۔

جنگل اپنی ازلی خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا جس میں دونوں کے بھاری قدموں سے چلنے کی آواز خلل ڈال رہی تھی۔ وزنی بوٹوں کے نیچے خشک پتے چرمرا رہے تھے، سوکھی ٹہنیاں چیخ رہی تھیں اور زمین میں پیدا ہونے والی دھمک سے جاگ کر مٹی میں ملبوس چلپاسے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ دونوں کمانڈو لباس میں تھے۔ ان کے کاندھوں سے لٹکتی رائفلوں کی بٹ پر لگے پیتل کے ٹکڑے لالٹین کی روشنی میں رہ رہ کر چمک اٹھتے۔ لالٹین کو سامنے والے نے اپنے بائیں ہات سے اوپر اٹھا رکھی تھی جس کی کمزور روشنی میں راستہ کسی سانپ کی کینچلی کی طرح کھلتا جا رہا تھا۔ روشنی کے ہالے کے باہر گھپ اندھیرا تھا۔ کبھی کبھار ان کی آواز سے درخت کی چھال سے چپکے کسی پرندے کی آنکھ کھل جاتی اور وہ چیخ پڑتا جیسے اس نے کوئی برا سپنا دیکھا ہو۔

''جانوروں کے بغیر اب جنگل ویران ہو گئے ہیں۔'' لالٹین بردار نے کہا۔ اس نے سر پر ایک فوجی کیپ ڈال رکھی تھی۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اندھیرے میں گھور رہا تھا جیسے اپنی

بینائی کی مدد سے اندھیرے کی پرت کو اتارنا چاہتا ہو۔ پیچھے والے نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دراصل یہ بات اس سے کہی بھی نہیں گئی تھی۔ دھیرے دھیرے پیڑ بلند ہوتے گئے، ان کے نیچے کی جھاڑیاں گھنی ہوتی چلی گئیں۔ درخت کی پھیلی ہوئی ننگی شاخوں پر کہیں کہیں کسی الو کی آنکھ چمک اٹھتی۔ اوپر آسمان میں ستارے کافی صاف اور روشن نظر آ رہے تھے۔ گرچہ یہ گرمی کا موسم تھا مگر ہوا میں خنکی تھی جو ان جنگلوں میں عام طور پر اس وقت ہو جایا کرتی ہے۔ تھوڑے فاصلے پر کچھ لوگوں کے ہیولے نظر آنے لگے۔ یہ ان کا آؤٹ پوسٹ تھا۔ وہ موبائل ٹاسک فورس کے آدمی تھے اور پہرا دے رہے تھے۔ انھوں نے ہاتھ ملا کر ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ وہ کیمپ کے قریب پہنچ گئے تھے جس کی روشنیاں تتلیوں کی مانند چمک رہی تھیں۔ دو بہت ہی نیچی چھولداریاں نصب تھیں جو جھاڑیوں اور پھول پتوں سے نائلن کے جال کی مدد سے تقریباً ڈھک دی گئی تھیں۔ میز پر بیٹری سے جلنے والا ایک لیمپ رکھا تھا جس کی دھیمی روشنی میں کھانا کھایا جا رہا تھا۔ انھیں دیکھ کر ایریا کمانڈر اپنی چھولداری سے باہر نکل آیا۔ اس کے پیچھے فوجی لباس میں ایک کمسن لڑکی برآمد ہوئی تھی۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ لگ رہا تھا اس کے ہالے میں آس پاس کے پیڑ پودے روشن ہو اٹھے ہوں۔ وہ میز کے سامنے رکھی کرسی کی پشت کو تھام کر کھڑی ہو گئی اور ایک ٹک ان تینوں کی طرف دیکھنے لگی۔ نو وارد لالٹین میز پر رکھ کر اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالنے لگا جو کئی تہوں میں لپٹا ہوا تھا۔

''تم نے نقشہ ٹھیک سے تیار کیا ہے؟'' ایریا کمانڈر نے نقشہ میز پر پورا کھول لیا تھا اور آنکھیں سکوڑ کر روشنی میں اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ ''تمھیں یقین ہے جب تک ہم اپنا کام انجام دیں گے ہمارے مخبر ہمارے ساتھ ہوں گے؟ یا وہ پکڑے نہیں جائیں گے؟''

''وہ گاؤں کے سیدھے سادے کسان ہیں۔'' لالٹین بردار نے کہا۔ اس نے پیچ گھما کر لالٹین بجھا دی کیونکہ اب اس کی روشنی اضافی نظر آ رہی تھی۔ ''بہت کم بولنے والے۔ ہم ان پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ وہ اگر پکڑے گئے تو ان کے پاس کہنے کے لئے کچھ زیادہ نہیں ہے۔''

''ایسی ہی ایک مہم میں ہم نے دکشنا کے چھوٹے بھائی کو کھو دیا تھا، تمھیں یاد ہے؟''

''وہ معاملہ دوسرا تھا۔ ہمیں اتنی کم عمر کے بچے کو اس مہم میں نہیں بھیجنا چاہئے تھا۔ وہ پولس فورس کے لئے آسان نشانہ ثابت ہوا۔'' وہ میز سے ایک روٹی اٹھا کر اس کے ٹکڑے کرنے

لگا۔ ''وہ ایک اچھا لڑا کا ثابت ہوتا۔ ہم یہ دکشنا کو دیکھ کر بھی کہہ سکتے ہیں۔'' اس نے لڑکی کی طرف اشارا کیا۔ کمانڈر بجھی ہوئی لالٹین اٹھا کر اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

''اسے تم لوگوں نے کہاں سے حاصل کیا؟''

''اس کے لئے ہمیں ایک آدمی کو مارنا پڑا۔''

''تم نے لالٹین کے لئے ایک آدمی کو مار ڈالا؟''

''ہم بہت دنوں سے اس پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ ہمیشہ یہ تیل سے بھری لالٹین اپنی تھیلی میں لئے گھوما کرتا۔ وہ یقیناً کوئی پولس کا مخبر تھا۔''

''مخبر لالٹین لے کر گھوما نہیں کرتے۔'' اس نے لالٹین میز پر رکھ دی اور اٹھ کر چھولداری کی طرف جانے لگا۔ وہ چھولداری کا پردا ہٹاتے ہٹاتے رک گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ آخر کار اس نے لاپرواہی سے اپنے کندھے اچکائے۔ ''ویسے اس لڑائی میں ان بے مطلب کے خون خرابے سے چھٹکارا ممکن بھی نہیں۔''

لڑکی ایک خالی کرسی پر بیٹھ کر دیر تک ان لوگوں کو روٹی کھاتے دیکھتی رہی۔ وہ چھولداری کے اندر آئی تو اریا کمانڈر ایک فولڈنگ چیئر پر بیٹھا نقشے کا جائزہ لے رہا تھا جسے اس نے بستر پر پھیلا رکھا تھا۔ اس کے ابرو عینک کے اوپر کمان کی طرح تنے ہوئے تھے۔ اس کے ہونٹوں کے بیچ ایک بیڑی سلگ رہی تھی۔

''ہم کچھ دنوں کے لئے گھر جانا چاہتے ہیں۔''

''تمہیں ڈر نہیں لگتا؟ راستے میں بڑا دریا پڑتا ہے جہاں ملیٹری چھاؤنی ہے۔''

''پچھلی بار ہم ماں کو بیمار چھوڑ کر آئے تھے۔ من بہت گھبراوت ہے۔''

''پھر تو جانا چاہئے۔'' وہ دھیرے دھیرے دھوئیں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس نے نقشے کو تہہ کرنا شروع کر دیا۔ وہ لڑکی کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ ''اگر تم لوٹ کر نہ آؤ تو میں سمجھ سکتا ہوں۔ مگر تمہیں پولس سے ہوشیار رہنا چاہئے، خاص طور پر جب وہ پولس کی وردی میں ہوں۔''

''ہم لوٹ آویں گے۔''

''اگر صبح صبح جانا ہے تو ابھی سو جانا چاہئے۔''

آسمان اب بھی تاریک تھا جب اسے اٹھا دیا گیا۔ اس نے اپنے سامان ایک ساڑی پر

رکھ کراس کی گٹھری بنائی، کپڑے بدلے۔اب وہ گاؤں کی ایک ان پڑھ شادی شدہ لڑکی تھی جس نے مانگ میں سیندور سجا رکھا تھا۔جنگل سے نکلتے نکلتے تارے ماند پڑنے لگے۔کھیتوں کی طرف سے ٹھنڈی ہوا بہہ رہی تھی۔پرندوں کی ایک ڈار تیزی سے پروں کو گردش دیتے ہوئے اس کے سر کے اوپر سے گذری۔شاید وہ سورج نکلنے سے قبل اپنی منزل تک پہنچنا چاہتے تھے۔دریا تک پہنچتے پہنچتے آسمان بالکل صاف ہو گیا تھا۔ملیٹری کیمپ پر بڑی چہل پہل تھی۔کھڈ کے کنارے کچے راستے پر کینوس سے ڈھکے کئی ملیٹری کے ٹرک کھڑے تھے۔جگہ جگہ فوجی لباس میں جوان نظر آرہے تھے۔یہ نیم فوجی دستہ کے لوگ تھے۔انھوں نے اس کی طرف گرسنگی سے دیکھا۔دو جوان اس کے پیچھے پیچھے ناؤ تک بھی آئے جو مسافروں، سائکلوں اور جانوروں سے تقریباً نصف بھر چکی تھی۔وہ کنارے کھڑے ایک دوسرے سے فحش مذاق کرتے رہے تھے۔وہ ناؤ کی روانگی سے پہلے واپس لوٹ گئے۔لڑکی سر جھکائے لالٹین کے ہیٹ نما ڈھکن کو دیکھ رہی تھی جس کے نیچے کے مخنی روشندانوں پر کالکھ کے نشان تھے۔لالٹین کو اس نے ناؤ کے پیندے پر اپنے پیروں کے بیچ کھڑی کر دی تھی۔دوسرے کنارے اتر کر کھیتوں کے درمیان دو کوس کی مسافت طئے کرنے کے بعد اسے اپنا گاؤں نظر آیا۔سورج آسمان پر آ چکا تھا۔دھوپ میں کافی تپش تھی۔اسے ابھی سے پسینہ اپنے برا کے اندر بہتا محسوس ہو رہا تھا۔

گھر پر ماں اکیلی تھی۔اسے دیکھ کر اس کا چہرا پیلا پڑ گیا۔اس کے دونوں کان کی لویں پھولی ہوئی تھیں۔اس کا بڑا بھائی ہمیشہ کی طرح گھر پر نہیں تھا۔

''ایسے کھلم کھلا کاہے آتی ہو منیا؟'' ماں کہنی بستر پر رکھ کر اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''تمہیں کچھ ہو وو گیا تو؟''

''دلیٹی رہو نا ماں۔ہم تمہرے واسطے ہی تو آتے ہیں۔''

''ہمرا کیئے پورا ہو چکا گڑیا۔ہم کو پتہ نہیں ہم کاہے لاجیوت ہیں۔تم کب تک رہو گی؟''

''سوچت ہیں شاید اب ہم واپس نہ جئیب۔'' وہ بولی۔ ''تمرا کیا وچار ہے؟''

''اپنا سسرال لوٹ جا بٹیا۔'' اس کی ماں بولی۔ ''تمہرے گھر والے بہت دکھی ہیں۔ داماد بھی دو بار آ چکے ہیں۔چھٹکے کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔میں نے جھوٹ کہہ دیا کہ وہ آٹھ ماہ ادھر ہیضہ سے مر گیلو ہے۔تم اپنے پتی کے سنگ شہر کاہے کو نہیں چلی جاتی؟''

''تمھیں لگتا ہے اب ہم وہاں لوٹ کر جا سکتے ہیں؟'' اس کی ماں خاموش رہی۔ ''ای ان لوگوں کے لئے ٹھیک ہوگا کا؟'' عین اس وقت اس کا بھائی واپس لوٹ آیا۔ وہ شدید غصے میں تھا۔

''اس کا اس طرح کھلم کھلا آنا اچھا ہے کا؟'' اس نے اپنی ماں سے کہا۔ ''پولس اس کے بارے میں کئی بار پوچھ چکی ہے۔ انھیں اب سندیہہ ہونے لگا ہے۔''

''میں یہاں رکنے کے لئے نہیں آئی ہوں۔'' لڑکی بولی۔ وہ اپنے بھائی کی طرف پیار بھری نظروں سے تاک رہی تھی۔ ''اور تم بیاہ کیوں نہیں کر لیتے ببا؟ اس گھر کو ایک ناری کی ضرورت ہے۔''

اس کے بھائی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دیوار کی طرف چہرا کر کے بیٹھ گیا اور رونے لگا۔

سورج افق سے تھوڑا اوپر کانسے کی طرح تمتما رہا تھا جب لڑکی اپنی گٹھری اور لالٹین کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم جا رہی ہو تیا؟'' اس کی ماں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''ہاں۔ ہم نہیں چاہتے ہمرے کارن تم لوگوں پر کوئو مصیبت آئے۔ اور ماں...'' اس نے دروازے سے چہرا موڑتے ہوئے کہا۔ ''... ببا کا جلد بیاہ کرا دو۔ ببا، تم گھاٹ تک میرے ساتھ آ رہے ہو نا؟''

''بالکل بہنا۔ مجھے تمہارے ساتھ جانا اچھا لگتا ہے۔''

دریا بہت جلد شروع ہو جاتا تھا۔ مگر گاؤں سے گھاٹ تک پہنچنے کے لئے انھیں کھیت کی پتلی منڈیروں پر جن میں جگہ جگہ کانٹے دار جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں احتیاط سے دو کوس چلنا پڑتا۔ آسمان میں پرندے بلا رہے تھے۔ کھیتوں میں سناٹا تھا۔ دور کے جنگلوں اور گھروں سے کہاسا سفید دھواں کی طرح پھیلنے لگا تھا جب ببا نے اچانک رک کر اپنی بہن کی طرف دیکھا۔

''دکشنا، تمھیں یاد ہے جب ہم پہاڑی نالے میں تیر سے مچھلیوں کا شکار کرتے تھے؟''

''پانی کے اندر مچھلیوں کو مارنا آسان کام نہیں ببا۔ شاید ہم لوگ ان دنوں مورکھ تھے۔''

''مگر ہم ایک آدھ مچھلی تو پکڑ ہی لیتے تھے نا؟'' وہ مسکرا رہا تھا۔ ''اور وہ چودھرائن کا چھپر جہاں لوکی کی بیلوں میں گلہری اور بلیاں گھوما کرتیں، کتنی آسانی سے تم پتوں کے اندر چھپ جاتیں۔ ایک دن تو ہم لوگ تمھیں بھول ہی گئے تھے۔''

''تم کبھی بڑے نہیں ہو گے ببا۔'' لڑکی نے پیار سے اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے کونے گیلے ہو رہے تھے۔ ''تم مجھے بہت یاد آؤ گے۔''

''تمہارے ہات میں یہ لالٹین کیسی ہے دکشنا؟ میں نے کبھی تمہیں کسی لالٹین کے ساتھ نہیں دیکھا۔''

''جنگل تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو جاتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اور تم اس کی طرف مت دیکھو۔ یہ ایک مرے ہوئے آدمی کی لالٹین ہے۔''

وہ فیری گھاٹ پر پہنچ گئے تھے جہاں ابھی ابھی ایک ناؤ آ کر لگی تھی اور اس سے مسافر، سائکلیں اور جانور باہر آ رہے تھے۔

(غیر مطبوعہ)

☆☆
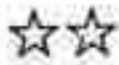
رودِ خنزیر

مقدس باپ تو نے سچ کہا تھا
ہزاروں سال سے ہم اس زمیں پر
صلیبوں کو اٹھائے پھر رہے ہیں
محمد علوی

میں ان دنوں گودی کے علاقے میں سامان اٹھانے کا کام کیا کرتا۔ شام کی طرف، جب میرے پاس کرنے کو کچھ نہ ہوتا، میں اپنے وقت کو دو حصوں میں بانٹ لیتا۔ سورج ڈوبنے سے قبل میں لوہے کے پل پر بیٹھا لوگوں کے جوتے پالش کیا کرتا۔ جب میرے پاس پالش کرنے کے لئے نہ ہوتا میں نیچے کھال میں کشتیوں کو چاند کی کشش کے زیرِ اثر کناروں پر چڑھتے دیکھتا رہتا۔ بانس اور لکڑی کے تختوں سے بنی یہ خستہ حال کشتیاں نائلن کی رسیوں سے ڈھلان پر کھڑے درختوں کے ساتھ بندھی ہوتیں۔ جلد سورج دریا پار دھندلے مکانوں کے اوپر کی کثافت میں غائب ہو جاتا۔ لیکن اس کے بعد بھی قدرتی روشنی کافی دیر تک قائم رہتی۔ آسمان اندھیرے میں دوب چکا ہوتا جب آئس کریم کی ٹرالی کو ڈھکیلتے ہوئے جس پر رنگین چھتری ڈول رہی ہوتی میں میدان کی طرف نکل جاتا جہاں درختوں کی آڑ میں بیٹھے رومانی جوڑوں کو میں اونچے داموں آئس کریم بیچا کرتا۔ ان دنوں میرے پاس بس یہی کام تھے۔ اور اگر آپ مجھ سے دریافت کریں تو میں بتا سکتا ہوں یہ زندگی اتنی بری بھی نہیں تھی۔ میں خود سے کہا کرتا، تم یہ بھول نہیں سکتے کہ تم ایک ایسے آدمی ہو جس نے دوبارا اپنا ملک بدلا ہے۔

اور یہ اٹھارہ برس پہلے کی بات ہے...

(۲)

سورج آسمان پر ہمیشہ کی طرح اپنا فرض نبھار ہا تھا اور میرے والد مغربی پاکستان جانے کے لئے چٹاگانگ کی بندرگاہ میں اپنے دو چرمی سوٹ کیس، ایک ہولڈآل اور ایک کوٹ کے ساتھ جہاز کے عرشے پر کھڑے ہماری طرف تاک رہے تھے۔ ماں کے برعکس جو سانولے رنگ کی ایک معمولی ناک نقشے والی بنگالی عورت تھی، ابا ایک لانبے قد کے گورے چٹے اور کافی وجیہ انسان تھے جن کے گھنے نفیس بال کسی فلمی ہیرو کی یاد دلاتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب میری ماں نے ابھی ہندوستان واپس لوٹنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ دوسری طرف میں صرف سات برس کا تھا اور اس لائق نہیں تھا کہ اپنے بارے میں کوئی فیصلہ لے سکوں۔ مگر دیکھتے دیکھتے دو برس گذر گئے جب ایک دن اچانک ماں نے اعلان کیا کہ ہمارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم اپنا پیدائشی وطن واپس لوٹ جائیں۔ مجھے ماں کی بات سن کر حیرت ہوئی۔ اپنا وطن! مجھے تو اس کی یاد بھی نہیں ہے جب کہ اپنے باپ کے برعکس جو کبھی اِس ملک کی زبان بول نہ پائے، ہم لوگ تو وہی زبان بولتے ہیں جو اس ملک میں بولی جاتی ہے۔

بہت بعد میں، تقریباً نو برس بعد، بسترِ مرگ پر ماں نے مجھے بتایا، وہ میرے باپ کو کھونے کے صدمے سے کبھی ابھر نہیں پائی تھی۔ جہاز پر جانے کے لئے تختہ پر قدم رکھنے سے پہلے ابا نے ہمیں امید دلائی تھی کہ کراچی پہنچ کر وہ جلد ہمیں بلا لیں گے۔ مگر دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں ڈھلتے گئے۔ سمندر میں غیر ملکی جہاز آتے جاتے رہے۔ انھوں نے کبھی لوٹ کر ہماری خبر نہیں لی۔

''ارسلان، تم اپنے دل پر جبر مت لو۔'' ماں نے کہا۔ پچھلے دو سال سے وقفے وقفے سے، جب جب ان پر درد کا شدید غلبہ ہوتا، انھیں اپنی پیٹھ کے نچلے حصے پر اِلاسٹک کے بریسیز پہننے ہوتے تھے۔ یہ بریسیز پہلے سے استعمال شدہ تھے اور جینیوں کے خیراتی اسپتال سے دیئے گئے تھے جہاں ایک مارواڑی تاجر کی سفارش پر ان کی ریڑھ کی ہڈی کی مفت سرجری کی گئی تھی۔ اس تاجر کے گھر ماں نے کچھ دنوں کے لئے نوکری کی تھی۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی کا یہ درد سالوں سال صبح سے شام تک لگاتار لوگوں کے گھروں کو پوچھا لگانے اور بھاری گھریلو سامان ادھر ادھر کرنے کا نتیجہ تھا۔ ان وقتوں میں جب ان کا درد اٹھتا وہ بالکل کام کرنے کے لائق نہ ہوتی

اور زیادہ تر انھیں گھر میں پڑا رہنا پڑتا۔ جس کا مطلب تھا وہ ہماری فاقہ کشی کا دور ہوتا کیونکہ لگاتار چھٹی لینے کے سبب ان کا زیادہ تر کام چھوٹ جاتا۔ مگر اس وقت ماں ایک سرکاری اسپتال میں ایک جان لیوا مرض کی شکار بن کر آئی تھی اور اس وقت جب کہ وہ مجھے دلاسا دے رہی تھی، اسپتال کے وارڈ کے اندر بس اتنی بھر روشنی رہ گئی تھی کہ میلی کچیلی دیوار پر سائے کے نام پر ایک ہلکا سا دھبا بن سکے۔ ماں نے میری دونوں مٹھیاں اپنی مٹھیوں میں تھام کر اپنے مرجھائے ہوئے سینے پر رکھ لیا تھا جیسے میری مٹھیاں وہ اپنے ساتھ دوسری دنیا میں لے جانے والی ہو۔ وہ جن آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی وہ میرے لئے بالکل نئی تھیں۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی کہ اتنے سالوں تک انھوں نے ان آنکھوں کو کہاں چھپا رکھا تھا۔ "وعدہ کرو، تم کبھی اپنے باپ کو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کروگے۔ خدا کا شکر ہے وہ ایک ایسے ملک میں جا بسے ہیں جس سے اس ملک کی دشمنی کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ مگر وعدہ کرو۔"

ایک بار میرا جی چاہا کہ میں اپنے ہات کھینچ لوں۔ مگر ماں لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھیں اور میں ان کی موت کو خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں انتظار کرتا رہا، ماں کی موت کا یا اس بات کا کہ ایسا کچھ ہو جائے کہ ماں کا موت کا ارادہ ٹل جائے۔ آج یہ بتانا مشکل ہے اس دن میں کس بات کا انتظار کر رہا تھا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ یہ کچھ بھی ہوسکتا تھا جس پر اس وقت میرا کوئی بھی اختیار نہیں تھا۔

(۳)

رات دس بجے میں ٹرالی ڈھکیلتے ہوئے واپس لوٹتا تو ہوٹلوں کے علاوہ زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی ہوتیں۔ قریب ہی طوائفوں کا محلہ ہونے کے سبب ان ہوٹلوں میں آدھی رات تک رونق رہا کرتی۔ مجھے کسی بھی ہوٹل کے باہر رکنے کی اجازت نہ تھی کیونکہ ہر ہوٹل کا اپنا آئس کریم کا کونا تھا جہاں کمسن طوائفیں گاہکوں کے ساتھ آئس کریم کی میز پر ہنسی ٹھٹھول کیا کرتیں۔ میں جب ٹرالی بچے کھچے آئس کریم کے ساتھ فیکٹری کے حوالے کر کے گھر لوٹتا تو یہ وقت سڑک چھاپ کتوں کا ہوتا جو میری بو سونگھ کر ہمیشہ مجھے رد کر دیا کرتے۔ دراصل اس مقصد کے لئے انھیں سڑک پر کوئی نہ کوئی پاگل یا بھکاری آسانی سے مل جاتا جس کا وہ اسٹریٹ لیمپ کی ناکافی روشنی میں دور تک پیچھا کیا کرتے۔

ماں نے مرنے کے لئے مزید تین دن کیوں لگایا یہ آج بھی میری سمجھ سے باہر ہے۔ دراصل انھیں تو اسی دن مر جانا چاہئے تھا جس دن انھوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا۔ شاید ان کے لئے مرنا کوئی خاص واقعہ نہ ہو۔

سچ بات تو یہ تھی کہ میں ان کے مرض کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ بس ایک دن ان پر شدید دورا پڑا اور وہ بدن اینٹھتے ہوئے بلبلانے لگی۔ بستر سے اٹھنے کے لئے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔ وہ بار بار اپنے بریسیز کی طرف ہاتھ بڑھا رہی تھی جنھیں میں نے انھیں پہننے میں مدد دی۔ مگر ان بریسیز کے باوجود وہ پھر کبھی بستر سے اٹھ نہیں پائی۔ وہ ساری رات کراہتی اور ٹھٹھرتی رہی جیسے سردی اپنے شباب پر ہو جب کہ پاس پڑوس کے تمام گھروں میں بجلی کے پنکھے چل رہے تھے۔ صبح میں نے دیکھا ان کے جسم میں جگہ جگہ نیلے گومڑ نکل آئے تھے۔ دو دن تک اسی طرح وہ بستر پر پڑے پڑے چھٹپٹاتی رہی جب محلے کے کچھ لوگ ترس کھا کر اسے سرکاری اسپتال لے گئے جہاں ان پر پانی چڑھا دیا گیا۔ ان کے خون کی جانچ کی گئی اور سرکاری ڈاکٹر نے بتایا، یہ گومڑ کسی کتر کر کھانے والے میمل کے کاٹنے کا نتیجہ ہے، مگر اصلی بیماری تو کچھ اور ہے۔ اور یہ ایک خاص قسم کا مچھر ہے جس کے پیرا سائٹ خون کے راستے سیدھے انسان کے دماغ پر حملہ کرتے ہیں اور دیر ہو جانے پر ڈاکٹروں کے کرنے کے لئے کچھ نہیں بچتا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور میرے کان میں سرگوشی کی: بیٹا، تم بڑے ہو گئے ہو۔ بہتر ہوگا کہ تم اپنی ماں کی موت کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو جاؤ۔

جو میں اس دن بھی تیار تھا جب ماں چٹا گانگ کی بندرگاہ میں جیٹی سے کچھ دور ہٹ کر پانی کے بالکل قریب کھڑی تھی جہاں جانے کس امید میں ہم لوگ ہر مہینے ایک آدھ بار بس میں ایک لمبی مسافت طئے کر کے آیا کرتے۔ اس دن آسمان پر کئی رنگ کھیل رہے تھے اور نیچے سمندر کے پانی میں خس و خاشاک ڈول رہے تھے جیسے سمندری مچھلیوں کی طرح ان کی بھی اپنی ایک الگ زندگی ہو۔ اس دن ماں بالکل خاموش تھی۔ شاید ناامیدی نے دھیرے دھیرے ان کے اندر گھر کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ جن نظروں سے سمندر کے پانی کو پشتے کی دیوار سے ٹکراتے دیکھ رہی تھی اس سے ایک پل کے لئے مجھے لگا ماں سمندر میں کود جانے کا ارادہ رکھتی ہو۔ میں نے سختی سے ان کی ساڑی کے کنارے کو اپنی انگلیوں سے پکڑ رکھا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ میرے اس عمل کا

نتیجہ ہو کہ ماں مزید نو برس زندہ رہی اور ایک ایسے اسپتال میں ان کا انتقال ہوا جہاں کے ڈاکٹر مریضوں سے زیادہ ان کے رشتے داروں سے باتیں کرنے کے عادی تھے۔

تمہیں یاد ہے ارسلان... ماں نے مرنے کے ایک دن قبل کہا۔ اس وقت وہ اسپتال میں لوہے کے پلنگ پر لیٹی ہوئی چھت کی چوبی بلیوں کی طرف تاک رہی تھی جن پر رکھی اینٹیں جگہ جگہ سے پلستر جھڑ جانے کے سبب ننگی ہو گئی تھیں... تمہیں یاد ہے وہ دن جب ہم لوگ مجیب الرحمان کو دیکھنے گئے اور لوگوں کا جوش و خروش دیکھ کر تم پھولے نہیں سما رہے تھے۔ تم نے دو کافی بڑے غبارے تھام رکھے تھے جو ہوا میں اڑنا چاہ رہے تھے۔ تم کتنے خوفزدہ تھے کہ کہیں یہ غبارے تمہارے ہاتھ سے اڑ نہ جائیں! ان دنوں ہم لوگ ڈھاکہ میں تھے۔ اور تمہیں وہ دن بھی یاد ہوگا جب فوج نے لوگوں پر قہر ڈھا رکھا تھا اور ہم نے ایک دن ایک زخمی آدمی کو دیکھا جسے رضا کاروں نے ناریل کے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا تھا اور کسی فوجی گاڑی کے گذرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ آدمی دشمن ملک کے اجینٹ کے طور پر کام کر رہا تھا۔ وہ آدمی اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا جب بھیڑ اپنے صبر کا دامن کھو بیٹھی اور کسی نے ایک اسکرو ڈرائیور نکال کر اس کے حلق میں پیوست کر دی۔ حملہ آور نے اسکریو ڈرائیور واپس باہر نکالنے کی کوشش کی تو اس کا لکڑی کا دستہ نکل کر اس کے ہاتھ میں رہ گیا۔ اور شاید تمہیں یہ بھی یاد ہو کہ جب ملک آزاد ہو چکا تھا تو کس طرح ایک پبلک پارک میں جوان لڑکوں کو گھاس پر گرا کر ملیشیا ان کے سینوں میں بیونٹ گھونپ رہی تھی اور یہ ہماری طرح ہی ہندوستان سے بھاگ کر آئے ہوئے لوگ تھے فرق صرف یہ تھا کہ یہ تمہارے باپ کی زبان بولتے تھے۔ بعد میں ہمیں سرکاری ریڈیو سے پتہ چلا کہ ان لولوگوں نے جنگِ آزادی کے خلاف پاکستانی فوج کو تعاون دیا تھا۔

میری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ مرنے سے قبل ماں نے کیوں ان ناخوشگوار واقعات کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ سچ بات تو یہ تھی کہ نہ تو مجھے کسی غبارے کی یاد تھی نہ ان واقعات کی جن کا ذکر ماں نے کیا تھا۔ وہ ہمارے بڑے ہی افراتفری کے دن تھے جب ہم لوگ ہمیشہ سفر پر رہا کرتے، کبھی ڈھاکہ، کبھی چٹا گانگ اور کبھی نواکھالی۔ نرس نے مجھ سے کہا کہ میری ماں پر ہذیانی کیفیت طاری تھی، کہ مجھے ان کی باتوں کا بھروسہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس حالت میں سنا اور دیکھا ہوا کا فرق بالکل مٹ جاتا ہے۔

(۴)

ابا کی روانگی کے بعد ہم لوگوں نے اپنی وفاداریاں بدل لی تھیں اور ہماری زبان کے سبب کوئی ہم پر انگلی اٹھا نہیں سکتا تھا۔ لیکن ماں نے بہت جلد فیصلہ کرلیا کہ ہمیں اپنا پیدائشی ملک واپس لوٹ جانا چاہئے۔ شاید وہ روز روز کے خون خرابے سے تنگ آ گئی تھی۔ شاید انھیں ڈر تھا کہ یہ ملک ہمیشہ انھیں میرے باپ کی یاد دلاتا رہے گا جس پر یہ الزام آسانی سے اور جائز طور پر لگایا جا سکتا تھا کہ وہ پاکستانی فوج کے مخبر تھے۔ میری پڑھائی رک چکی تھی اور کسی نے میرے مستقبل کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ ہم تو بس اس نئے نویلے ملک میں تھوڑے دنوں کے مہمان تھے۔ مگر ماں کو یہ فیصلہ لینے میں دو سال لگ گئے۔ شاید کوئی بھی فیصلہ اکیلے لینے میں وقت لگ جاتا ہے۔ شاید اپنے دل کے کسی گوشے میں اب بھی انھیں اس سمندری ڈاک کا انتظار تھا جو ایک تیسرے ملک کا دروازہ ہمارے لئے کھولنے والا تھا اور وہ اپنے ٹھکانے سے ہٹنا نہیں چاہ رہی تھی۔ لیکن آخر کار وہ دن آ ہی گیا۔ اور پھر ہزاروں لوگوں کی طرح جو چوری چھپے اپنا وطن واپس لوٹ رہے تھے جسے انھوں نے دہائی قبل چھوڑنے کی غلطی کی تھی ہمیں بھی غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے کا موقع مل گیا۔ ''یاد رکھو ارسلان...'' ماں نے اسباب باندھتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنا وطن واپس لوٹ رہے ہو۔ ایک مہاجر پرندے کی طرح جس کا وقت یہاں پر ختم ہو چکا ہے۔ کوئی کچھ بھی کہہ لے، تم کوئی جرم نہیں کر رہے ہو۔ اس بات کو دھیان میں رکھنا بہت ضروری ہے'' بہت بعد میں مجھے اس کا خیال آیا تھا کہ ماں نے شاید ٹھیک نہیں کہا تھا۔ مہاجر پرندے تو بار بار ایک ہی جگہ لوٹ آتے ہیں جب کہ ہمارا سفر یک طرفہ اور آخری تھا جہاں سے اب ہم کبھی واپس آنے والے نہیں تھے۔ میں محلے میں جن لڑکوں کے ساتھ کھیلا کرتا انھیں جب ہمارے بارے میں پتہ چلا تو انھیں کوئی حیرت نہ ہوئی۔ ہندوستان تم لوگوں کے لئے صحیح جگہ ہے، میرے ایک دوست نے کہا جو ہمارے پڑوس میں رہتا تھا، مجھ سے دگنی عمر کا تھا، اور کسی پنسل کی طرح دبلا پتلا اور لمبا تھا۔ وہ طرح طرح کی کتابیں پڑھا کرتا اور اپنی ایک خاص سوچ رکھتا تھا۔ یہاں ہمیشہ تمہارے باپ کے سلسلے میں سوالات پوچھے جاتے رہینگے۔ یاد رکھو، اگر ہوا تمہارے خلاف بہنے لگی یا کسی نے تمہاری مخبری کر دی تو انھیں اس کی کوئی پرواہ نہ ہوگی کہ تمہارے باپ کے ساتھ تم لوگوں کے تعلقات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکے ہیں اور تم اور تمہاری ماں اس ملک کی زبان بالکل مقامی لوگوں کی طرح بول سکتے ہو۔

(۵)

میں وہ سفر کبھی بھول نہیں سکتا۔ مگر میرے لئے بہتر ہے کہ اسے بھلا دوں۔ میں آج بھی اس کے لئے خود کو گناہ گار تصور کرتا ہوں۔ اس دن مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ ایک ہی آسمان کے نیچے زندگی گذارنے کے باوجود لوگ ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہوتے ہیں۔ سچ کہا جائے تو یہ سفر ایسا تھا کہ اس کے بعد میرے لئے دنیا میں حیران ہونے کے لئے بہت کم چیزیں رہ گئی تھیں۔ شاید یہ اس کا نتیجہ ہے کہ اب میں بہت کم باتیں بول پاتا ہوں۔ دوسری طرف نہ میں بہت دیر تک بولتے رہنے والوں کو ٹھیک سے سمجھ پاتا ہوں نہ ان لوگوں کو جو پورے وقت خاموش رہتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے پہلے والے کے پاس کوئی کہانی سرے سے نہیں ہوتی شاید اسی لئے وہ اتنے سارے لفظوں کا سہارا لینے پر مجبور ہوتے ہیں جب کہ دوسرے کے پاس ایک ایسی کہانی ہوتی ہے جسے اس کے لئے الفاظ کی شکل دینا ناممکن ہوتا ہے۔

ہم جب اپنے پیدائشی وطن کے اسٹیشن میں اترے تو ماں کے چہرے پر ناخن کے کھرونچ کے دو گہرے نشان تھے جو پوری طرح سوکھے تو نہ تھے مگر اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ ماں کے ساتھ زندگی بھر رہ جانے والے تھے۔ سارا راستہ ماں کی دونوں آنکھوں میں ایک رقیق مادہ لرزتا رہا تھا لیکن آخر تک اس نے پانی بننے سے انکار کر دیا۔ ماں کو اپنے لوگوں کو ڈھونڈنے میں زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ شاید وہ ہر پل اس جگہ کو اپنے خواب میں دیکھتی آئی تھی۔ یہ شہر کا بہت ہی گنجان علاقہ تھا جہاں ہر نکڑ پر لوہے کے ہائڈرنٹ کھڑے تھے جو گدلا پانی اگلا کرتے اور ٹرام ڈپو کے اندر سے ٹرام گاڑیاں بجلی کے تاروں میں نیلی چنگاریاں جگاتی ہوئی نکلا کرتیں۔ یہاں پر اب بھی پرانے زمانے کی بہت ساری عمارتیں کھڑی تھیں جن کے گنبدوں کے روشندانوں میں مختلف رنگ ونسل کی بلیاں کبوتروں کی تاک میں بیٹھی رہتیں اور اینٹ کی دیواروں پر لیمپ کے آہنی ڈھانچے لگے ہوئے تھے جن کا زمانہ گذر چکا تھا اور اب ان میں روشنیوں کا کوئی انتظام نہ تھا۔ وہاں ہمارے بچے کھچے رشتے داروں کو ہماری کہانی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ایک طرح سے یہ ٹھیک بھی تھا۔ میں دو سال کا تھا جب میرے نانا اپنے قریبی رشتے داروں کو کسی طرح کی بھنک دئے بغیر اپنے نقدی اور زیورات کے ساتھ راتوں رات میری نانی، اماں اور ابا کو لے کر مشرقی پاکستان کوچ کر گئے تھے۔ میری ماں ان کی اکلوتی اولاد تھی جس نے اپنے والدین کی مرضی

کے خلاف شادی کی تھی۔ اب ہمیں لٹے لٹائے واپس آتے دیکھ کر کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ لوگ کس طرح سے ہمارا استقبال کریں۔ انھیں یہ بھی ڈر تھا کہ ہم کہیں نانا کی طرف سے اجمالی جائداد پر دعویٰ نہ کر بیٹھیں۔ جہاں تک ماں کا تعلق تھا، یہ شہر ان کا اپنا تھا۔ اس کے آنگن اور دالانوں میں ان کا بچپن گذرا تھا، اس کے گلی کوچے ان کے جانے پہچانے تھے، اور ان کے ذہن پر اس کے بازاروں اور پاٹھ شالاؤں کی یاد اب بھی تازہ تھی۔ لیکن میرے پاس تو سارا تجربہ ایک اور ہی ملک کا تھا جسکی پیدائش کو میں نے اپنی ننگی آنکھوں سے دیکھا تھا، مگر جس کی شکل پوری طرح طئے ہونے سے پہلے ہی ہم اسے خیر باد کہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس نئے ملک کے لئے جس وفاداری کی ضرورت تھی کیا وہ میرے بس کی بات تھی؟ مگر اس سے زیادہ فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ میں وہ تھا جس نے تاریخی واقعات کو اپنی آنکھوں کے سامنے پیش آتے دیکھا تھا اور ایسے انسان کے لئے اپنی وفاداری کو کوئی بھی شکل دینا آسان ہوتا ہے۔ آج بھی پُل پر بیٹھ کر جوتے چمکاتے وقت میں سوچا کرتا ہوں، میں تاعمر یہ کام نہیں کرنے والا، کہ میرے پاس دوسروں کے سلسلے میں تجربات زیادہ ہیں اور ایک دن میرے پاس کہنے کے لائق اتنی ساری باتیں ہوں گی کہ انھیں سن کر یہ دنیا اپنی انگلی دانتوں کے درمیان دبانے پر مجبور ہو جائے گی۔

(۵)

اپنے قریبی رشتے داروں کے روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کر آخر کار ماں نے ہمارے ایک دور کے رشتے دار کے گھر ایک کمرا کرایہ پر لے لیا تھا جو ہماری زبان ہی بولتے تھے۔ یہ جگہ ہمارے پشتینی مکان سے کافی دور دریا کے کنارے واقع تھی۔ ماں کو یہ جگہ پسند نہیں تھی۔ وہ ہر ہفتے بس میں بیٹھ کر اپنے حق کی لڑائی لڑنے پرانی جگہ جایا کرتی جہاں ہمارے پشتینی مکان کے سارے دروازے ہمارے لئے بند کر دیے گئے تھے۔ انھوں نے ایک وکیل سے بھی رجوع کیا تھا جس نے یقین دلایا تھا کہ وہ ان کی ایک ایک پائی وصول کر دیں گے۔ ماں نے ایک بار مجھے باہر سے وہ کمرا دکھایا تھا جس کے اندر میں پیدا ہوا تھا۔ یہ کمرا کافی بڑا تھا جس میں کئی روشندان تھے اور اس کی دونوں کھڑکیاں دروازوں کی جسامت کی تھیں جن کی جھلملیاں برامدے کی طرف کھلی ہوئی تھیں۔ اس وقت اس کمرے میں میری عمر کا ایک لڑکا چھپر کھٹ پر بیٹھا اس کی دقیانوسی پوششوں کے نیچے سے میری طرف تاک رہا تھا۔ اس کی دونوں سوکھی ٹانگیں پلنگ سے

اس طرح لٹک رہی تھیں جیسے وہ لکڑیوں کی بنی ہوں جن کے خاتمے پر چڑیوں کے پنجے لگے ہوئے ہوں۔ میں نے محسوس کیا وہ مجھ سے کچھ بات کرنا چاہ رہا تھا۔ مگر اسے اس کا موقع نہیں ملا۔ اس کی ماں نے ہمیں دیکھ کر دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ اب میں کبھی ماں کے ساتھ اس جگہ نہیں جاتا۔ ہمارے پرانے علاقے کے برعکس اس نئے علاقے کی گلیوں بازاروں میں ان لوگوں کی اکثریت تھی جو میرے باپ کی زبان بولتے تھے۔ یہ بڑے ہی اکھڑ قسم کے لوگ تھے، مگر بہت جلد مجھے پتہ چل گیا کہ یہ ایک محنت کش قوم تھی۔ شاید ان پر بہت بڑا بوجھ تھا۔ لیکن ہمارے دور کے رشتے دار انھیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ ان کے سلسلے میں ان کی رائے بالکل الگ تھی۔ ان کے خیال میں ہم ان پر زیادہ بھروسہ نہیں کر سکتے تھے۔ شاید میرے باپ کے عمل نے اس بات کو تقویت پہنچائی تھی۔ خود میں نے بازار میں ان چرب زبان پھل والوں کو دیکھا تھا جو کم تر درجہ کے پھل اچھے پھلوں کے ساتھ ملا کر چالاکی سے بیچ دیا کرتے۔ ان کے برعکس آلو پیاز بیچنے والے ملائم چہروں کے مالک تھے جو مجھے پسند آتے۔ وہ سامان والے پلڑے کو بٹکھرے والے پلڑے کے مقابلے کافی حد تک نیچے جھکا دیتے۔ مگر ہمارے رشتے داروں کا خیال تھا ان کے اس عمل سے مرعوب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں جب بھی اکیلا ہوتا وہ میری غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتے۔ ''تم نے کبھی غور نہیں کیا، ان ہندوستانیوں * کے چہروں کا رنگ کبھی نہیں بدلتا اور یہ اچھی بات نہیں۔ تم ایسے چہروں پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ یہ ان کا ایک اور طرح کا فریب ہے۔ انگریزوں کے وقت سے وہ یہ کرتے آ رہے ہیں اور اب انھیں پکڑ پانا ممکن نہیں۔ کوئی نقصان کر کے سامان نہیں بیچتا۔'' اس دن میں نے ایک اور بھی چیز جانی جب ایک پولس والے نے ہمارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور مجھ سے میری ماں کے بارے میں دریافت کیا۔ اسے شاید میرے بارے میں بھی علم تھا۔ ''بچے تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ یقیناً تمھاری پیدائش اس ملک کی نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ مجھے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ وہ میرے باپ کی زبان بول رہا تھا۔ ماں نے اشارا کیا اور میں آنگن چھوڑ کر گلی میں آ گیا جہاں ایک بندر والا تماشہ شروع کرنے سے پہلے اپنی ڈگڈگی بجا رہا تھا اور اکے دکے لوگ جمع ہو رہے تھے۔ دس منٹ بعد وہ پولس والا گلی میں دکھائی دیا۔ میں نے تماشہ چھوڑ کر دور تک اس کا پیچھا بھی کیا۔ وہ بس چلتا گیا اور چلتے چلتے ایک جیپ کے پاس پہنچ گیا جو ایک ہوٹل کے سامنے کھڑی تھی۔ جیپ کے اندر اور بھی کئی پولس والے بیٹھے تھے۔ جیپ

دھول اڑاتی ہوئی سڑک کی بھیڑ میں غائب ہوگئی۔ میں واپس آ رہا تھا جب ماں کو میں نے گلی کے نکڑ پر دیکھا۔ وہ میری ہی طرف آ رہی تھی۔ انھوں نے اپنا سر اوڑھنی سے ڈھک رکھا تھا۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں وہی رقیق مادہ لرز رہا تھا جو ہمیشہ پانی بننے سے انکار کر دیتا۔ ’میرے ساتھ آؤ ارسلان، مجھے تمہاری ضرورت ہے۔‘‘ انھوں نے سختی سے میرا ہات تھام لیا۔ ہم ایک ساتھ چلتے ہوئے ایک سنار کی دکان پر پہنچے جہاں ایک آدمی، جس کے چہرے پر برص نے ملک کا نقشہ بنا رکھا تھا، سلاخوں کے پیچھے بیٹھا تھا۔ وہ فوراً ماں کو پہچان گیا۔ شاید اسے اس بات کا علم نہ تھا کہ اسی درمیان ہم نے دوبار اپنا وطن بدلا تھا۔ بعد میں ماں نے مجھے بتایا کہ وہ ہمارا خاندانی سنار تھا اور جب ان کی شادی نہیں ہوئی تھی وہ میری نانی کے ساتھ ہمیشہ اس دکان میں آیا کرتی۔

ان دنوں اس دکان میں یہ سلاخیں نہیں ہوا کرتی تھیں نہ ہی اس کے چہرے پر برص کا یہ سفید نشان تھا۔ ماں نے اپنے دامن سے ایک کاغذ کی پوٹلی نکالی جسے انھوں نے اوڑھنی کے پلو سے باندھ رکھا تھا۔ اس میں سونے کی ایک ہار پڑی ہوئی تھی۔ اس شخص نے ہار لیتے ہوئے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا۔ ’’بچے جلد بڑے ہو جاتے ہیں۔ تم نے کس اسکول میں اسے ڈالا ہے؟‘‘

’’وہ دس برس کا ہو چکا ہے۔ اب اس کی اسکول کی عمر نہیں رہی۔‘‘ ماں نے جواب دیا۔

’’کم از کم انسان کو زندہ رہنے کے لئے ایک کاغذ تو چاہئے۔‘‘ وہ احتیاط کے ساتھ ہار کا جائزہ لے رہا تھا جب ماں نے اسے یقین دلایا کہ یہ اسی کا ڈھالا ہوا ہے۔ وہ مسکرایا اور اس نے ہار کو پیتل کے ایک بالکل چھوٹے سے میزان کے پلڑے پر ڈال دیا۔ اتنا چھوٹا میزان میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیتل کے منحنی بٹکھرے اور لعل کے سرخ دانے مجھے کسی عجوبے کی طرح نظر آ رہے تھے۔ دونوں پیسے کے بارے میں گفتگو کرنے لگے جس سے مجھے دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو شیشوں کے پیچھے کی چمکتی چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس آدمی نے حساب کرنے کے بعد ایک لال پوتھی ماں کی طرف بڑھا دیا جس پر ماں نے فوراً دستخط کر دیا۔ ہم واپس لوٹ رہے تھے جب ماں نے مجھ سے کہا کہ میں کسی سے بھی اس بات کا تذکرہ نہ کروں۔ ’’یہ ہمارے رشتے داروں کا کمینہ پن ہے۔ انھوں نے پولس کو ہمارے پیچھے لگایا ہے۔ جانے وہ کیا چاہتے ہیں؟ مجھے ان سے یہ امید نہ تھی۔‘‘

شام کو وہ پولس والا دوبارا دکھائی دیا۔ اس بار وہ موٹر سائکل پر تھا جسے اس نے ہمارے

گھر کے ٹھیک باہر روکا تھا۔ ماں نے اس کے لئے چائے بنائی۔ پولس والے نے چائے پیتے ہوئے میری طرف دلچسپی سے دیکھا۔ ''کیا تم بیوقوف ہو؟'' اس نے مجھ سے کہا۔

''وہ بس کم بولتا ہے۔'' ماں بولی اور جب وہ چلا گیا تو میں نے دیکھا ماں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ وہ اپنی مٹھی میں دبی ہوئی باقی رقم کو گھور رہی تھی۔ ''وہ میرا آخری گہنا تھا جسے مجھے گروی رکھنی پڑی۔ اب ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔ مجھے شروع میں ہی سمجھ لینا چاہئے تھا۔ ہم لوگ ناگ کے گھونسلے میں لوٹ آئے ہیں۔''

ایک ماہ کے اندر اندر ہم لوگوں نے وہ علاقہ چھوڑ دیا۔ ایک لوکل ٹرین میں بیٹھ کر ہم کئی گھنٹے سفر کرتے رہے جو مجھے ٹرین پر اپنے پچھلے سفر کی یاد دلا رہا تھا جب ہم سرحد سے گذر کر ایک اجاڑ سے اسٹیشن میں ایک ٹرین میں سوار ہوئے تھے۔ یہ ٹرین جن پٹریوں پر دوڑ رہی تھی ان کے دونوں طرف لہلہاتے کھیتوں کی منڈیروں پر ناریل اور کیلے کے درخت کھڑے ہوا میں جھوم رہے تھے۔ آخر کار ہم ایک صاف ستھرے قصبے میں چلے آئے جہاں کھیتوں کے لا متناہی سلسلوں کے اس پار ایک بڑے شہر کی عمارتیں اور عبادت گاہیں نظر آ رہی تھیں۔ وہاں ماں نے مانگ میں سیندور سجایا اور ایک مکان کرایہ پر لے لیا۔ ماں نے مجھ سے کہا۔ ''ارسلان، میں آخری بار تمہیں اس نام سے پکار رہی ہوں۔ تمہیں اپنا نام بھولنا ہوگا۔ میں نے تمہارے لئے ایک نیا نام اور ایک نیا اسکول چنا ہے۔ ہوسکتا ہے وہاں کلاس میں تم سب سے بڑے لڑکے ہوگے مگر نئے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھنا تمہیں اچھا لگے گا۔'' دوسرے دن وہ مجھے ایک پاٹھ شالہ لے گئی جہاں مجھے پتہ چلا کہ مجھے ایک نیا نام دے دیا گیا ہے۔ مجھے اس سے فرق نہیں پڑا تھا کہ میری ماں نے اپنا نام بدلا تھا یا نہیں۔ دراصل میں اسے جانتا ہی نہ تھا کہ ماں کا ایک نام بھی ہے۔ کلاس میں ایک دن کسی نے مجھ سے میرے باپ کے بارے میں پوچھا۔ جب میں نے اپنی عادت کے مطابق بتایا کہ وہ اب اس دنیا میں موجود نہیں تو کسی کو میری بات سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ بات کلاس ٹیچر کے کان تک گئی تو اس نے مجھے الگ بلا کر میری سرزنش کی۔ انھوں نے کہا مجھے اپنے باپ کے سلسلے میں ایسی بات نہیں کرنی چاہئے، وہ کیسے بھی انسان ہوں ایک بچے کو اپنے بزرگوں کے سلسلے میں احترام کا رویہ رکھنا چاہئے۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی تھی کیونکہ میں نے وہی کہا تھا جو سرحد پار کرتے وقت ماں نے مجھے سکھایا تھا۔ ماں سے جب میں نے اس واقعے کا ذکر کیا تو انھوں نے مسکرا کر مجھے اپنے سینے سے لگا

لیا اور مجھے اپنے باپ کا نیا نام بتایا جسے داخلے کے وقت انھوں نے فارم پر بھرا تھا۔ وہ کافی تھکی ہوئی تھی اور ابھی ابھی میرے نانا کے شہر سے وکیل کے ساتھ مل کر لوٹی تھی جو ہر ماہ ان کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ہڑپ جایا کرتا۔ ماں کے چہرے کی طرف تاکتے ہوئے مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ مجھے اپنے باپ کے اصلی نام کا تو پتہ ہی نہ تھا۔ ظاہر تھا اگر مجھ سے ان کا نام پوچھا جاتا تو بھی میرے پاس جھوٹ کہنے کے لئے کیا تھا؟

(۶)

گودی کے اس علاقے میں شام ہمیشہ ایسے اترتی ہے جیسے کسی نے کچے اپلوں کو آگ لگادی ہو۔ ان اداس اور دھندلی شاموں سے گذرتے ہوئے مجھے وہ برے دن یاد آجاتے جب ہم ساری امیدیں ہار چکے تھے اور ڈھاکہ سے سینکڑوں میل دور ہم نے دریا کے کنارے ایک کچے گھر میں پناہ لے رکھی تھی جسے غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے والوں کے ٹھہرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ یہ دریا کافی کشادہ تھا اور اس کا سبز گھاس سے ڈھکا ہوا کنارا دریا پر بہت نیچے تک جھکا ہوا تھا جس میں جگہ جگہ ایسی بھیانک دراڑیں تھیں کہ انسان ان کے اندر گر کر ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائے۔ ان کناروں پر ایسے اور بھی سینکڑوں کچے گھر بنے ہوئے تھے جن میں دوسرے لوگوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ کچھ گھر ایسے بھی تھے جن کا آدھا یا ایک چوتھائی حصہ ٹوٹ کر دریا کے اندر چلا گیا تھا اور باقی حصہ رہ رہ کر ڈھ رہا تھا۔ یہ کنارے بالکل غیر محفوظ تھے، مگر ان میں ہر روز لوگوں کا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس دن کہاسے نے شام غائب کر رکھی تھی۔ ہمارے پاس کوئی گھر تھا نہ کوئی وطن مگر ہمیں اس بات کا علم تھا کہ کسی بھی پل یا تو ایک نئے ملک کے دروازے ہمارے لئے کھل جائیں گے یا ایک نئی مصیبت ہمارے سر پر ٹوٹ پڑے گی۔ ہم نے ایک خاص جگہ جہاں پانی کم تھا، دریا کو چل کر پار کیا تھا۔ وہاں ماں کو اپنے نقدی کے ایک بڑے حصے سے محروم ہونا پڑا تھا۔ دریا پار کیے یہ ہمیں تیسرا دن ہو رہا تھا۔ ماں کو جس آدمی کا انتظار تھا دو دن سے اس کا کوئی پتہ نہ تھا۔ ہمارے پاس چینی کا ایک ڈبہ اور پاؤ روٹی کے تھوڑے سے ٹکڑے بچے تھے جو اب اتنے باسی ہو چکے تھے کہ چھوتے ہی چور ہو جاتے۔ ہمارے پاس ایک تھیلی چاول کی بھی تھی مگر اسے ابالنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا اور پھر ہمیں سختی سے منع کیا گیا تھا کہ کسی جھونپڑی سے دھواں نہ نکل پائے۔ پانی کے لئے ماں مجھے پکی سڑک پر بھیجا کرتی جہاں ایک ہینڈ پمپ کے پیچھے بیرک کی چھت پر جو بھی

کسی زمیندار کی حویلی رہی ہو گی مگر اب فوج کی تحویل میں تھی، فوجی سگریٹ پیتے ہوئے، کندھوں سے رائفل لٹکائے پہرا دیا کرتے اور اوراپنی گردن سے لٹکتی دوچشمی دوربین سے دریا پار دیکھا کرتے جب کہ وہ جگہ ننگی آنکھوں سے بھی صاف نظر آتی تھی۔ کبھی کبھار جب میں ان کی نظروں میں آجاتا تو وہ ہاتھ ہلا کر اشارا کرتے اور مسکراتے ہوئے کوئی ٹافی یا کاغذ میں لپٹا ہوا کیک کا ٹکڑا پھینک دیتے۔ ہمارا آدمی واپس لوٹا تو اس نے ایک سرخ ٹوپی پہن رکھی تھی جس پر ایک سفید ستارا ٹنکا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ماں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''اسے واپس رکھ لو۔ یہ پیسہ کافی نہیں ہے۔'' اس نے ماں کو پیسے لوٹاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے پاس کوئی گہنا وہنا نہیں ہے کیا؟''

''سارے لٹ لٹا گئے۔'' ماں اس سے آنکھیں چرا رہی تھیں۔ پھر ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ مجھے لگا وہ شاید اس آدمی کو دکھانا چاہتی تھیں کہ انکے پاس اب بھی تھوڑے سے آنسو بچے ہیں۔ اس آدمی نے ٹوپی اتار کر اپنا سر کھجاتے ہوئے ماں کے سراپے کا جائزہ لیا۔ اس کے ننگے سر کو دیکھ کر مجھے بڑی کراہیت کا احساس ہو رہا تھا کیونکہ نہ صرف اس کے سر پر بال برائے نام تھے بلکہ اس کی کھوپڑی کھجلیوں سے بھری ہوئی تھی جس سے مجھے اس کے ٹوپی پہننے کا راز سمجھ میں آگیا۔ ''تم مجھے ایسا کیوں دیکھ رہے ہو؟ تمہارا ارادہ کیا ہے؟'' ماں نے اپنی پیشانی پر گر آئی لٹ کو انگلی سے واپس بالوں کے درمیان لوٹاتے ہوئے کہا۔ ''تم کیوں نہ چل کر بیرک کے افسر سے خود بات کر لو۔'' اس آدمی نے ٹوپی واپس سر پر رکھ کر اپنی جیب سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔ ''تم اسے اپنی بات کہہ سکتی ہو۔ اگر کام بن گیا تو مجھے بھی پیسے دینے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''تمہیں یقین ہے اس سے کام بن جائیگا؟''

''یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں۔ مگر ایسا کئی بار ہو چکا ہے۔ اور آخر میں کچھ لوگوں کے کام بنے تو ہیں۔''

میں آدھی رات تک اکیلا اپنی جگہ گٹھری اور سوٹ کیس کو تھامے بیٹھا رہا۔ کوٹھری کے باہر جھاڑیوں میں ہوا چپ تھی۔ کسی وجہ سے اس دن دریا میں پانی بہت کم تھا اور جگہ جگہ پانی سے ریت کے تودے اس طرح ابھرے ہوئے تھے جیسے دریا میں سینکڑوں گھڑیال آرام کر رہے ہوں۔ کبھی کبھار سفید بادلوں کو چیر کر چاند نکل آتا تو ریت کے گھڑیالوں کی آنکھیں روشن ہو جاتیں۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ کہیں ماں کے آنے سے قبل ہی یہ کچا گھر اپنی کمزور زمین کے ساتھ

ٹوٹ کر دریا برد نہ ہو جائے۔ مگر میں یہ جگہ چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ ماں نے سخت تاکید کی تھی کہ جب تک وہ لوٹ کر نہ آئے میں اس جگہ سے نہ ہلوں۔ میں تقریباً غنودگی کی حالت میں تھا اور اپنی آنکھوں کو کھلی رکھنے کی حتی المقدور کوشش کر رہا تھا جب ماں کی واپسی ہوئی۔ ان کے بال الجھے ہوئے تھے، قدم ٹھیک سے نہیں گر رہے تھے اور ان کے چہرے پر ناخن کے کھرونچ کے دو گہرے نشان تھے۔ یہ نشان مجھے روشنی میں اور بھی بڑے نظر آئے۔

''تم ایسا میری طرف کیوں دیکھ رہے ہو؟ اپنی آنکھیں واپس لو۔'' ماں دھم سے میرے پہلو میں مٹی کے فرش پر بیٹھ گئی۔ انھوں نے جھک کر پانی کی بوتل اٹھائی، کئی لمبے گھونٹ لئے اور لالٹین کی مدھم روشنی میں اپنا چہرا دھویا۔ پانی میں دھل کر اس کے چہرے کا گھاؤ جل اٹھا تھا۔ ان کی آنکھیں تلملا رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر چپ چاپ بیٹھی سانسیں لیتی رہیں، پھر خاموش ہو گئیں۔ باہر چاند ایک بار پھر بادلوں کے پیچھے چھپ چکا تھا جس کے سبب بادل بھی دکھنا بند ہو گئے تھے۔ ایک بار مجھے ایسا لگا جیسے نیچے دریا میں ریت کے گھڑیالوں میں سے کسی نے حرکت کی ہو۔ ماں بالکل بھی سانس نہیں لے رہی تھی۔ تقریباً آدھا گھنٹہ گذر چکا تھا جب ماں نے گٹھری کھول کر اس کے اندر سے ایک کھرپی برامد کی، لالٹین کی لو دھیمی کی اور لالٹین اور کھرپی اٹھائے ایک سائے کی طرح برامدے سے اتر کر جھاڑی کے پاس گئی۔ میں نے برامدے پر کھڑے ہو کر دیکھا، وہ جھاڑی کے نیچے کی زمین کھود رہی تھی۔ گڈھا جب تھوڑا گہرا ہو گیا تو انھوں نے اس کے اندر سے کپڑے کی ایک چھوٹی سی تھیلی برامد کی جسے جانے کب میری لاعلمی میں انھوں نے مٹی کے اندر چھپا دیا تھا۔ لرزتی انگلیوں سے تھیلی کو واپس گٹھری کے اندر رکھ کر جسے سفر کے دوران ماں ہمیشہ اپنی گود میں رکھا کرتی، انھوں نے اسے گرہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''کبھی اس بات کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔'' انھوں نے پیچ گھما کر لالٹین بجھا دی۔

صبح سورج نکلنے سے پہلے وہ سرخ ٹوپی والا آدمی نمودار ہوا۔ ہم نے اپنے سامان سمیٹے اور دریا کے کنارے کنارے اس کے ساتھ چلنے لگے۔ جلد دریا پیچھے چھوٹ گیا۔ ہم تقریباً آدھا دن تک کھیتوں اور میدانوں میں چلتے رہے اور آخر کار ایک کچے راستے پر نکل آئے جس پر ہر سو دو سو گز کی دوری پر تارکول کے بچے کھچے ٹکڑے بتا رہے تھے کہ کبھی یہ ایک پکی سڑک رہی ہوگی۔ سرخ ٹوپی والے نے بتایا کہ کبھی یہ راستہ دونوں ملکوں کے بیچ آمد و رفت کا واحد ذریعہ تھا، مگر اب

اس کی جگہ ایک اور بڑا راستہ نکال لیا گیا ہے جن پر اب سامان بردار ٹرک اور ملیٹری گاڑیاں دوڑا کرتی ہیں۔ اس متروک راستے پر چلتے ہوئے میں نے جو آسمان دیکھا اس جیسا روشن آسمان مجھے پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ ہم نے عجیب وغریب چڑیاں دیکھیں جو جھنڈ بنا کر ہمارا پیچھا کر رہی تھیں۔ وہ رہ رہ کر جیسے ہوا سے نمودار ہوتیں اور پھر ہوا میں غائب ہو جاتیں۔ راستے میں ایک جگہ ماں کے ساتھ اس آدمی کی تکرار ہو گئی۔ اپنے چہرے کے دونوں زخموں سے رستے ہوئے رقیق مادے سے لاپرواہ ماں رندھے ہوئے گلے سے اس آدمی کا ہات تھام کر اسے زبردستی کچھ رقم تھمانا چاہ رہی تھی جسے وہ لینے سے بار بار انکار کر رہا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اتنے تھوڑے پیسے سے مطمئن نہ تھا۔ آخر کار دونوں کے درمیان کسی طرح کا فیصلہ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ تھوڑی دور تک ہمارے ساتھ چلا پھر ہمیں بتائے بغیر جانے کہاں غائب ہو گیا۔ ہم اکیلے ہی ویران راستے پر کئی کوس چلتے رہے۔ ہمیں جگہ جگہ آم کے درختوں کے جھنڈ دکھائی دے رہے تھے جن کے پیچھے ہر آدھے گھنٹے کے بعد کسی نہ کسی چھوٹے موٹے قلعے یا محل کی بوسیدہ فصیل نظر آ جاتی یا تاریخی مسجدوں کے کھنڈر دکھائی دینے لگتے۔ سناٹے میں ٹیلیگراف کے تار بج رہے تھے۔ سورج ڈوب رہا تھا جب ہمیں ایک اجاڑ سا ریلوے اسٹیشن نظر آیا جس کے درختوں میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور پاس ہی کسی مندر میں گھنٹی بج رہی تھی۔ ہم لوگ اس کے پلیٹ فارم پر اپنی چرمی سوٹ کیس اور گٹھری کے ساتھ کھڑے ٹرین کا انتظار کر رہے تھے جب صاف ستھرے لباس میں ملبوس ایک جوڑے نے ہماری طرف دیکھا۔ وہ لوگ میرے باپ کی طرح اپنے ہولڈ آل اور سوٹ کیس کے ساتھ کھڑے تھے جیسے وہ بھی ایک ایسے سفر پر جانے والے ہوں جہاں سے کوئی نہیں لوٹتا۔

''تم لوگ اس ملک کے نہیں لگتے۔'' مرد نے کہا اور انگلی سے ہماری طرف اشارا کیا۔ مگر عورت نے اسے آگے کہنے کا موقع نہیں دیا۔ ''چپ بھی کرو۔'' وہ بولی۔ ''تمہیں کیا لینا۔ یہ ملک سب کا ہے۔ کسی کے ماتھے پر یہ لکھا نہیں ہوتا۔''

ٹرین کے اندر بہت دیر تک چپ بیٹھے رہنے کے بعد میں نے ماں سے پوچھا کہ رات وہ اتنی دیر تک کہاں رہ گئی تھی اور اس نے اس جگہ کیا دیکھا، تو ماں نے مسکرا کر میرے سر کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور کہاں جا سکتی تھی۔ سرحد کے داروغہ کے پاس ہی تو گئی تھی۔ کچھ کاغذات کی خانہ پری کرنے۔''

اس دن مجھے اس بات کا علم نہ تھا۔ مگر آج مجھے پتہ ہے وہ ناخن کے کھرونچ کے نشانات ان کے چہرے پر دائمی طور پر کیوں بن گئے تھے۔ ایک نئے ملک نے اپنے انداز سے ہمارا استقبال کیا تھا۔

''تم کیا سوچ رہے ہو؟'' ماں نے ٹرین کی کھڑکی سے چہرا موڑتے ہوئے کہا۔ انھوں نے اپنے حواس پر پوری طرح قابو پالیا تھا۔

''تم نے اس آدمی سے گہنا کے بارے میں جھوٹ کیوں کہا تھا؟''

''یوں سمجھ لو میرا تمھیں جواب دینے کو جی نہیں چاہتا۔'' اور ماں نے چہرا کھڑکی کی طرف موڑلیا

جس کے باہر دھان کے لہلہاتے کھیت پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے اور ان کی منڈیروں پر کھڑے ناریل اور کیلے کے درخت ہوا میں جھوم رہے تھے۔

(۷)

مجھے ایک بار پھر ماں کی موت کی طرف لوٹ جانا چاہئے۔ ایک عورت جس کے دماغ پر ملیریا کا حملہ ہو چکا ہو کیسے اتنی یادداشت کے لائق ہو سکتی ہے۔ وہ شاید روشنی کے ہوتے ہوئے اندھیرے میں جینے لگی تھی اور پرچھائیوں کو دیکھنے کی عادی ہو گئی تھی۔ تمہیں یہ سن کر دکھ ہوگا ارسلان، ماں نے بند آنکھوں کے ساتھ کہا تھا جیسے وہ اپنے اندر مجھے دیکھ رہی ہو۔ اب جو میں سوچتی ہوں تو مجھے لگتا ہے یہ تم تھے جس کے سبب تمہارے باپ نے پھر واپس لوٹنے کا نام نہیں لیا۔ ممکن ہے اس کے بعد بھی ماں نے اور بھی بہت سارے جملے کہے ہوں مگر اس جملے کو ہی میں بار بار کیوں یاد کر رہا تھا؟ اس لئے نہیں کہ اس سے میرے دل کو چوٹ پہنچی تھی۔ میں جانتا تھا ماں کا یہ ارادہ ہرگز نہ تھا۔ شاید ان کا کوئی ارادہ نہ تھا یا شاید ان کا ارادہ تھا کہ میرے دل میں اپنے باپ کے لئے کوئی گوشہ باقی نہ رہے۔ مگر یہ بیکار تھا۔ میں نے کبھی اپنے باپ کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔ میری ماں میرے لئے اتنی زیادہ تھی، اتنی وافر تھی، انھوں نے چاروں طرف سے اس طرح مجھے گھیر رکھا تھا کہ میرے باپ کو اندر آنے کی اجازت ہی نہ تھی۔ میرے باپ کو شاید میری کم گوئی اور دھیمی حرکتوں سے مایوسی ہوئی تھی اور لڑائی نے انھیں ایک دوسری دنیا میں فرار ہونے کی سہولت عطا کی تھی۔ ماں اگر یہ بات مجھے نہ بھی بتاتی تو بھی میں اسے سمجھ سکتا تھا۔ مگر مجھے اس سے کوئی فرق

پڑنے والا نہ تھا۔ میں ہر حال میں اس حقیقت کے ساتھ سمجھوتہ کر چکا تھا۔ خدا انھیں ایک نئے ملک میں خوش رکھے! اس دنیا میں ہر کوئی اپنی اپنی قسمت کے ساتھ جیتا ہے۔ مگر ماں نے اپنے دل کی آخری پھانس ابھی شاید نکالی نہ تھی۔ ''مجھے افسوس ہے ارسلان...'' انھوں نے اپنی بڑی بڑی زرد آنکھوں کو پوری طرح کھول کر میری طرف آخری بار دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تمھیں ایک اچھی دنیا میں چھوڑ کر نہیں جا رہی ہوں۔''

میرے دل نے کہا، شاید وہ یہ فیصلہ کرنے کا حق نہیں رکھتی۔ اچھی یا بری، مجھے اس دنیا کو اپنے طریقے سے جاننے کا حق ہے۔ ماں صرف یہ کہہ سکتی تھی کہ یہ دنیا اس کے لئے بری ثابت ہوئی، یا پھر یہ کہ اسے اس سے مایوسی ہوئی تھی یا اور کوئی جملہ جس سے انھیں تشفی ہوتی۔ مگر ان کی یہ کوشش کہ میری آخری روشنی بھی بجھ جائے میری سمجھ سے باہر تھی۔ ان کی موت کے بعد میں ان کے ٹھنڈے جسم کے سامنے جانے کب تک بیٹھا رہا۔ آس پاس کے بستروں میں اس بات کے سبب بڑی بے چینی تھی کہ مردہ کو ہٹانے میں اسپتال کے عملے کافی سستی سے کام لے رہے تھے۔ اسٹریچر پر منتقل کرنے سے پہلے نرس جب چادر سے میری ماں کے چہرے کو ڈھک رہی تھی تو اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا ''تمہارے لوگ ڈاکٹر سے سرٹیفکٹ لینے گئے ہیں۔''۔ وہ ایک پل کے لئے چپ ہوگئی۔ پھر اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''سرٹیفکیٹ لینا نہ بھولنا۔ کیا تم ان کی اکیلی اولاد ہو۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مجھے سمجھ لینا چاہئے تھا۔'' نرس نے مجھے اسٹریچر کے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ محلے کے لوگ ماں کو کریہ کرم کے لئے جس دریا کے کنارے لے گئے وہ کوئی دریا نہ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دبیز گھاس سے ڈھکی ہوئی زمین اچانک پھٹ گئی ہو اور اس میں پانی بھر گیا ہو۔ دریا کے کنارے ایک پتھر پر بٹھا کر جو شاید اسی مقصد سے اس جگہ لا کر رکھا گیا تھا کیونکہ اس کے نیچے کی زمین بالوں سے سیاہ ہو رہی تھی حجام نے میرا سر گھونٹا اور جب لوگوں نے میرے ہات سے ماں کے منہ میں آگ ڈلوائی تو میں رو پڑا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں دنیا میں اکیلا ہو گیا ہوں۔ ماں، میں نے کہا، تم نے کیا کبھی سوچا ہوگا کہ مرنے کے بعد لوگ تمہارے ساتھ یہ حرکت بھی کریں گے؟ اس واقعے نے ایک طرح سے مجھے بدل دیا۔ میں نے ان کی چتا پر قسم کھائی کہ ایک دن میں اپنے باپ کو ڈھونڈ نکالوں گا اور انھیں بتاؤں گا کہ کیسے ہم نے ایک فرضی نام کے اندر انھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا ہے۔ ماں کی موت کے بعد میرے لئے اب اس شہر

کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔ میں نے جب گھر چھوڑا تو میرے ساتھ وہی چرمی سوٹ کیس تھا جو اب بری طرح گھس چکا تھا۔ اس میں اور دوسرے سامان کے ساتھ کاغذ کا وہ ٹکڑا بھی تھا جس کی پیشانی پر اسکول کا نام درج تھا اور نیچے ہیڈ ماسٹر کے دستخط کے اوپر میرا اور میرے باپ کا فرضی نام، اس شہر کا ٹھکانہ اور پیدائشی تاریخ لکھی تھی۔ اس کاغذ پر مجھے اپنی ماں کا اصلی یا نقلی نام نہ دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ میں نے اپنی پہلی فرصت میں اسے جلا ڈالا۔ یوں بھی یہ ہر لحاظ سے ایک بیکار کاغذ تھا جس میں دو فرضی نام لکھے ہوئے تھے۔ میں نے ایک لوکل ٹرین پکڑی جو دھندلے تاروں کے نیچے ٹھنڈی ہوا کو چیرتی ہوئی واپس میرے نانا کے شہر کی طرف جارہی تھی۔ کمپارٹمنٹ کے اندر بیٹھا میں دیکھ رہا تھا لوگوں کے چہرے کس قدر رستے ہوئے تھے، جیسے ہر کوئی اپنی کہانی دونوں جبڑوں کے درمیان دبائے بیٹھا ہو۔ اس دن میں نے فیصلہ کیا اس دنیا میں جہاں ہر کسی کی اپنی کہانی ہے، میں اپنی کہانی کسی کو نہیں بتاؤں گا۔

(۸)

اس پرانے گھر کی سیڑھیاں کافی اونچی اور گھماؤ والی تھیں جن پر فرنیچر کو چڑھاتے وقت بار بار زاویہ بدلنا پڑ رہا تھا۔ چوتھی منزل تک پہنچتے پہنچتے ہم کتے کی طرح ہانپنے لگے۔ صوفہ کو اس کی مخصوص جگہ موزیک کے فرش پر رکھنے کے بعد میرے ساتھی نے انگوچھے سے اپنے چہرے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا: ”تو تم کہہ رہے تھے کہ تم مسلمان ہو اور تمہاری ماں ہندو تھی؟“

”نہیں، کیا میں نے ایسا کہا؟“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ بھی مسلمان تھی۔ مگر مرنے کے بعد ان کی چتا کو آگ دی گئی۔ اور جن لوگوں نے یہ کیا وہ برے لوگ نہ تھے۔ ہم میں سے ہر کوئی وہی کام کرتا ہے جسے وہ اپنے طور پر اچھا سمجھتا ہے۔“ مجھے اپنی بات پر حیرت ہوئی۔ میں کیسے اتنی لمبی بات کر پایا۔ کیا ماں کی موت کے ساتھ میری گویائی مجھے واپس مل گئی تھیں؟

”تم بیوقوف تو نہیں ہو۔“ میرے ساتھی نے کہا۔ ”یا شاید مجھے بیوقوف سمجھتے ہو۔“

ہم دونوں ہر صبح سڑک پر ایک خاص جگہ بیٹھ کر کام کا انتظار کرتے۔ ہماری کوشش ہوتی کہ ہم ایک ساتھ رہیں۔ ایسا کیوں تھا ہمیں اس کا علم نہ تھا۔ ایک بار ہم دونوں الگ الگ جگہ کام کرنے گئے تو سارا دن مجھے بڑی ویرانی کا احساس ہوا۔ دوسرے دن اس نے بھی کچھ ایسی ہی بات بتائی۔ ایسا نہیں تھا کہ ہم دونوں کے درمیان باتیں کرنے کے لئے بہت کچھ تھا۔ ہمارے

درمیان زیادہ تر خاموشی کی حکمرانی ہوتی۔ مگر دھیرے دھیرے مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ میرے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہو رہا ہے، کہ نہ چاہتے ہوئے بھی میں کھلتا جا رہا ہوں اور اب ضروری ہو گیا ہے کہ میں اپنی جگہ بدل لوں۔ مگر وہاں پر جگہ بدلنے کے لئے نہیں تھی۔ دہائیوں سے یہ مزدوروں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ اور پھر جس چینی دندان ساز کے مطب کے سامنے ہم بیٹھا کرتے وہ ہمارے لئے کافی سازگار بھی ثابت ہوئی تھی۔ تو کیا یہ میری اس سوچ کا نتیجہ تھا کہ ایک دن وہ اور پھر نظر نہ آیا؟ اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ہمشہ کے لئے غائب ہو گیا ہے تو مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوئی کہ میرے اندر کبھی اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں جاننے کی خواہش کیوں نہ پیدا ہوئی؟ مگر خود میں نے اسے اپنی ماں کی موت کے علاوہ اپنے بارے میں اور کچھ بتایا کیوں نہیں تھا؟ خود اس موت کے بارے میں میں نے بات ہی کیوں کی جب کہ اس میں بتانے کے لائق کچھ نہ تھا سوائے اس کے کہ یہ لوگوں کو اور بھی حیران کر سکتی تھی؟ آج مجھے یاد نہیں آتا کہ وہ کیا وجہ تھی کہ ہمارے بیچ ماں کی موت کا تذکرہ آنکلا تھا۔

جیسا کہ میں نے اپنی ماں کی چتا پر قسم کھائی تھی، مجھے اپنی زبان کو قابو میں رکھنا چاہئے۔ مگر شاید میں اپنی آزادی کا غلط استعمال کرنے لگا ہوں۔ ٹرین سے اترنے سے پہلے میں نے اپنا اصلی نام واپس حاصل کر لیا تھا۔ میں نے ایک اور بھی نام رکھ لیا تھا جس کا کوئی بھی مطلب نہیں نکلتا تھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ ایسے ایک نام سے کافی سہولت ہوتی ہے۔ سچ پوچھیں تو اس نام سے اگر لوگ مجھے ایک ماہ نہ پکاریں تو میں خود اسے بھول سکتا ہوں۔ مگر میری گلی میں ایک عورت ہے جو مجھ سے دس سال بڑی ہے۔ وہ نہ صرف میرے اصلی نام سے واقف ہے بلکہ اس نے میرے دونوں ناموں کو اچھی طرح سے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ یہ گلی جس میں میں کرایے پر رہتا ہوں دو کشادہ سڑکوں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہے۔ اس گلی کے ایک سرے پر جو سڑک ہے وہاں پولس کی چوکی سے بالکل قریب ہر رنگ وروغن کی طوائفیں کھڑی رہتی ہیں جن کی چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں دومنزلہ سہ منزلہ گھروں کے اندر بنی ہیں۔ یہ طوائفیں اپنے گاہکوں کے ساتھ ان گھروں میں لوٹتی ہیں جب کہ گلی کے دوسرے سرے پر کھپریل کے ایسے ہی گھروں کے بیچ ایک دومنزلہ مسجد واقع ہے جس کا پھاٹک ایک دوسری کشادہ سڑک پر کھلتا ہے جہاں گوشت کی دکانوں اور بیف ہوٹلوں کی بھرمار ہے اور لنگی کرتا پہنے، سر پر ٹوپی چپکائے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد آدھی رات تک کھڑی

دکھائی دیتی ہے۔اس جگہ وہ نوجوان لڑکے بھی بھیڑ لگاتے ہیں جو کانوں میں بالیاں لٹکائے ،کھینی گھستے ہوئے طرح طرح کی گالیاں ایجاد کیا کرتے ہیں اور دکان کے سامنے بینچوں پر بیٹھ کر یا فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر گذرتی عورتوں اور لڑکیوں پر اپنی عقابی نظریں ڈالتے رہتے ہیں۔ایسا لگتا ہے جیسے اس دنیا میں ان کے آنے کا بس یہی مقصد رہ گیا ہو۔گرچہ اس عورت کا رنگ میری ماں کی طرح ساونلا ہے مگر اس کا ناک نقشہ میری ماں کے مقابلے زیادہ پرکشش ہے۔وہ طوائف والے سرے سے آئی ہے جہاں کچھ سال پہلے تک اس کی اپنی ایک کوٹھری تھی اور وہ سڑک پر کھڑی گاہکوں کا انتظار کیا کرتی تھی۔مگر اب اس نے اس مسجد کے قریب اپنا ٹھکانہ بنا لیا ہے جہاں وہ اپنے طوطوں کی دیکھ بھال کیا کرتی ہے یا جائے نماز پر بیٹھی تسبیح گنتی رہتی ہے یا پھر پیر فقیر کے مزاروں کی زیارت کرتی پھرتی ہے۔اس نے اپنے دروازے پر ایک سبز جھنڈا لٹکا رکھا ہے جس پر صندل سے ہاتھ کا نشان بنا ہوا ہے۔وہ ہر جمعہ اور ہر تہوار پر کسی نہ کسی مولوی کو بلا کر کسی پیر یا فقیر کے نام پر نیاز یا فاتحہ خوانی کرواتی ہے اور اپنے گھر سے لے کر نکڑ تک لوگوں میں شیرنی تقسیم کرتی ہے جو زیادہ تر چینی یا بتاسے پر مشتمل ہوتی ہے۔اسی بہانے اس نے مجھ سے بھی پہچان بنا لی ہے۔
''تمھیں ایک ایسی عورت کی ضرورت ہے جو عمر میں تم سے کافی بڑی ہو۔'' اس نے ایک دن مجھ سے کہا۔''کیا تم نے شادی کے بارے میں سوچا ہے؟ دن گذر جاتے ہیں۔کیلے کے درخت میں دوبار پھول نہیں آتے۔''

مجھے اس کی بات سن کر کوئی حیرانی نہ ہوئی تھی۔سچ کہا جائے تو ان دنوں میں ہر وقت شادی کے بارے میں سوچنے لگا ہوں۔دراصل لاشعوری طور پر میں یہ سوچنے لگا ہوں کیا اپنے باپ کی طرح میں اپنے ہونے والے بچے سے پیچھا چھڑا سکتا ہوں؟ میں نے اس عورت کو ایک مرد کی نظر سے بھی دیکھا ہے۔جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے اس کا ناک نقشہ کافی پرکشش ہے۔ صرف اس کا پیٹ کافی بڑا ہے جیسے اس کے اندر کوئی ٹیومر پل رہا ہو۔اس جیسی بڑے پیٹ والی عورتوں کے لئے ایک خاص طرح کے مردوں کے اندر کافی کشش ہوتی ہوگی ،مگر میں وہ مرد نہیں تھا۔اور فالحال میں اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں رہا ہوں۔میں تو صرف شادی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔نہیں میں شادی کے بارے میں نہیں سوچ رہا ہوں بلکہ اس شادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔لیکن شاید میں اپنے ہونے والے بچے سے

زیادہ یہ سوچ رہا ہوں کہ اس سے پیچھا چھڑانا کیسا رہے گا۔ میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ میں جو اتنا کچھ سوچتا ہوں اور اتنا کم بول پاتا ہوں کیا میں اس کا اہل بھی ہوں کہ مجھ سے کسی عورت کا حمل ٹھہر جائے، خاص طور پر ایک ایسی عورت کا جس کے پیٹ میں ٹیومر پل رہا ہو۔ کچھ دنوں سے وہ میرے لئے اچھی اچھی چیزیں پکا کر لانے لگی ہے کیونکہ میرے کمرے تک پہنچنے کے لئے اسے صرف گلی پار کرنی پڑتی ہے۔ اس کے گھر میں ایک چھوٹا سا آنگن ہے اور ایک برامدہ جہاں کئی لوہے کے پنجڑے چھپر کے کنڈوں سے لٹکتے رہتے ہیں۔ ان پنجڑوں کے اندر سبز رنگ کے طوطے بند ہیں جو رہ رہ کر کرخت آوازیں نکالنے کے عادی ہیں۔ باقی وقتوں میں یا تو وہ چپ کھڑے رہتے ہیں یا پانی اور چنے کے پیالوں میں چونچ ڈالتے نظر آتے ہیں۔ ان طوطوں کے سبب نیچے کا فرش ہمیشہ گیلا رہتا ہے جسے صاف رکھنے کے لئے اسے کافی محنت کرنی پڑتی ہے۔ وہ ان طوطوں کو کبھی کوئی زبان نہیں سکھاتی۔ ''میں نے ان کے کاروبار میں اچھا پیسہ بنایا ہے۔ یہ طوطے کرشمے دکھاتے ہیں۔'' ایک دن اسنے مجھے بتایا۔ ''میں نے بہت گناہوں بھری زندگی گذاری ہے۔ کیا سمجھتے ہو خدا مجھے معاف کرے گا؟ لیکن میں نے کافی دکھ بھی اٹھائے ہیں۔ کیا میرے ساتھ انصاف ہوگا؟''

''مجھے نہیں معلوم خدا کیا سوچتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

(۸)

اس حقیقت سے میں انکار نہیں کرتا کہ خدا کو سمجھنے کے لئے میرے پاس کبھی مناسب وقت نہیں رہا۔ بس واقعات یکے بعد دیگے پیش آتے گئے۔ جنگیں چھڑیں، لوگوں کا قتلِ عام ہوا، سرحدیں پھر سے بنیں۔ جیل خانے بھرے گئے۔ لوگ سلاخوں کے آر پار ایک دوسرے کو دیکھنے کے عادی ہوتے گئے۔ آزادی کی تقریبات شروع ہوئیں، لیکن کسی کو پتہ نہ تھا وہ کس بات کی خوشی منا رہے تھے۔ لوگوں نے فینسی ڈریس کی رسم اپنائی۔ عجیب و غریب نقابوں کی روایت پڑی۔ کچھ لوگوں نے کہا، یہ دنیا ایک عارضی جگہ ہے۔ تمہیں اصلی دنیا کے لئے کچھ کرنا چاہئے، وہاں جہاں زمین کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جہاں کے پھل دائمی ہیں اور سایہ لازوال ہے۔ وہاں تمہاری ہر طرح کی خواہشات کی تکمیل ہوگی جن پر دنیا میں روک لگادی گئی ہے مگر اس سے پہلے تمہیں اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی پڑے گی۔ کچھ لوگوں نے کہا، تمہیں بائیں سمت چلنی چاہئے۔ سچائی صرف

بائیں طرف ہے۔ مجھے معلوم نہیں وہ کیا کہنا چاہ رہے تھے؟ میں نے کچھ عرصہ تک ان کا ساتھ بھی دیا یہ جانے بغیر کہ اس سے آسمان کے نیچے کیا تبدیلی آنے والی تھی۔ شروع کی طرف میں نے کام کی تلاش میں لوکل ٹرین میں دور دور تک سفر کیا مگر ہر بار یہ سفر کسی نہ کسی دریا کے کنارے ختم ہو جاتا، وہاں جہاں کشتیاں ندی پر اینٹ، ریت اور جانور ڈھویا کرتیں یا پھر دور آسمان کے نیچے فیکٹری کی چمنیاں آگ اور دھواں اگلا کرتیں یا پھر ایک آدھ بازار ایسا نکل آتا جس کے آس پاس کوئی نہ کوئی ریلوے پل ضرور ہوتا جس پر زیادہ تر مال بردار ٹرینیں دوڑا کرتیں اور پل کے نیچے طوائفیں کھڑی گاہکوں کا انتظار کرتیں۔ ایسے ہی کسی سفر کے دوران میں نے اپنے ساتھی مسافروں سے کہا، کیا برا ہے اگر میں نے اپنے سارے دروازے کھول رکھے ہیں۔ مگر سب کی یہی رائے تھی کہ تم بیک وقت ہر کسی کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ تمہیں چننا پڑتا ہے، تمہیں فیصلہ کرنا پڑتا ہے، کہیں نہ کہیں اپنا لنگر ڈالنا پڑتا ہے۔ دوسرے وقتوں میں کسی نے مجھے رائے دی، تمہیں نئے شناختی کا غذات کی ضرورت ہے، ایسے کاغذات جن کے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر نہ ہونے سے کافی فرق پڑ جاتا ہے۔ لیکن میری کشتی کو رکنے کے لئے کوئی جگہ میسر نہ تھی۔ میرے سارے کنارے کٹ چکے تھے۔ اور اپنے باپ کی طرح میں کسی فرضی نام کے ساتھ مرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ کیا آپ نے یہ کہانی بار بار نہیں سنی ہے؟

اس عورت نے دھیرے دھیرے میری ساری کمزوریاں پڑھ لی ہیں۔ اس نے اپنی دانشمند آنکھوں کا بھرپور استعمال کیا تھا جس کے بدولت وہ طوطوں کے کاروبار میں کافی کامیاب رہی تھی۔ میں اس کی آنکھوں میں جانے کیوں ہمیشہ ایک سرنارتھیوں سے بھرے جہاز کو دیکھا کرتا جس کے عرشے پر میرا باپ ہمیشہ اپنے سوٹ کیس اور کوٹ کے ساتھ کھڑے دکھائی دیتے اور مجھے اس پر حیرت ہوتی کہ کتنا عرصہ گذر گیا ہے مگر آج بھی وہ اسی جگہ اسی حالت میں کھڑے ہیں۔ شاید نئے ملک میں انھوں نے اپنے لئے ایک نیا نام تجویز کر لیا ہو۔ کاش ایسے کسی جہاز سے اترے ہوئے کسی مسافر کا مجھے علم ہوتا۔ میں اس سے اس جہاز کے اندر پیش آنے والے واقعات کی جانکاری حاصل کرتا۔ مگر میرے لئے شاید کہیں پر کرنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔

اس رات سب کچھ کسی طئے شدہ پروگرام کے تحت نہیں ہوا تھا۔ میں آئس کریم کی ٹرالی جمع کر کے واپس لوٹا تھا۔ واپسی پر ہر رات میں جس ہوٹل میں کھانا کھایا کرتا اس کے باہر راکھ پر

لوٹتے کتے ہمیشہ خود کو پرچھائیوں کے ساتھ ہم آہنگ رکھنے کی کوشش کیا کرتے۔ اس رات میں ہوٹل سے کھانا کھا کر باہر نکلا تو میں نے دیکھا کتے کسی وجہ سے بالکل چپ تھے بلکہ جو جہاں پر تھے اپنی جگہ بے حرکت کھڑے تھے۔ ان کتوں کی طرف تاکتے ہوئے جانے کیوں مجھے شدید اکیلے پن کا احساس ہوا اور واپسی پر میں نے اپنے گھر کی بجائے اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بہت دیر تک دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد بھی جب اس نے دروازہ نہیں کھولا تو میں مایوس ہو کر واپس لوٹنے کا ارادہ کر رہا تھا جب اس کی کھڑکی کھل گئی۔ وہ سلاخوں کو تھامے کھڑی تھی، اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ متوحش آنکھوں سے میری طرف تاک رہی تھی۔ مجھ سے نظریں ملتے ہی اس نے پھر سے کھڑکی بند کر لی۔ دوسری صبح اس نے میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں کافی گہری نیند سے جاگا تھا۔ آج اس نے کافی صاف ستھرے لباس پہن رکھے تھے اور چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی چڑھا رکھا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ کسی مرد کا سامنا کئے ہوئے اسے ایک لمبا عرصہ بیت گیا ہے۔ دراصل میں اتنا اچانک وارد ہو گیا تھا کہ وہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ تم جہنم جا سکتی ہو، میں نے کہا۔ میں یہ جملہ کئی بار سن چکی ہوں، وہ ہنسی، مگر پہلی بار مجھے لگ رہا ہے کہ اس کا ایک مطلب بھی ہے۔ وہ چارپائی پر میرے پہلو میں بیٹھ گئی اور اس نے اپنا سر میرے ننگے سینے پر رکھ دیا۔ آج اس نے سرمہ لگا رکھا تھا جس کے سبب اس کی آنکھیں کافی بڑی نظر آ رہی تھیں اور اس کے بالوں سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی جس نے میرے اندر نفسانی خواہش کو جاگنے پر مجبور کر دیا۔ میں اس کی ننگی گردن کو چوم رہا تھا، اس کی پشت کو سہلا رہا تھا جب... تمہیں یہ خوشبو پسند ہے؟ اس نے سر اٹھا کر کہا۔ ''یہ تیل میں نے کیوڑے کے پھولوں سے خود بنایا ہے۔'' اور اس نے خود کو مجھ سے الگ کر لیا۔ میں دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ آج رات ہم سارے معاملات سلجھا لیں گے، اس نے کہا اور چلی گئی۔ اس رات اس نے پوری تیاری کر لی تھی۔ ہم دیر تک اس کے اندرونی برامدے میں کھڑے طوطوں سے باتیں کرتے رہے۔ رات گہری ہو چکی تھی اور چھپروں کے اوپر گرم ہوا چل رہی تھی جب وہ میرے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ آج اس کا کمرا کافی سجا ہوا تھا۔ اس نے کھڑکیوں پر نئے پردے ٹانگ رکھے تھے۔ ہم نے بستر پر بیٹھ کر دیر تک گفتگو کی جس کا کوئی سر پیر نہ تھا جیسے ہمارا مقصد صرف وقت کو پیچھے کی طرف ڈھکیلنا ہو۔ مگر پھر ہماری گفتگو کے اندر کچھ بھی نہیں رہ گیا۔ اس دن میں نے کسی

عورت کو پہلی بار اس کے اصلی روپ میں دیکھا۔ وہ ننگی ہوئی تو اس کا پیٹ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ اس کا پیٹ تو اتنا بڑا نہیں تھا جتنا کپڑا پہننے پر دکھائی دیتا ہے۔ اس نے ایک نئی عورت کی طرح میرا سامنا کیا۔ اسے کراہنے کا فن معلوم تھا۔ مگر میری طرف سے سب کچھ اتنی جلد ہو گیا کہ اسے تھوڑی سی مایوسی بھی ہوئی۔ اس نے کہا، تم نے میری نئی چادر خراب کردی۔ مجھے نہیں معلوم تھا اس معاملے میں تم بالکل اناڑی ہو۔ تمہیں پتہ ہے تم نے اپنی زندگی کے کتنے قیمتی سال کھو دیے ہیں؟ میں تمہیں ایسے لڑکوں کے بارے میں بتا سکتی ہوں جو تم سے آدھی عمر کے تھے، جن کی مسیں ابھی بھیگی بھی نہ تھیں، جو میرے پاس آیا کرتے۔ مجھے حیرت ہوئی۔ واقعی وہ ٹھیک کہہ رہی تھی، عورت، ہم اسے بستر پر جانے بغیر اس دنیا یا آخرت کے بارے میں کچھ بھی تو یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ بعد میں جب ہم ننگے لیٹے ہوئے چھپر کی طرف تاک رہے تھے تو اس نے مجھے بتایا، جس طرح تجربہ کے بغیر آدمی اناڑی ثابت ہوتا ہے، اسی طرح حد سے زیادہ تجربہ انسان کو ناکارہ بنا دیتا ہے۔ ہم اپنی سوچ کے غلام بن جاتے ہیں۔ شاید ہم نے جلد بازی کی تھی۔ اتنے سالوں تک ایک فرضی نام کے ساتھ (اس نے اپنی بدنامی کے دنوں میں کئی بار نام بدلے تھے) بھانت بھانت کے مردوں کا سامنا کرنے کے بعد اسے کچھ اور وقت چاہئے تھا۔ میں خوفزدہ تھی، پہلے کی طرح تمہارے لئے صرف ایک گوشت پوست کا لوتھڑا نہ بن کر رہ جاؤں۔ اس لئے میں اب تمہیں اپنا اصلی نام بتانا چاہتی ہوں۔ کیا تم اسے جاننا چاہو گے؟ اور تم میرے کراہنے پر نہ جاؤ۔ یہ میری پرانی عادت ہے جس سے میں گاہکوں کو فریب دیا کرتی تھی۔ اس سے وہ جلد بازی سے کام لینے پر مجبور ہو جاتے۔ میں ایسا کرنے پر مجبور تھی۔ مجھے کمرے کا کرایہ دینا پڑتا، دوسرے اور بھی اخراجات تھے، اور پھر میری طبیعت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ مجھے اس پر قابو پانا ہوگا۔ میں چاہتی ہوں، جب بھی میں تمہارے پاس آؤں میں وہ بن جاؤں جو اس بدنامی کی زندگی سے پہلے تھی۔ اور اس نے مجھے اپنا اصلی نام بتایا۔ مگر اس سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں نے کہا، تم کہنا کیا چاہتی ہو، ہمارے تجربات دھاگوں کی طرح ہوتے ہیں جو آپس میں الجھ جاتے ہیں؟ ایسا صرف اس لئے ہوتا ہے کیونکہ ہم جیسوں کے پاس کبھی کوئی منصوبہ نہیں ہوتا۔ ہم بس جیتے ہوئے مر جاتے ہیں۔ تمہیں پتہ ہے، ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے ساری زندگی انسانیت کی خدمت کی۔ انھوں نے بھوکوں کے لئے کھانے کا انتظام کیا، اپاہجوں کو بیساکھیاں بانٹیں، خدا کی طرف سے پیغامات نشر کئے جنھیں قبول

نہ کرنے والوں کے لئے کوڑے مخصوص تھے، مگر آخر میں انھیں بھی اس بات کا پتہ چل گیا تھا کہ انھوں نے ایسے جہاز بنائے تھے جو بے وطنوں کو ان کے وطن پہنچانے والے تھے مگر یہ جہاز کبھی کنارے پہنچنے والے نہ تھے۔ اس نے حامی بھرتے ہوئے کہا، میں جانتی ہوں، میں نے ایسے لوگوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ اپنے ہر عمل سے ثواب کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینا چاہتے ہیں۔ میں نے ایک بار ایک سینی ٹوریم میں داخلہ لیا تھا۔ میرے پھیپھڑوں پر داغ آگئے تھے۔ میں مرتے مرتے بچی۔ مگر وہاں مجھے اپنے پھیپھڑوں کے بارے میں اتنا کچھ بتایا گیا کہ ان پر عمل کرنا مشکل تھا۔ وہاں میرا بہت سارا پیسہ برباد ہو گیا۔ تو میں نے صرف یہ کیا کہ پرانا دھندا چھوڑ دیا۔ اب پاک پنجتن کی عنایت سے میں روز نہیں مرتی۔ یہ تو اچھی بات ہے، میں نے کہا۔ اس سے سب کچھ وہی رہتے ہوئے بھی تمہاری دنیا آسان ہو گئی ہوگی۔ مگر تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہو؟ مسعودہ، یہی نام بتایا ہے ناتم نے اپنا؟ میں نہیں جانتا، میں تمہارے اس نام کا کیا کرونگا؟ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم میری اصلیت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ دنیا بہت بڑی ہے۔ یہاں ہزاروں لاکھوں طاقتیں ہیں، جنھیں تم جانتے بھی نہیں، جو تمہارے خلاف کام کرتی رہتی ہیں اور تمہارے پاس اپنی شکست تسلیم کرنے کے علاوہ انھیں روکنے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی شکست تسلیم کرلو، کسی جگہ ٹھہر جاؤ۔ کسی کے ساتھ ٹھہر جاؤ۔ تم میرے ساتھ ٹھہر جاؤ۔ ہم دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے نکاح کرلیں گے۔ تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ میں نے کہا۔ کیا تم مجھے کسی خطرے سے بچانا چاہتی ہو؟ کیا تم نے ہمیشہ اس طرح کا کام کیا ہے؟ کیا تمہارے پاس بھی کوئی جہاز ہے؟ اس نے جواب دیا، اسے شک ہے وہ ایسے کسی کام کی اہل بھی ہے۔ کیا ایک ایسی دنیا میں جہاں ایک چھدام کے لئے لوگ شور مچاتے ہوں، یہ ممکن ہے کہ آدمی اتنی آسانی سے کسی کی دنیا بدل دے، یا اپنے ماحول سے الگ ہو کر اپنے لئے ایک نئی دنیا بنالے۔ ہمیں بس ڈھنگ سے کچھ سال جی لینے چاہئیں۔ اور تم جس جہاز کی بات کر رہے ہو، وہ کبھی واپس نہیں لوٹتا۔ یہ دنیا بس اسی طرح ہے۔ تمہیں پانی پر بس ایک کوڑے کے ڈھیر کی طرح تیرتے رہنا ہے۔ ہوسکتا ہے اس پر مٹی جمتے جمتے کوئی پودا نکل آئے اور ایک تناور درخت کی شکل اختیار کرلے جیسا کہ میں نے اپنے گاؤں میں دیکھا ہے۔

اس گلی میں ناریل کے کئی پیڑ تھے جو دھول سے اٹے ہوئے تھے اور چھپروں کے بیچ

سے اس طرح نکلے ہوئے تھے جیسے خبیث اپنے بال بکھرائے کھڑے ہوں۔ ان کے پتوں میں پرندے کبھی کبھار رات کے وقت بلا وجہ واویلا مچایا کرتے جیسے ان کا کوئی خاندانی تنازع سامنے آ گیا ہو۔ مسجد کی طرف برگد کا ایک لحیم شحیم پیڑ تھا جس میں گرمی کے آتے ہی کوئلیں کوکنے لگتیں۔ وہ دن بھر بلا تکان کوکتیں۔ انھیں بس مسجد کے میناروں سے بندھے ہوئے لاؤڈ اسپیکروں سے آتی اذان کی کرخت آواز ہی چپ کرا پاتی۔ مگر یہ دیرپا ثابت نہ ہوتا۔ کچھ ہی دیر کے بعد کوئلیں شدہ مد کے ساتھ کوکنا شروع کر دیتیں۔ ہر رات مجھ سے لپٹ کر وہ چین کی نیند سو جاتی اور میں اس کے پھیپھڑوں کی آواز سنتا رہتا جیسے کوئی اس کے اندر کاغذ مروڑ رہا ہو۔ کبھی کبھار وہ اچانک غیر متوقع طور پر خراٹے لینا شروع کر دیتی اور میں دیر تک جاگے رہنے پر مجبور ہو جاتا۔ مگر کسی کسی رات وہ چونک کر جاگ اٹھتی۔ اس وقت اسے اپنے کپڑوں کا بھی ہوش نہ رہتا۔ وہ اٹھ کر اندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھول کر ننگی کھڑی ہو جاتی اور آنگن کی آوازوں کو سننے کی

کوشش کرتی۔ کمرے کے اندھیرے میں ایسا لگتا جیسے وہ کل ملا کر ایک بڑا سا پیٹ ہو جس میں اس کی دونوں ٹانگیں اور ہات غلط سمت میں گتھے ہوئے ہوں۔ تم سن رہے ہو، وہ سرگوشی کرتی، رات کی اپنی ایک بہت ہی پر اسرار دنیا ہوتی ہے۔ میں اس دنیا کو اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ میں پہاڑوں سے گھرے ہوئے ایک گاؤں میں پیدا ہوئی۔ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک جانور بن گیا ہوں جب کہ وہ ابھی بھی ایک عورت ہے اور میں کسی وحشی درندے کی طرح اپنی شہوانی خواہش پوری کر رہا ہوں۔ جانے یہ کتنی دیر تک چلتا ہے جب ہیجانِ شہوت سے میری نیند ٹوٹ جاتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں، وہ مجھ سے لپٹی ہوئی ہے اور خود بھی شہوانیت کے جذبے سے سرشار ہے۔ اس نے سرگوشی میں کہا، تم ایک حیرت انگیز انسان ہو۔ اگر میں تم سے نہ ملی ہوتی تو کبھی شہوت کے اس ہیجان کو جان نہ پاتی۔ مجھے لگ رہا ہے میں اپنے کنوارے دنوں میں لوٹ رہی ہوں جب میں گاؤں میں بڑی ہو رہی تھی اور ہم سہیلیاں ایک دوسرے کو اپنی ماہواری کے قصے سنایا کرتیں۔ اگر تم چاہو تو ہم ایک ساتھ اپنا گاؤں لوٹ سکتے ہیں۔ وہاں ہمارا پشتینی مکان ہے جس میں میرا ایک ذاتی کمرا ہے۔ میرے رشتے دار میرے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں تا کہ وہ اس کمرے پر قبضہ جما سکیں۔ تمہیں دیکھ کر انھیں مایوسی ہوگی۔ گاؤں! گرم تکیہ کے اندر اپنے دونوں کانوں تک دھنسا ہوا میں روئی کے اندر کے

سناٹوں کو سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیوں نہیں، اور اس کے لئے ذاتی طور پر میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا۔ اس واقعہ کے دو مہینے بعد اس نے مجھے اپنے گاؤں کے بارے میں مزید جانکاری دی۔ اس نے کہا، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی، اس کے پاس ایک بہت ہی کمزور پھیپھڑا ہے اور شہر کی آلودگی دن بدن بڑھتی ہی جارہی ہے، وہ اگر گاؤں لوٹ جائے تو شاید کچھ اور برس جی لے۔ میں نے کہا، کیا یہ ضرورت سے زیادہ چاہنے کی طرح نہیں ہے؟ نہیں، اس نے کہا، یہ زندہ رہنے کی ایک عام خواہش ہے جو ہر انسان کے اندر ہوتی ہے۔ میں نے اس گاؤں کو اپنے آخری وقت کے لئے بچا کر رکھا ہوا ہے۔ ٹھیک ہے، میں نے کہا۔ پھر تو میرے پاس کوئی راستہ نہیں بچتا، مگر شرط یہ ہے کہ جب تم اپنا گاؤں پہنچو تو میں اپنا منہ بند رکھونگا۔ ساری بات تم کروگی۔ تم اپنے لوگوں کو زیادہ اچھی طرح سے جانتی ہو۔ کیا ان کو تمہارے ماضی کے بارے میں پتہ ہے؟ تمہیں یہ سوچ کر ڈر نہیں لگتا کہ جانے وہ تمہارے ساتھ کس طرح سے پیش آئیں گے۔ تمہیں خوامخواہ گھبرانے کی ضرورت نہیں، وہ بولی۔ میں وہاں جاتی رہتی ہوں۔ وہاں سارے لوگ میرے بارے میں جانتے ہیں۔ لیکن وہ خود اس کا یقین کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن اب دنیا بدل چکی ہے۔ اور پھر تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر وہ اپنی زبان بند کرلیں گے۔ مجھے اس کا یقین ہے۔ میرا وہاں جانا ضروری ہے۔ ان دنوں میں موت کے فرشتے کو بار بار دیکھنے لگی ہوں۔ اس کے پروں میں تلواروں کی سی دھار ہے جن سے خون ٹپکتے رہتے ہیں۔ میں کبھی کبھار بری طرح نروس ہو جاتی ہوں۔ مجھے ڈر لگتا ہے، کہیں نیند کی حالت میں ہی میری موت نہ ہو جائے۔ کیا واقعی تم میرے ساتھ آرہے ہو؟

(۹)

میں اس دریا کا ذکر قدرے تفصیل کے ساتھ کرنا چاہوں گا۔ اس کے دونوں کنارے کئی سنگلاخ پہاڑ ہیں جو بہت زیادہ اونچے نہیں اٹھتے۔ ان پہاڑوں میں ننگی چٹانوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ہاں، ان کے نیچے کے میدانوں میں کافی گہرے ڈھلان ہیں جن پر سال کے پرانے جنگلوں کے شانہ بہ شانہ یوکلپٹس کے پیڑ لہراتے رہتے ہیں جنھیں محکمہ جنگلات نے اگایا ہے۔ ان ڈھلانوں سے گذر کر دریا جیسے جیسے نیچے کی طرف اترتا گیا ہے وہ کشادہ ہوتا گیا ہے، مگر اوپر کی طرف جہاں مسعودہ کا گاؤں واقع ہے

اس کے پانی میں بھنور بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ مگر یہ اپنے آپ میں اتنا اہم نہیں جتنی

یہ بات کہ اس کے دونوں کنارے کے ڈھلانوں پر سال کے درختوں کے بیچ کچھ پرانے مکانوں کے کھنڈر اب بھی کھڑے ہیں۔ ان گھروں کے یہاں بنانے کی کیا وجہ رہی ہوگی اور وہ کیا مجبوری رہی ہوگی کہ لوگ نقلِ مکانی پر مجبور ہوئے؟ اس دریا کا پانی بہت زیادہ گہرا ہے، مگر کنارے کی طرف اس کا پانی کافی گاڑھا ہو کر کہیں کہیں رک سا گیا ہے جس میں طرح طرح کے رنگ تیرتے رہتے ہیں جنھوں نے پانی سے نکلی ہوئی چٹانوں کے زیریں حصوں میں عجیب طرح کی مصوری کر رکھی ہے۔ یہ رنگ شاید ان کل کارخانوں کی دین ہوں جو پہاڑوں کے سبب نظر نہیں آتے یا شاید کسی تھرمل پاور اسٹیشن کا گندا مواد بہتا ہوا اس کے ساتھ مل گیا ہو۔ ان رنگین کناروں میں ناگ پھنی کے پودے دور تک چلے گئے ہیں۔ جگہ جگہ پانی سے فرن کے رنگین پتے بھی نکلے ہوئے ہیں جو، جیسا کہ مسعودہ نے بتایا، بارش کے دنوں میں پانی کے اندر ڈوب جاتے ہیں۔ آخر ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟ اور تم ایک دریا سے کیا امید رکھتی ہو؟ میں نے اس سے پوچھا۔ تم اس کے پانی کو سمجھنے کی کوشش مت کرو، اس نے جواب دیا۔ میں اپنے بچپن سے اسے سمجھنے کی کوشش کرتی آئی ہوں۔ یہ ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ اس کا یہ جواب میری تشفی کے لئے کافی نہ تھا۔ اس کے گاؤں نے مجھے بہت زیادہ متاثر بھی نہیں کیا۔ اس میں نہ کوئی پختہ راستہ تھا نہ کوئی سرکاری نل۔ ایسا لگتا ہے جیسے سرکار کے تمام ترقیاتی منصوبے یہاں آنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتے ہیں۔ زیادہ تر گھروں کی چھتیں ٹن کی تھیں۔ اس میں بجلی بس ایک دو گھنٹے کے لئے آتی جس کے لئے زیادہ تر لوگ ٹنک کا استعمال کرتے۔ اس کے اپنے گھر میں کم و بیش وہی حالات تھے جن سے اپنا پیدائشی وطن واپس لوٹنے پر میری ماں کو سامنا کرنا پڑا تھا۔ ہم نے اوبڑ کھابڑ راستوں پر سرکاری بس کا ایک لمبا سفر طئے کیا تھا اور بہت دیر سے پہنچے تھے جب سورج کا خون ہو چکا تھا اور آسمان کی گہرائیوں سے اندھیرا اتر رہا تھا۔ مسعودہ کے کمرے کو کسی طرح رات گذارنے کے قابل بنا کر ہم نے اپنے ساتھ لایا ہوا کھانا کھایا۔ دوسری صبح وہ سویرے سویرے جاگ گئی۔ گھر صاف کرنے میں اسے آدھا دن لگ گیا۔ اس کے کمرے میں پرانے دنوں کے کئی بھاری فرنیچر تھے جن کے پایوں اور لٹوؤں پر کی گئی کاریگری نے مجھے حیران کر دیا۔ کیا ان دنوں لوگوں کے پاس اتنی فرصت تھی؟ گھر کے دوسرے لوگوں نے ہم سے گفتگو کرنے سے احتراز کیا تھا۔ ہم اب بھی شہر سے لایا ہوا کھانا کھا رہے تھے۔ دن ختم ہو رہا تھا جب ہم کچھ ضروری سامان خریدنے بازار گئے۔ بازار ہمیں پسند آیا۔

وہ ایک کافی پرانی مسجد کے احاطے کے گرد بنا ہوا تھا۔ مسجد کے بیرونی برامدے پر درزی اپنی مشینوں پر بیٹھے کپڑے سی رہے تھے۔ برامدے کی کئی سیڑھیاں تھیں جن میں سے ایک پر ایک نانبائی کی دکان تھی۔ بازار میں ضرورت کے تقریباً سبھی سامان موجود تھے۔ دھیرے دھیرے گھر کے لوگوں کو میں پہچاننے لگا۔ ایک بوڑھی عورت تھی جس کا چہرا چھوارے کی طرح سوکھا ہوا تھا۔ اس کے بال کافی لانبے تھے جنھیں وہ چارپائی کے ادوائن پر بکھیر کر ہمیشہ ان سے جوئیں نکالا کرتی۔ میں نے ایک دن اس سے بات کرنے کی کوشش کی تو مجھے پتہ چلا وہ نپٹ بہری تھی۔ میں نے اس کے لئے ایک ساری خریدی۔ میں نے ایک تیراچودا برس کی لڑکی کو دیکھا جو حمل کے آخری اسٹیج پر تھی اور ہمیشہ رنگین ساری پہنے رہتی۔ مجھے پتہ چلا گاؤں کے پچھلے پیش امام کے ساتھ اس کی شادی کر دی گئی تھی جو اس کے حمل کے ٹھہرنے کے بعد اچانک ایک دن لاپتہ ہو گیا تھا۔ مسعودہ نے بتایا کہ یہ اس پیش امام کا پرانا پیشہ تھا جس کا پتہ گاؤں والوں کو اس کے جانے کے بعد چلا تھا۔ باقی عورتیں مجھے دیکھتے ہی لمبے گھونگٹ نکال لیتیں۔ دھیرے دھیرے بچے میرے قریب آنے لگے۔ میں ان کے لئے پلاسٹک کے سستے کھلونے اور بسکٹ لایا کرتا، اینٹ سجا کر ان کے ساتھ کرکٹ کھیلا کرتا۔ گھر کے زیادہ تر مرد شہروں میں کام کرتے تھے اور مہینہ میں ایک دو دن کے لئے گھر آتے تو سارا وقت اپنی بیوی کے پاس بیٹھے رہتے بلکہ دن میں بھی کمرے میں ایک آدھ بار بیوی کے ساتھ بند ہونے سے نہیں جھجکتے۔ انھوں نے ہمارے رشتے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا تھا، مگر یہ بات وہیں پر ختم ہو گئی تھی۔ میں نے بھی جان بوجھ کر ان سے دوری قائم رکھی۔ شروع شروع میں مسعودہ نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ پھر ایک دن اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے کہا، میں ٹھیک نہیں کر رہا ہوں، مجھے ان بچوں سے دور رہنا چاہئے۔ اس سے پیچیدگیاں بڑھ سکتی ہیں۔ وقت کاٹنے کے لئے میں گاؤں کے اندر اکیلا گھوما کرتا۔ مگر یہ گاؤں اتنا چھوٹا تھا کہ جدھر بھی جاؤ راستہ بہت جلد ختم ہو جاتا اور پھر چھوٹے موٹے تالاب نظر آنے لگتے یا بانس کے جھنڈ جن کے بیچ سبزی کے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا جہاں پر دلچسپی کے لائق کچھ بھی نہ تھا سوائے پرانی شرٹ اور پتلون پہنے ہوئے اُن بجھکاگ کے جو سر کی جگہ ہانڈیاں اٹھائے بانس پر کھڑے تھے مگر پرندے ان سے ڈرنے کی بجائے عین ان کے سروں پر بیٹھے رہتے۔ کبھی کبھار دریا کے کنارے کنارے چلتا ہوا میں سال کے جنگل میں چلا جاتا اور بوسیدہ گھروں کے کھنڈروں کے درمیان

چکر لگایا کرتا۔ ان گھروں کی زیادہ تر دیواریں ڈھ چکی تھیں، چوکھٹ اور روشندان نکال لئے گئے تھے مگر ان کے باغیچوں کے اندر کھڑے پیڑ اب بھی گھنے تھے جن میں ایک پر میں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا شہد کا چھتہ لٹکتے دیکھا۔ ان کھنڈروں کے اندر چینٹیوں نے مٹی کے کافی بڑے بڑے ٹیلے بنا رکھے تھے جن میں سے کسی کسی نے تو کسی پیڑ کے تنے کو نصف حصے تک ڈھک رکھا تھا۔ یہاں بھی ناگ پھنی کے پودے تھے مگر اب انھیں دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے انھیں کوڑھ کی بیماری ہو گئی ہو جن کے پھوڑوں سے پیپ نکل رہی ہو۔ مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوئی کہ کبھی ان کھنڈروں میں زندگی کی چہکاریں گونجا کرتی ہونگی۔ بلکہ ایک جگہ کھڑے ہو کر مجھے ایسا لگا جیسے میں ان آوازوں کو سن سکتا ہوں۔ مگر بہت جلد مجھے پتہ چل گیا کہ یہ شہد مکھی کا ایک چھتہ تھا جہاں سے یہ آواز آ رہی تھی۔ یا پھر کون جانے یہ میرا تصور بھی ہو سکتا تھا۔ شاید کوئی ان دیکھا بھنورا آس پاس بھنبھنا رہا ہو۔ ایک دن میں نے مسعودہ سے کہا کہ میں اس دریا کو اور اس کے کنارے کے کھنڈروں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس نے مجھے ایک بار پھر ہوشیار کیا کہ میں اس دریا سے دور رہوں تو بہتر ہے۔ اس میں ہر سال کوئی نہ کوئی واقعہ پیش آ جاتا ہے۔ میری سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ یہ ایک معمولی سا دریا ہی تو تھا، شاید ایک بڑا سا پہاڑی نالا جس میں پانی کا اچھا ذریعہ تھا اور جو کہیں کہیں چٹانوں کے بیچ کسی کنویں کی طرح گہرا ہو گیا تھا۔ مگر مجھے بہت جلد پتہ چل گیا کہ اس کا کہنا صحیح تھا۔ ہمیں وہاں آئے کئی ماہ ہو چکے تھے۔ رہ رہ کر وہ بیمار پڑنے لگی تھی اور گاؤں کے واحد ہومیو پیتھی ڈاکٹر کی دائمی مریض بن چکی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا، اس کا ٹیومر اپنا جلوہ دکھانے لگا ہے، مگر اسے زیادہ خطرہ اس کے پھیپھڑوں سے ہے جو کاغذ کی طرح سوکھ چکے ہیں۔ مگر وہ میری دوا سے ٹھیک ہو جائے گی۔ میں نے اس سے بھی خراب مریضوں کو ٹھیک کیا ہے۔ مجھے یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ اس کے پاس کوئی ڈگری نہیں تھی۔ پہلے وہ سائکل پر چوری کا کوئلہ ڈھویا کرتا تھا، لیکن کوئلے سے زیادہ اسے لوگوں کی بیماریوں سے دلچسپی ہو گئی۔ تو اس نے ہومیو پیتھی کی دوا کے بارے میں جاننا شروع کر دیا۔ اس نے کچھ دنوں تک ایک ہومیو پیتھ کے یہاں پڑیا باندھنے کا کام کیا اور پھر اس دور دراز گاؤں میں یہ پیشہ اختیار کر لیا۔ میں نے سوچا، اس کام کے لئے اس گاؤں کا انتخاب صحیح تھا۔ یہاں پر کوسوں دور تک کوئی تھانہ تھانہ پولس کی چوکی۔ اور پھر ملک کے ہر گاؤں کی طرح اس گاؤں کو بھی ایک نیم حکیم کی ضرورت تھی۔ یہ اس کا ایک

بنیادی حق تھا۔

مسعودہ ایک لمبی بیماری کے بعد کچھ دنوں سے کافی اچھا محسوس کر رہی تھی۔ گرمی کا موسم ختم ہو رہا تھا۔ اس دن دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہم کافی گہری نیند سوئے۔ میں جاگ کر باہری برامدے میں مٹی کے گھڑے کے ٹھنڈے پانی سے منہ دھو رہا تھا جب میں نے دیکھا گھر کے سارے دروازے بند پڑے تھے۔ میں آنگن میں آیا۔ گھر پر کوئی فرد نظر نہیں آرہا تھا۔ صرف بوڑھی عورت اپنی چارپائی پر بیٹھی اپنے لمبے سن کی طرح سفید بالوں میں تیل لگا رہی تھی۔ یہ اس کی موت سے سات ماہ پہلے کا واقعہ تھا۔ وہ ابھی ابھی نہا کر اٹھی تھی۔ اس نے مسکرا کر مجھے اپنی ساری دکھائی جسے اس نے غسل کے بعد اپنے جسم پر لپیٹا تھا۔ یہ میری دی ہوئی ساری نہ تھی، مگر وہ شاید ایسا ہی کچھ سمجھ رہی تھی۔ میں باہر آیا تو سامنے کا کچا راستہ اور اس کے کنارے کے اوکھ کے کھیت اور ٹن کے چھپروں والے اکے دکے گھر قبرستان کی طرح خاموش نظر آئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سارا گاؤں ہمیں اکیلا چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہو۔ میں نے مسعودہ کو نیند سے جگا کر جب اس واقعے کے بارے میں بتایا تو پہلے تو اس کا چہرا فق پڑ گیا، پھر اس نے کہا، ہم اسے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتے۔ میری دوا ختم ہو چکی ہے۔ کیا تم میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلو گے؟ اس نے میرے لئے چائے بنائی۔ ہم نے کپڑے بدلے اور بازار کی طرف چل دئے۔ بازار میں زیادہ تر دکانیں بند تھیں۔ جو کھلی تھیں وہ سنسان پڑی تھیں۔ خود وہ ہومیوپیتھی کا جعلی ڈاکٹر بھی غائب تھا جب کہ اس کا مطب کھلا ہوا تھا جو مسجد کے ایک کمرے میں واقع تھا۔ اس کی سائکل باہر اپنی جگہ کھڑی تھی۔ ہم وہاں اس کا انتظار کر رہے تھے جب مسجد کا لکڑی کا پھاٹک کھول کر ایک دبلا پتلا آدمی باہر آیا جس کے سر پر ایک بھی بال نہ تھا۔ اس نے بتایا کہ تمام لوگ دریا کی طرف گئے ہوئے ہیں۔ جب ہم نے سبب جاننا چاہا تو اس نے آسمان کی طرف اشارا کیا جس میں چیل اور کوے اڑ رہے تھے۔ ہم نے آسمان سے نظریں ہٹائیں تو دیکھا وہ آدمی جا چکا تھا۔ چونکہ ہم دوا لئے بغیر واپس نہیں لوٹ سکتے تھے ہم بھی دریا کی طرف ہو لئے۔ ہم دریا سے تھوڑے فاصلے پر تھے جب ہم نے محسوس کیا آسمان میں چیل اور کوے اچھی خاصی تعداد میں اڑ رہے تھے جو ان ویرانوں کے لئے حیرت کی بات تھی۔ ہمیں دریا کے دونوں کنارے لوگوں کا بھاری ہجوم نظر آیا جیسے وہاں پر کوئی میلا لگا ہوا ہو۔ لوگ بہتے پانی پر نظریں ٹکائے کھڑے تھے اور وقفے وقفے سے شور مچا رہے تھے۔ وہ رہ رہ کر

انگلی سے دریا کی طرف اشارے بھی کرتے جاتے۔ اگلی بار شور اٹھا تو لوگوں کی انگلیوں کا تعاقب کرتے ہوئے ہم نے دیکھا دریا کے پانی میں کوئی بھاری چیز بہتی ہوئی آرہی تھی۔ یہ ایک جانور کا مردہ تھا۔ وہ عین ہمارے سامنے سے گذرا۔ یہ ایک سور تھا جس کا پیٹ اور ٹانگیں اوپر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں اور ایک کان پتوار کی طرح پانی کو تھپڑے لگاتا ہوا چلا جارہا تھا۔ لوگوں میں ایک بار پھر شور پیدا ہوا۔ یہ ایک دوسرا سور کا مردہ تھا جو اسکے پیچھے پیچھے بہتا ہوا آرہا تھا۔ اتنی دور سے وہ دریا کے جسم پر کسی پھوڑے کی مانند نظر آرہا تھا۔ ''وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے بہتے آرہے ہیں۔'' کسی نے ہمارے کان میں سرگوشی کی۔ ہم دیر تک اپنی جگہ کھڑے رہے۔ واقعی دریا میں رہ رہ کر سوروں کے مردے بہتے آرہے تھے بلکہ اب تو ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ یہ مردے پانی پی پی کر پھول گئے تھے، ان میں سے زیادہ تر جانوروں کے بدن اس قدر سڑ گل چکے تھے کہ ہوا میں سڑاندھ پھیلنے لگی تھی۔ دیکھتے دیکھتے مردے تعداد میں اتنا زیادہ ہوگئے کہ لوگوں نے چلانا بند کردیا اور دریا سے تھوڑا پیچھے ہٹ کر کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے بدبو سے بچنے کے لئے اپنی ناک پر کپڑا یا ہات رکھ لیا تھا اور اپنی جگہ خاموش کھڑے ان کی طرف تاک رہے تھے۔ مردے پانی میں چکر لگا رہے تھے، کناروں سے ٹکرا رہے تھے، ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے، کبھی کبھار کوئی مردہ کسی چٹان سے ٹکرا کر رک جاتا، مگر پھر پیچھے سے پانی کا ایک زبردست ریلا آتا یا کوئی دوسرا مردہ آکر اسے ٹھوکر لگاتا اور وہ چٹان کے گرد چکر کاٹ کر دوبارا اپنے سفر پر روانہ ہوجاتا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اوپر کی طرف بستیوں میں سوروں کے اندر کوئی بھاری وبا پھیل گئی ہو۔

''یہ سچ نہیں ہوسکتا۔'' مسعودہ مجھ سے لپٹی ہوئی خوفزدہ نظروں سے سور کے مردوں کی طرف تاک رہی تھی جو کنارے کی کیچڑ یا ناگ پھنی کے پودوں سے اٹک گئے تھے یا فرن کے پتوں کے بیچ رنگین پانی میں ڈول رہے تھے۔ ان میں سے کسی کسی کی ایک یا دونوں آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، تھوتھنیوں کا رنگ عجیب گہرا گلابی ہوگیا تھا جیسے ان کے اندر خون جم گیا ہو، اور پانی سے نکلی ہوئی منحنی دمیں اس طرح ہل رہی تھیں جیسے جانور اب بھی زندہ ہوں جب کہ یہ اور کچھ نہیں بہتے ہوئے پانی کا کارنامہ تھا۔ ''جیسا کہ میں نے کہا تھا، اس دریا میں ہر سال کوئی نہ کوئی حیرت انگیز واقعہ ہوجایا کرتا ہے۔'' مسعودہ نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ اس نے ساڑی کے پلو سے اپنی ناک ڈھک رکھی تھی۔ ''مگر یہ پہلی بار ہے کہ میں اتنے سارے مردہ سوروں کو اس میں بہتے

دیکھ رہی ہوں۔ اور یہ بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ کہاں سے آ رہے ہیں یہ؟ کہاں جا رہے ہیں؟ تم چپ کیوں ہو؟ کیا میں خواب دیکھ رہی ہوں؟ کیا موت کا فرشتہ میرے ساتھ کسی قسم کا کھیل کھیل رہا ہے؟" میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ پہلی بار نہیں تھا کہ میں ایسے کسی دریا کو دیکھ رہا تھا۔ میں ساری زندگی اسی دریا کے کنارے ہی تو چلتا آ رہا ہوں۔

سورج ڈوب چکا ہے۔ مشرق سے اندھیرا آسمان میں قدم بڑھانے لگا ہے۔ زیادہ تر لوگ دریا کے کنارے سے غائب ہو چکے ہیں۔ دریا سور کے مردوں سے اتنا بھر چکا ہے کہ اب وہ ایک دوسرے پر چڑھنے لگے ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے مردے خود ہی ایک دوسرے کو ڈھکیلتے ہوئے نیچے کی طرف جا رہے ہوں۔ مغرب کی طرف جہاں آسمان میں اب بھی تھوڑی سی لالی بچی ہے دونوں سنگلاخ پہاڑوں کے بیچ دریا کے سفید پانی پر سوروں کے مردے اس طرح نظر آ رہے تھے جیسے وہ زمین کے اندر سے ابل رہے ہوں۔

اس رات جب ہم اپنی کوٹھری میں اکیلے ہوئے تو کھڑکی پر چڑیلیں بیٹھی کھسر پسر کر رہی تھیں۔

مسعودہ نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اس پر نیند کا شدید غلبہ تھا۔ شاید یہ دوا کا اثر تھا۔ اس کے پھیپھڑوں سے وہی خشک آواز نکل رہی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کے بند پپوٹوں کے نیچے حلقے اور بھی بڑے ہو گئے تھے۔ ان سے ایک عجیب وحشت ٹپک رہی تھی جیسے وہ موت کے فرشتے کو دیکھ رہی ہو۔

"تم چین سے سو جاؤ۔" میں نے اس کے سر کو اپنے سینے سے ڈھکتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اس دریا کے بارے میں نہیں سوچنا چاہئے۔ تمہیں پتہ چلنا چاہئے، یہ دنیا تمہارے بغیر بھی ایک بری جگہ ہے۔"

☆☆☆

(نوٹ: *مغربی بنگال میں بنگالی آج بھی اتر پردیش کے لوگوں کو ہندوستانی بلایا کرتے ہیں۔ کبھی کبھار ایک ہی زبان بولنے کے سبب وہ بہاریوں کو ان کے ساتھ مخلوط کر بیٹھتے ہیں۔)

صدیق عالم کی پچھلی کتابیں

- آخری چھاؤں (افسانے)
- چار رنگ کی کشتی (ناول)
- لیمپ جلانے والے (افسانے)
- بین (افسانے)
- پتھر میں کھدی ہوئی کشتی (شاعری)
- چینی کوٹھی (ناول)

مطبوعہ پاکستان:

۔نادر سکوں کا بکس (افسانوں کا انتخاب)

۔وحشیوں کا انتظار (ناول مصنف: جے ایم کوٹسی ۔ترجمہ: صدیق عالم)
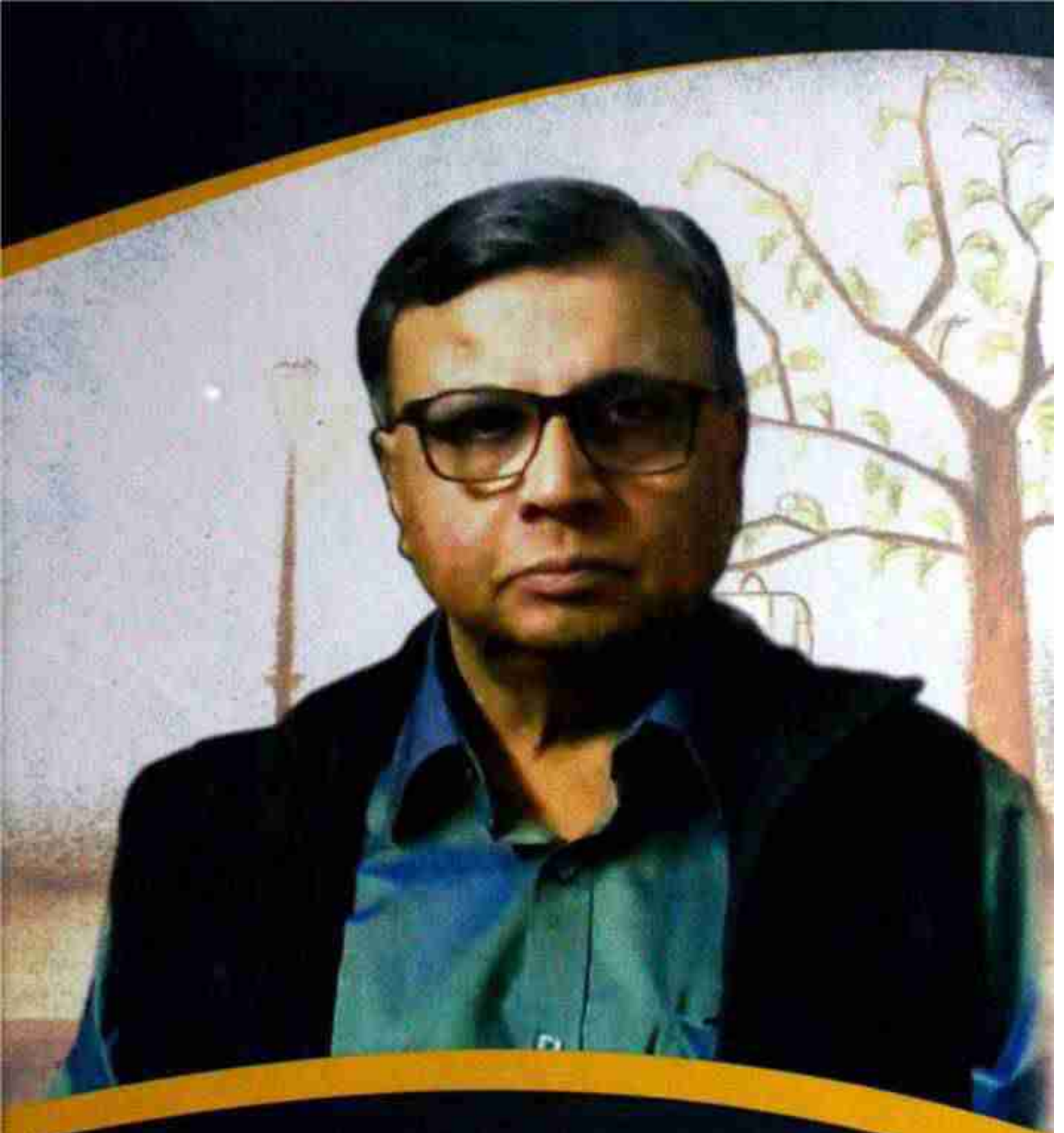
MARE HUYE AADMI KI LALTAIN

(Short Stories)

by : Siddique Alam

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
New Delhi . INDIA